مشرف عالم ذوقی
غلام بخش اور دیگر کہانیاں
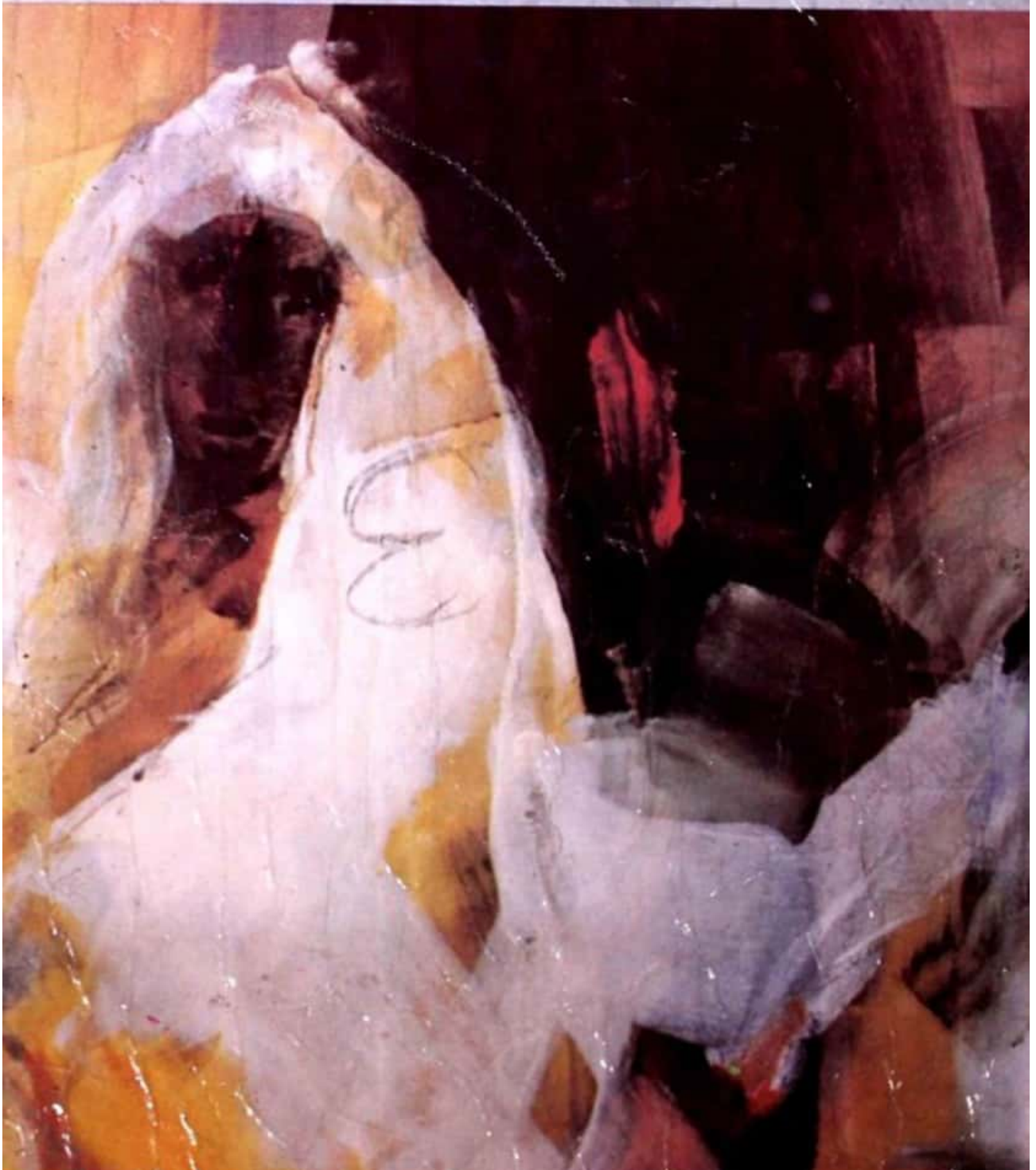
غلام بخش

اور دیگر کہانیاں

اس کتاب کی اشاعت میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ، حکومت اتر پردیش کا جزوی مالی تعاون شامل ہے

ذوقی سیریز کی کہانیاں۔ ۳

غلام بخش

اور دیگر کہانیاں

مشرّف عالم ذوقی

زیر اہتمام

تخلیق کار پبلشرز

104/B۔یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

نام کتاب : غلام بخش اور دیگر کہانیاں
ناشر و مصنف : مشرف عالم ذوقی
پتہ : آر۔۱۰۲، تاج انکلیو، لنک روڈ، گیتا کالونی، دہلی۔۱۱۰۰۳۲
تعداد : چار سو (۴۰۰)

زیراہتمام : انیس امروہوی
○ تخلیق کار پبلشرز
104/B۔یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

سرورق : نسیم امروہوی
کمپوزنگ : لیزر پوائنٹ، ۱۰۱۷۱۔پٹودی ہاؤس، دریاگنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲
مطبوعہ: این کے پرنٹر اینڈ پبلک آر171/1 گلی نمبر 8 رمیش پارک، لکشمی نگر، دہلی110092
فون: 2432902

ملنے کے پتے

○ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولامارکیٹ، دریاگنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲
○ اہلووالیہ بکڈپو، ۹۹۸۸/۴۵۔ نیو روہتک روڈ، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۵
○ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
○ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

T.P.: 081
ISBN. 81-87231-05-X
1998
GHULAM BAKHSH
AUR DIGAR KAHANIYAN (Short Stories)
Rs. 120.00
MOSHARRAF ALAM ZAUQUI
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
104/B-YAWAR MANZIL, I-BLOCK, LAXMI NAGAR, DELHI-110092

منٹو کے

'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کے نام !

کہ .... جہاں اُس کی لاش پڑی تھی

اُس سے چند قدم کے فاصلے پر غلام بخش کھڑا تھا

OO

ترتیب

نئے عکس

پُرانے عکس

ہتھیار، جنہیں زندگی بھر ساتھ رکھنا پڑتا ہے،
لیکن ان کی ضرورت
زندگی میں صرف ایک بار پڑتی ہے۔
نغمہ، جسے زندگی بھر دہرایا جاتا ہے
لیکن لکھا جاتا ہے، صرف ایک بار

—رسول حمزہ توف
('میرا داغستان' سے)

نئے عکس

غلام بخش

وہ غلام ملک میں پیدا ہوا۔ اس لیے باپ نے اس کا نام ہی غلام بخش رکھ دیا۔

مجھے یقین ہے، مرنے سے پہلے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کچھ بتانا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی وہ مر گیا۔ وہ بوڑھا تھا، قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا تھا، اس لیے اسے مرنا تھا۔ اور وہ مر گیا ـــــ ممکن ہے اس کے مرنے کا یہی اندازہ لگایا جائے، اور ایک بے حد معمولی سا آدمی، جس کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے، اس کے بارے میں زیادہ سوچنے یا غور کرنے کی فکر ہی کسے ہے...... وہ جیے یا مرے، کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ جیا بھی تو بیکار اور مر گیا تو مر گیا ـــــ حد تو یہ ہے کہ جہاں وہ کام کرتا تھا وہاں بھی اس کے بارے میں یہی رائے تھی اور اس لیے جب میں نے کتابوں کے سیکشن کے انچارج شری واستو کو بہت زیادہ کریدا تو، فائل بند کر کے اور میز پر ایک طرف رکھ کر وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگے۔

''ہاں بھائی ہاں...... وہ مر گیا...... لیکن وہ زندہ کب تھا......؟''

مجھے لگتا ہے، میں نے کہانی غلط جگہ سے شروع کر دی۔ لیکن اتنا طے ہے کہ اپنے آخری وقت میں وہ مجھے کچھ دکھانا یا بتانا چاہتا تھا۔ اور چونکہ دکھانا یا بتانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس کی موت میرے لیے معنی رکھتی ہے۔ ایسا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنے وجود میں برسوں کی پراسرار خاموشی رکھ کر، چپ چپ خود سے باتیں کرنے والا غلام بخش کچھ

کہنے کے لیے منہ کھولے......اور کچھ بتانے سے قبل ہی ہمیشہ کی نیند سو جائے۔اس کے اندر اگر 'یہ بہت کچھ' بھرا نہ ہوتا تو سچ کہوں، مجھے بھی اس کے مرنے کا اتنا غم نہ ہوتا......اس مشینی دور میں آنکھیں کھولی ہیں نا؟ تو اتنا تو اثر ہونا ہی چاہیے۔ قدم قدم پر موت، حادثے۔ موت کب، کیسے نکل کر اچانک سامنے آکر دبوچ لے گی، کون کہہ سکتا ہے۔اچانک کسی بھی لمحے آکر چونکا دے گی۔لو آگئی،اب بولو؟ مرنے کے واقعات اور حادثات کی یورش نے پتھر جیسا بے حس بنادیا ہے مجھے —— لیکن اس کے باوجود غلام بخش کی موت کو میرا دل عام واقعہ یا حادثہ ماننے کو قطعی تیار نہیں۔

جی ہاں صاحب، آپ مانیں چاہے نا مانیں،وہ واقعی بہت اہم تھا ہمارے لیے۔اور یقین جانئے صاحب،وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے زیادہ پراسرار آدمی تھا —— فرق صرف اتنا تھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ چونکہ پاگل اور خبطی تھا،اس لیے وہ بول بول کر چیخ چلا کر، اپنی حرکتوں سے اپنی باتیں کہہ ڈالتا تھا۔اور یہ بوڑھا خبطی —— اسے تو دین دنیا سے کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔ہمیشہ خود سے باتیں کرنے والا۔ بڑبڑ کرنے والا، کبھی من ہی من میں ہنسنے لگتا۔ کوئی آتا تو گیٹ کھولتا۔ اس کی طرف دیکھتا۔ لیکن خود سے باتیں کرنا جاری رہتا۔ایسا بھی ہوتا کہ گیٹ سے اندر آنے والے اجنبی نے اس سے کچھ پوچھا ہوتا لیکن جواب دینے کے عمل میں بھی اس کی وہی بڑبڑاہٹ جاری رہتی۔ اجنبی کی کھسیاہٹ کو دائیں طرف کرسی پر بیٹھنے والے شری واستو جی دور کرتے۔

'ادھر آجائیے۔وہ کچھ بھی نہیں بتا سکے گا۔' اس تیز جملے پر بھی یہ نہیں ہوتا کہ غلام بخش چونک کر شری واستو یا اجنبی کی طرف دیکھتا۔جی بالکل نہیں۔وہ اپنی دنیا میں مگن رہتا۔ من ہی من بڑبڑاتا ہوا۔ پہلی بار لگا تھا، جیسے اس کے اندر قصے کہانیوں کا عجیب و غریب سنسار ہو —— ایسا سنسار جسے مجھے فوراً لپک لینا چاہیے۔اچک لینا چاہیے۔ سچ کہوں تو پہلی بار میں ہی غلام بخش کی طرف متوجہ ہوا تھا، پھر آپ یقین نہیں مانیں گے، میں صرف اور صرف اسی کے لیے آتا رہا۔ برابر۔ ہر دو چار دن کے بعد۔چاہے کام ہو یا نہ ہو، شری واستو کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاتا اور اس کی حرکات و

سکنات کا جائزہ لیتا رہتا۔ گرمیوں کے موسم میں اسے مکھیاں بھی تنگ کرتیں۔ مگر جیسے اسے کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ کہاں بیٹھتی ہیں۔ کہاں تنگ کرتی ہیں۔ وہ تو اپنی داستانوں میں اتنا الجھایا کھویا ہوتا کہ ان بیکار کی باتوں یا مکھیاں 'ہکانے' کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔

ٹھہریئے۔ ابھی بھی بہت سی باتیں رہ گئی ہیں جو ضروری ہیں اور میں نے ابھی تک جن کی وضاحت نہیں کی ہے۔ اور وضاحت کے بغیر بوڑھے غلام بخش کو سمجھنا آسان بھی نہیں ہے۔ یہاں یہ بات ضروری ہے کہ بوڑھے غلام بخش سے اپنی ہمدردی یا خود غرضی کی وضاحت کرتا چلوں، تو اس لمبی تمہید کے لیے معذرت!...... اب میں اصل واقعے پر آتا ہوں، لیکن اس سے پہلے مختصر سا اپنا تعارف بھی کرانا ضروری ہے۔

میں یعنی اظہر بائجان، ایک معمولی سا ادیب ہوں، ـــــ یہ بائجان کہاں ہے؟ مجھے خود نہیں پتہ، مگر جب مستقبل کو گولی مار کر لکھنے اور وہ بھی اردو میں لکھنے کا جنون سوار ہوا تو اپنے اچھے بھلے نام اظہر کلیم سے کلیم کو علیحدہ کر کے بائجان جوڑ لیا ـــــ گو کہ اس کے معنی کچھ نہیں، لیکن یہ نام چونکانے کے لیے کافی ہے اور اس سے خاصا انوکھے پن کا بھی گمان ہوتا ہے۔ لیکن یہاں میں اپنے نام کے انوکھے پن کی تفصیل سنانے نہیں بیٹھا ہوں۔ جیسا کہ ظاہر ہو گیا، میں لکھتا ہوں اور مجھے لکھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ یہاں ایک چھوٹی سی بات کی وضاحت اور بھی کرتا چلوں کہ ہر نئی چیز، ہر نئی بات کو انوکھے انداز میں لکھنے میں مجھے بڑا مزا ملتا ہے، لیکن آپ بہتر جانتے ہیں کہ فقط لکھنے سے، وہ بھی اردو میں لکھنے سے مستقبل کے گیسو نہیں سنوارے جا سکتے اور یہاں تو دُھن تھی کہ بس لکھنے کو ہی ذریعہ معاش بناتا ہے۔ تو میں اظہر بائجان، یعنی ایک چھوٹے سے قصبہ نما شہر کا باشندہ، چھلانگ لگا کر، راجدھانی کی چوڑی چکلی سڑکوں پر آکر ایک دم سے بھوت بن گیا۔

جی ہاں۔ بھوت......

بھوتوں کی مختلف دنیائیں ہیں، پتہ نہیں آپ کو سابقہ پڑا ہے یا نہیں ـــــ لیکن زندگی کے کئی معاملوں میں حقیقت چھپاتے ہوئے ہم بھوت بن جاتے ہیں۔ اور ایسے میں بھوت بنے رہنا ہی اچھا لگتا ہے ـــــ جیسے خواہش ہوتی ہے کوئی آپ کو پہچانے نہیں۔ جانے نہیں۔ جی ہاں جناب، ایسی بھی خواہش ہوتی ہے اور خاص کر ادب میں ـــــ روزی روٹی کے لیے آپ کو فرضی ناموں، گھوسٹ (بھوت) ناموں سے بھی کبھی کبھی رائیٹنگ کرنی پڑتی ہے۔ اور سچ مچ کا بھوت بن جانا پڑتا ہے۔ تو میں ایسا ہی بھوت بن گیا تھا۔ دلی کی چوڑی چکلی سڑکوں نے آوارہ نڈھال قدموں کو راستہ بھی دکھایا تو رائیل پبلشنگ ہاؤس کا۔ جو کتابوں کا ایک بڑا نامی گرامی ادارہ تھا۔ اور جہاں فرضی ناموں سے لکھنے والوں کا ایک پورا ٹیبل موجود تھا۔ جب راجد ھانی میں گنے چنے پریس ہوا کرتے تھے، یہ تب کا ہے ـــــ

وقت کے ساتھ اس پبلشنگ ہاؤس کا رنگ، ڈھنگ اور انداز سب کچھ بدل چکا تھا۔ اب اس کے مالک تھے، مسٹر نوین ـــــ جن کی عمر زیادہ سے زیادہ چالیس برس ہوگی۔ لیکن جو دیکھنے میں اس سے کہیں زیادہ کم اور خوبصورت لگتے تھے۔ پہلے ہی دن، مجھے کہنے دیجئے، فرسٹریشن کی اپنی ایک الگ کڑوی دنیا ہوتی ہے۔ جب دنیا کا تصور مردہ آرزؤں اور کسی چڑچڑی چڑیل بڑھیا کے خوابوں کی طرح بے رونق اور بدمزہ ہو جاتا ہے۔ خزاں رسیدہ موسم کی کسی تپتی دوپہر میں، میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں بھوت بن جاؤں گا۔ اور میرے قدم خود بخود نوین پبلشنگ ہاؤس کا بورڈ دیکھ کر رک گئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی کئی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد آٹومیٹک دروازہ آتا ہے ـــــ دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی پہلی ملاقات غلام بخش سے ہوتی ہے۔ جو اسٹول پر بیٹھا بیٹھا خود سے باتیں کرتا رہتا ہے ـــــ اندر تو داخل ہو گیا لیکن اب کہاں جاؤں؟ اسٹول پر بیٹھا ہوا آدمی تو نظر اٹھا کر اپنی دنیا کی بڑبڑاہٹ میں گم ہو گیا تھا۔

میں نے اس کا جائزہ لیا۔ گہرا سانولا رنگ، جس پر اب جھریوں کا جال بچھنے لگا تھا،

آنکھوں کے پاس گال پر بڑا سامستہ۔ آنکھیں چھوٹی مگر ان میں بچوں جیسی چمک، بال چھوٹے چھوٹے مگر 'اجھڑائے' سے، اجلے رنگ کے پینٹ شرٹ (جو گندہ ہو گیا تھا۔ اور شاید اس کا یونیفارم بھی تھا) میں ملبوس۔ توند بالکل باہر نکلی ہوئی...... پورے چہرے پر بس آنکھیں ہی ایسی تھیں جو اس کے وجود کو چھوٹے سے ننھے منّے بچے میں تبدیل کر رہی تھیں۔ میں نے غلام بخش کی باتوں پر کان لگایا مگر اڑم، دھڑم، نم، نوں۔ جو زیادہ تر اس کے سانسوں کی تکرار تھی سے زیادہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ مگر سانسوں کے آدھے ادھورے بٹوارے کے درمیان اس کی بے تکی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

اسٹول سے آگے بڑھنے کے بعد دائیں طرف شریواستو کا کمرہ ہے۔ جو پبلشنگ ہاؤس میں بک انچارج ہیں۔ ان کے پڑوس میں رضیہ بین کی میز ہے۔ رضیہ کو کوئی رضیہ بہن نہیں کہتا۔ رضیہ بین ہی کہتا ہے۔ دھیرے دھیرے جب میں اظہر بائجان، وہاں کا مستقل گھوسٹ رائٹر بن گیا، اور یہاں کے لوگوں سے تعلقات کے دائرے بڑھنے لگے تو غلام بخش کے بارے میں کئی انوکھی کہانیاں معلوم ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ اس اسٹول پر بیٹھے بوڑھے بھوت کے بارے میں جاننے کا تجسّس صرف مجھے ہی نہیں، بلکہ سب کو تھا۔ لیکن غلام بخش کی زندگی کا سب سے مختلف پہلو وہ تھا جس کی داستان مجھے یہاں کے مالک مسٹر نوین نے سنائی۔

لیکن صاحبان۔ ذرا ٹھہریئے۔ اس داستان کو شروع کرنے سے پہلے میں ایک چھوٹا سا واقعہ بتادوں۔ ہوا یوں کہ جیسا میں نے شروع میں بتایا ہے کہ جب بھی میں نوین پبلشنگ ہاؤس جاتا، کوشش کرتا کہ نظریں بچا کر زیادہ سے زیادہ غلام بخش کا جائزہ لیتا رہوں۔ جیسا کہ میں نے بعد میں جانا کہ اس بوڑھے بھوت کو کھانے پینے سے کوئی زیادہ مطلب نہیں ہے۔ بھوک لگی تو باہر سے کچھ بھی لاکر کھالیا۔ چنیا بادام، بھونجا، گول گپے۔ زیادہ تر ایسی ہی چیزیں اسے پسند ہیں۔ خود میں نے جب بھی دیکھا۔ ایک چھوٹا سا ٹھونگا لے کر کچھ اسی طرح کی چیز چباتے یا کھاتے دیکھا۔ ہاں پیسے نہیں ہوتے تو چپ چاپ نوین صاحب کے پاس آکر ٹھہر جاتا۔ ایسے میں بھی اس کی بے

ڈھب سانسوں والی بے تکی آواز زور مار رہی ہوتی۔ نوین صاحب سمجھ جاتے کہ بھوک لگی ہے۔ وہ کچھ پیسے ہاتھ میں تھمادیتے۔ وہ چپ چاپ باہر نکلتا۔ کوئی کھانے پینے کی چیز لیتا۔ پھر اسٹول پر کسی فرمانبردار بچے کی طرح بیٹھ جاتا۔ جیسے اسکول کے بچے کو اسکول اور اسکول سے گھر کا راستہ معلوم ہوتا ہے، وہی حال غلام بخش کا دفتر کے ساتھ تھا۔ وہ کہاں رہتا تھا، کی مزید تفصیل تو بعد میں بتائیں گے لیکن اسے معلوم تھا کہ اتنے بجے دفتر پہونچنا ہے۔ چابی سے دروزاہ کھولنا ہے اور اسٹول نکال کر بیٹھ جانا ہے۔ دروازہ کھولنے کے آدھے گھنٹے بعد ہی سوئپر آتا تھا۔ ہاں شروع میں مجھے اس بات کا احساس ضرور تھا کہ اس بے ضرر آدمی کو بھلا نوین صاحب نے کیونکر رکھا ہے؟ مگر اس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔ ہاں تو واقعہ یوں تھا کہ ہمیشہ کی طرح ایک دن گیٹ کھول کر اندر داخل ہوتے ہی میں غلام بخش کے پاس ٹھہرا تو اس کی تیوریاں کچھ چڑھی ہوئی دیکھیں۔ مگر اس کی خود کلامی، بڑبڑاہٹ جاری تھی، اور بہت دھیان دینے پر بہت کوشش کے باوجود، اس کے آدھے ادھورے لفظوں میں مجھے ایک ملک کا نام سنائی دیا اور میں ایک دم سے چونک پڑا......پا.. کستا.. ن......

میں نے پھر غور کیا۔ میری طرف اچٹتی سی نگاہ ڈال کر وہ پھر اپنی خود کلامی میں مصروف تھا۔ میں نے جب شریواستو کو اپنی اس نئی دریافت کا بیورہ دیا تو وہ چونکا نہیں۔ بلکہ مذاق اڑاتا ہوا بولا "بالجان صاحب۔ آپ نے کوئی تیر نہیں مارا۔ سالا پاکستان سے محبت کرتا ہے، غدار ہے۔ کون نہیں جانتا۔ پھر اس نے پراسرار انداز میں بتایا۔ یہ سالا پاگل دکھتا ہے۔ کچھ پوچھئے تو عجب عجب کرتا رہے گا جیسے کچھ جانتا نہیں، کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ لیکن ذرا اس کے سامنے پاکستان کا نام لے کر دیکھئے ____ کیسے سن لیتا ہے اور خوش ہوتا ہے......"

"اچھا......" یہ میرے لیے حیرانی کی بات تھی۔

اور اس سے پہلے کے میں نوین صاحب والا واقعہ بیان کروں، میں آپ کو بتادوں کہ شری واستو جی کی بات مان کر میں نے وہ تجربہ بھی کیا اور یقین جانیے۔ اس کی

آنکھوں میں پہلی بار بچے جیسی چمک اور خوشی کا رنگ نظر آیا۔

"پاکستان......"

"تم پاکستان میں رہتے ہو......؟"

"تمہارا پاکستان میں کوئی اب بھی رہتا ہے......؟"

"پاکستان جانا چاہتے ہو......؟"

"پاکستان تمہیں بے انتہا پسند ہے......؟"

وہ خود سے اڑم بڑم کرتا، میری طرف دیکھ کر بچوں کی طرح مسکرائے جارہا تھا۔ بس کوئی جواب نہیں۔ اس کی بڑبڑاہٹ جاری تھی اور اس سے پہلے کہ میں اپنے طور پر غلام بخش کے بارے میں کوئی نظریہ قائم کروں نوین صاحب نے مجھے ایک بالکل نئی دنیا میں پہونچادیا تھا۔

تب آزادی نہیں ملی تھی۔ نوجوانوں میں گاندھی جی اور آزادی کا جوش ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ چرخہ کاتنے والے گاندھی جی کی تصویر غلام بخش کے اندر ہی اندر بس گئی تھی۔ سودیسی آندولن کا نعرہ ہو یا انگریزو بھارت چھوڑو، غلام بخش کے نوجوان ہاتھ بھی فرنگیوں کے خلاف اٹھ گئے۔ یہ پڑھائی کی عمر تھی ــــــ غلام بخش کا باپ کریم بخش تھا جو مولا حویلی تاج بخش کے پاس رہتا تھا۔ یہ جگہ پرانی دلی کے علاقے میں تھی۔ آج یہ جگہ چتلی قبر اور بلی ماران کی نئی نئی دکانوں اور عمارتوں کے بیچ کہاں گم ہو گئی۔ اسے کھوجنا مؤرخ کا کام ہے۔ کریم بخش کچھ زیادہ پڑھے لکھے تو نہیں تھے۔ ہاں تھوڑی بہت عربی فارسی آتی تھی۔ اردو کے استاد تھے ــــــ بچوں کو پڑھا کر گزارہ کرتے تھے۔ اور مولا حویلی تاج بخش محلے میں تین کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا۔ جو باپ دادا پردادا کے وقت سے چلا آرہا تھا۔ کریم بخش کے تین لڑکے تھے۔ منجھلا تھا غلام بخش، بڑا مولا بخش، اور چھوٹا ظہور بخش ــــــ اس وقت تک پاکستان نہیں بنا تھا لیکن قائداعظم کا بہت شور تھا۔ کریم بخش بھی اس وقت کے زیادہ تر مسلمانوں کی طرح مسلم لیگ کے اہم ممبر تھے۔ اور قائداعظم کے حق میں تھے، اور چاہتے تھے کہ

مسلمانوں کا اپنا ایک الگ ملک ہو۔۔۔۔ غلام بخش اس وقت نوجوان تھا۔ عمر ۲۰۔۱۹ ہو گی، پتہ نہیں اسے ابا کی بات معقول نہیں لگتی تھی۔ گاندھی جی کی بات تو سمجھ میں آتی تھی کہ سب مل جل کر رہو۔۔۔۔ ملک کا بٹوارہ ہو جائے۔ ہندو مسلم دو حصوں میں بٹ جائیں۔ اسے کب گوارہ تھا۔ کریم بخش نے 'لے کے رہیں گے پاکستان، کا نعرہ تو لگایا لیکن پاکستان کو بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکے۔۔۔۔ کہتے ہیں ایک بار وہ کسی جلوس کے ساتھ نعرے لگاتے جا رہے تھے کہ برٹش سرکار نے گولی چلوادی۔۔۔۔ مرنے والوں میں غلام بخش کا باپ بھی شامل تھا۔

فرنگی حکومت سے غلام بخش کی نفرت اپنی انتہا کو پہونچ گئی۔ ایک بار اسے معلوم ہوا کہ قریبی گیسٹ ہاؤس میں وائسرائے کی سواری رکتی ہے۔ اس وقت بہت سے ہندو مسلمان بم بنانا جان چکے تھے۔ غلام بخش نے خود اپنے ہاتھوں سے بم بنایا اور ایک بم وائسرائے کے کمرے کی طرف اچھال کر جو بھاگا تو 'بم پولیس' میں جاکر دم لیا۔ اندھیرے کا وقت تھا۔ شہر فرنگی جوتوں کی دہشت سے گھرا تھا۔ یہ جگہ ریلوے کراسنگ کے پاس تھی۔ جہاں بڑے بڑے بے حیا کے درخت تھے۔ اور چاروں طرف موت پاخانے کی تیز بدبو...... کہتے ہیں فرنگی گولی کے ڈر سے غلام بخش اسی گو موت یعنی 'بم پولیس' میں ہفتوں پڑا رہا۔ اسے یہ بھی خوف تھا کہ پولیس اس کی تلاش میں ہو گی۔ اور صبح اس جگہ میدان کرنے والوں کی ٹولی آجائے گی۔ جیسے تیسے پورے ایک ہفتہ تک وہ اس بم پولس میں ادھر ادھر چھپتا رہا۔

یہ اسی زمانے کی بات ہے جب انگریزوں نے ڈیوائڈ اینڈ رول فار مولے کے تحت ہندو مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا تھا، اور ملک میں چاروں طرف ہندو مسلمان کٹ کٹ کر گر نے مرنے لگے تھے۔ پھر جب پاکستان بنا تو عدم تحفظ کے احساس سے دوچار مسلمانوں نے پاکستان جانے میں ہی بھلائی سمجھی۔ غلام بخش کا علاقہ بھی دہشت کی لپیٹ میں تھا۔ پاکستان چلنے کا اعلان ہوا تو بڑے بھائی مولا بخش نے غلام بخش کو بھی چلنے کے لیے کہا۔ غلام بخش راضی نہیں ہوا تو اس نے سمجھایا۔

مکان کا موہ چھوڑو۔ پرانی دلی کا حشر بھی برا ہونے کو ہے۔ وہاں چل کر کسی اچھے سے مکان پر تالا لگا دیں گے۔ غلام بخش پھر بھی چلنے کو راضی نہیں تھا۔ بڑے بھائی نے بڑی مشکل سے دونوں بھائیوں کو راضی کیا۔ اس وقت تک مولا بخش کی بیوی آچکی تھی۔ اور اس کا ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا۔

لاہور تو آگئے پر مکان کا ملنا اب بھی نہیں ہوا تھا۔ مکان ڈھونڈھا بھی تو غلام بخش نے ــــــ اور بڑی مشکل سے دوڑ بھاگ کے بعد ایک بہتر سا مکان نظر آیا۔ بھائیوں کو خبر کی۔ بھائی آئے۔ خوش ہوئے۔ قاعدے سے اس مکان پر تو غلام بخش کا ہی حق ہونا چاہئے تھا۔ مگر مولا بخش کی بیوی نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ مکان بڑا ضرور تھا لیکن نصیبن چاہتی تھی کہ یہ مکان اس کے حصے میں رہے۔ سو اس نے اپنے میاں کو پڑھانا شروع کیا کہ اگر یہ بھائی زیادہ دن تک یہاں ٹکے رہے تو یہاں بھی بٹوارے جیسی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ اور جو یہاں بھی اس مکان کے تین حصے لگ گئے تو سوچو بچے گا کیا۔ دونوں بھائی تو کنوارے ہیں۔ کچھ بھی نہیں جائے گا۔ لیکن اس کی تو گھر گرہستی ہے۔ اس لیے سوچنا بھی اسی کا کام ہے۔ مولا بخش نے دماغ لگایا تو بیوی کا شک صحیح لگا۔ بھائی کی نیت سے تو غلام بخش واقف ہو ہی چلا تھا۔ لیکن جب بھائی نے سیدھے طور پر مکان سے نکل جانے کو کہا تو اسے بھی تاؤ آگیا۔ غصے میں بولا۔ جاؤ نہیں نکلتا ــــــ میرا مکان ہے۔ دخل بھی میرا ہے۔ پہلے میں نے دیکھا تھا ــــــ کہتے ہیں یہی وقت تھا جب پاگل پن کا ہلکا ہلکا دورہ غلام بخش کو پڑا تھا۔ بھائی سے ان بن ہو جانے کے بعد وہ بیٹھا بیٹھا بڑبڑاتا رہتا۔

"لے کے رہیں گے پاکستان
پاکستان میں ایک مکان
ایک مکان میں ایک دکان......
لے کے رہیں گے ......پا...... کس...... تا......ن......"

کہتے ہیں بھیا اور بھابی سے دل ٹوٹنے کے بعد ادھر ادھر مکان کی تلاش میں بھٹکتا

رہا۔ کراچی سے لاہور، لاہور سے کراچی...... بہت دنوں تک انار کلی میں بھی پھیری لگائی۔ دل نہیں لگا تو پرانے مکان کی تلاش میں ہندوستان واپس آگیا۔ اور پھر اس پر جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا...... جس مکان کو ٹھلا اور لاواث چھوڑ کر بھاگا تھا۔ وہاں کسی دوسرے کا قبضہ ہو گیا تھا۔ بیچارے "ٹوبہ ٹیک سنگھ——" کو تو یہ سوچ کر پریشانی ہوتی تھی کہ اس کا گھر پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں لیکن اس سے بھی بری حالت بیچارے غلام بخش کی تھی۔ اپنا گھر، اپنا دوار۔ وہ یہاں سے بھی گیا۔ وہاں سے بھی۔ بہت دنوں تک مولا حویلی تاج بخش کے اپنے گھر کے سامنے ڈیرہ ڈال کر وہ یہی گاتا پھرتا......

لے کے رہیں گے پاکستان
پاکستان میں ایک مکان
ایک مکان میں ایک دکان"

کوئی پوچھتا...... کیوں میاں۔ پاکستان تو مل گیا، اب وہاں مکان کب لے رہے ہو، اور مکان میں دوکان کب بنوا رہے ہو۔؟

غلام بخش گندی سی گالی بکتا۔ اسی بھڑوے نے ہتھیالی۔ ورنہ دیکھا تو میں نے تھا۔

لیکن یہ سب باتیں......؟ میں نے نوین صاحب کی طرف دیکھا...... آپ کیسے جانتے ہیں۔؟

نوین صاحب نے میری طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری۔ بھائی، اس وقت تقسیم کا اثر سب کے دل و دماغ پر تھا۔ ہندو مسلم دنگوں نے تھوڑا بہت نقصان سب کو ہی پہونچایا تھا......اور دلی تو دل کھول کر لٹی برباد ہوئی تھی۔ اس لیے جب یہ وقت کا مارا روزی روٹی کو ترستا پاپا کے پاس پہونچا اور پاپا نے اس کی کہانی سنی تو فوراً رکھ لیا۔ اب مدت گزر گئی۔ مرنے سے پہلے پاپا نے مجھ سے بھی کہا تھا۔ غلام بخش کو نکالنا مت۔ بے ضرر انسان ہے۔ باہر اسٹول پر پڑا پڑا چوکیداری ہی تو کرتا رہتا ہے۔ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا ہے۔ اس لیے میں نے بھی رہنے دیا۔

نوین بھائی نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ دراصل اس کی بڑبڑاہٹ تو ادھر پانچ ایک برسوں میں شروع ہوئی۔ مکان نہیں ملا تو کھوجتے کھوجتے اس کی ملاقات رحمان درزی سے ہوئی۔ جن کی آنکھوں کی بینائی کمزور پڑ گئی تھی اور جواب سینے پرونے کا کام کرنے کے لائق بھی نہیں تھے۔ غلام بخش انہیں رحمان چاچا کہتا تھا۔ رحمان کے پاس اپنا ایک ٹوٹا پھوٹا سا مکان تھا۔ رحمان کریم بخش کے پکے یاروں میں تھا اور ایک نمبر کا مسلم لیگی۔ سو رحمان نے اسے اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ کچھ دنوں کے بعد ہی رحمان مر گیا۔ اور یہ مکان بھی ایک طرح سے غلام بخش کا ہی ہو گیا۔ اب تو اس مکان کی قیمت بھی کافی ہو گئی ہو گی۔ پاپا برابر کہتے رہے۔ مکان بیچ دو۔ اچھے پیسے مل جائیں گے۔ مگر غلام بخش کو پیسے کوڑی سے مطلب ہی نہیں تھا۔

مجھے معاف کیجیے میں جہاں سے چلا تھا۔ پھر وہیں لوٹ رہا ہوں —— آخر اس پرانی ہو چکی داستان میں ایسا کیا ہے۔ میں جسے لکھنے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں —— تقسیم، ہجرت، فساد، کچھ کہانیاں تو وقت کی زنبیل میں کب کی دفن ہو گئیں۔ پھر اس پرانی پڑ گئی راکھ کو کریدنے سے فائدہ؟ لیکن صاحب، راکھ کے اسی ڈھیر کو کریدا جاتا ہے جہاں سے کچھ ملنے کی توقع ہوتی ہے۔

نوین بھائی نے آگے بتایا۔ ان دنوں ہندوستان پاکستان میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ ہر طرف جنگ کے تذکرے تھے۔ اس وقت تک پاپا دفتر میں ہی بیٹھے تھے۔ اچانک اسٹول پر بیٹھے بیٹھے غلام بخش لپکتا ہوا پاپا کے پاس آیا —— پہلے تو وہ سمجھے کہ پیسوں کے لیے آیا ہو گا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ غلام بخش نے روک لیا۔ نہیں جی پیسے نہیں چاہئیں۔

"پھر......"

"میں کیا کروں جی......؟"

پاپا نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ غلام بخش نے بھی سوالیہ آنکھوں سے پاپا کی آنکھوں میں جھانکا۔ یہ جنگ ہو رہی ہے جی۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرا مکان تو

ہندوستان میں بھی چھن گیا۔ پاکستان میں بھی۔ یہ آفس والے چھیڑتے ہیں جی۔ کہ ہندوستان، پاکستان پر بم گرائے گا۔ اچھا گرائے گا جی۔ مان لیا۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اور اگر پاکستان ہندوستان پر بم گراتا ہے جی، تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔

پاپا نے زور سے ڈانٹا۔ "تم جا کر چپ چاپ اسٹول پر بیٹھ رہو۔ اور کسی کی مت سنو۔"

"اچھا جی......"

وہ اسٹول پر جا کر بیٹھ گیا۔

میں دھیرے سے مسکرا دیا۔ دراصل وہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے کہاں کے لیے ایماندار ہونا چاہیے اور یہی اس کی زندگی کا سب سے اہم پہلو ہے۔

نوین بھائی ہنسے۔ پھر تو پاکستان کے نام پر وہ دفتر والوں کا مذاق بن گیا۔ کوئی پاکستانی کہتا۔ کوئی کہتا، پہلے تو صرف مکان ہی چھنا ہے۔ اس بار جاؤ گے تو کھدیڑ دیے جاؤ گے۔ ہند و پاک کے درمیان کرکٹ کا میچ چلتا تو وہ کھسکتا ہوا ٹرانزسٹر کے قریب آ جاتا۔ پھر پوچھتا۔ پاکستان کے کتنے رن ہوئے جی۔ پاکستان جیتے گا نا جی۔ ایسا باؤلا ہو گیا تھا۔

نوین بھائی نے ٹھہر کر کہا۔ شری واستو کی میز کے پاس تم نے نجمہ بین کو دیکھا ہوگا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔ نجمہ کو بہت مانتا تھا۔ جب شروع شروع آئی تھی۔ تب سے جو بھی کھانے کی چیز خریدتا، نجمہ کے پاس لے کر پہنچ جاتا ——— جب آفس والوں نے نجمہ کو چڑانا شروع کیا تب ایک بار نجمہ نے اس کا ٹھونگا پھینک دیا تھا۔ تب سے ایسا ناراض ہوا کہ نجمہ کو دیکھتا بھی نہیں۔ تم کیا جانو۔ اس کے اندر کتنا غصہ ہے ——— اتنا غصہ جسے وہ اپنی مستقل بڑبڑاہٹ میں تھوڑا تھوڑا کر کے نکالتا رہتا ہے۔

"چائے پئیں گے آپ؟"

نوین بھائی نے میری طرف دیکھا۔ بس جو معلوم تھا بتا دیا۔ ہاں ایک چھوٹی سی بات اور رہ گئی۔ آخری وقت میں اس نے پاپا کو بہت تنگ کیا۔ جب تب کہتا، پاکستان بھیج دو۔ جب پاپا کی ارتھی اٹھی تب بھی وہ آنگن میں ایک طرف بیٹھ کر وہی پرانا گیت الاپ رہا تھا۔

"لے کے رہیں گے پاکستان

پاکستان میں ایک مکان

ایک مکان میں ایک دکان"

میں خود اسے پکڑ کر کنارے لے گیا اور سمجھایا۔ "چپ ہو جاؤ غلام بخش۔ پاکستان میں مکان بنوانے والا نہیں رہا۔ پاپا مر گئے ہیں۔ چپ ہو جاؤ۔" پھر یوں ہوا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بلک بلک کر۔ پہلی اور آخری بار ــــــ پھر میں نے اسے کبھی روتے ہوئے نہیں پایا۔ پتہ نہیں کم بخت کے اندر کتنی داستانیں بھری ہیں۔ اسٹول پر بیٹھا بیٹھا بڑبڑاتا رہتا ہے۔

غلام بخش کی کہانی اتنی ہی تھی جتنی میں سنا چکا۔ بیچ کے واقعات میں کچھ نہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ اسٹول پر بیٹھا بیٹھا بڑبڑاتا رہتا تھا۔ اور میری خواہش تھی کہ اس کی بڑبڑاہٹ میں کسی معنی خیز جملے کو دریافت کر سکوں۔ لیکن یہ میری بیوقوفی تھی۔ وہاں صرف سانسوں کے تھپیڑے تھے۔ جنہیں سمجھنا آسان نہ تھا۔ ہاں اب جو میں بتانا چاہتا ہوں۔ وہ بہت اہم ہے ــــــ جیسے یہ کہ مرنے سے کچھ دن قبل وہ ٹھیک ہو گیا تھا اور یہ ماننے کو کوئی تیار نہیں کہ وہ کھوسٹ غلام بخش جو مرنے سے کئی عرصہ پہلے ہی مر چکا تھا۔ مجھے کچھ بتانا بھی چاہتا ہو گا۔ اور سچ کہوں تو اس کے اس طرح اچانک مرنے سے مجھے دھکا پہونچا تھا ــــــ اور وہ جن حالات میں مرا، مجھے یقین ہے وہ اپنے زندہ ہونے کی کوئی تو شہادت پیش کرنا چاہتا ہو گا۔ اور اسی لیے میں کہتا ہوں کہ مرنے سے قبل وہ مجھے کچھ بتانا چاہتا تھا ــــــ جیسے ایک ٹائر میں اگر بہت زیادہ ہوا بھر دیجیے تو وہ پھٹ سکتا ہے۔ لیکن تھوڑی سی ہوا چارج کر دیجیے، تو اس کے پھٹنے کا خوف نہیں رہتا۔ غلام بخش اپنے اندر سے تھوڑی بھی داستان نکال دیتا تو وہ بچ جاتا اور میرا زور اسی بات پر ہے کہ وہ اپنی داستان باہر نکالنے کے لیے تیار تھا۔

"تمہارا یقین ہے وہ تمہیں کچھ بتانا چاہتا تھا۔؟" نوین بھائی چونک کر بولے۔

"ہاں......اس نے مجھے گھر چلنے کو کہا تھا۔"

"تم اس کے گھر گئے تھے؟"

میں اظہر بائجان، میں نے ٹھنڈی چائے منہ کے اندر انڈیلی۔ نوین بھائی کو غور سے دیکھا۔ پھر کہا اب جو بتانے جارہا ہوں۔ ممکن ہے آپ کو یقین نہ آئے اور آپ سن کر حیرت کریں ـــــ تو سن لیجئے۔ مرنے سے پہلے میں واقعی اس کے گھر گیا تھا۔ میں ایک لمحے کو رکا۔ آپ کے پاپا ٹھیک کہتے تھے۔ وہ مکان جس جگہ ہے، اب اچھے داموں پر بکے گا۔ لیکن اب اس جگہ پر رحمان درزی کے بھائی بھتیجوں کا قبضہ ہو گیا۔ میں سب معلوم کر کے آیا ہوں۔ دراصل مجھے تجسس اس کے سامان کا تھا۔ کم بخت کے پاس یادگار کے طور پر کچھ تو ہو گا۔

"پھر کیا ملا......؟"

میں نے ان کا تجسس مزید بڑھایا...... "آپ کو تعجب ہو گا۔ غلام بخش اپنے اس گھر میں مجھے نہیں ملا بلکہ اپنے پرانے والے گھر میں......"

میں نے ٹھہر کر کہا۔ "اچھا یہ بتائیے۔ مرنے سے ۷۔۶ روز قبل کیا وہ دفتر آرہا تھا؟"

"نہیں......"

"آپ نے تلاش کیا؟"

"ہاں، ہم نے پیون بھیجا تھا۔ اس کے گھر۔ وہ نہیں ملا تھا۔"

"غلام بخش جیسا ایک بوڑھا آدمی وہاں نہیں ملا، کیا یہ تشویش کی بات نہیں تھی۔"

"تھی لیکن میں کیا کرتا۔"

"اب مجھ سے سنیے۔ وہ وہاں ملتا بھی کیسے۔ وہ تو اپنے پرانے والے گھر گیا تھا۔ جی ہاں اسی گھر میں جو مولا حویلی تاج بخش میں، کسی زمانے میں تھا اور جہاں آج کسی دوسرے کا قبضہ ہے۔"

نوین بھائی مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ "لیکن تم وہاں تک کیسے پہنچ گئے؟"

میں نے ایک بوجھل سانس لی ـــــ مجھے معلوم تھا۔ وہ وہیں مل سکتا ہے۔ چنگی قبر اور بلی ماران کے علاقے میں وہ جگہ تلاش کرنے میں مجھے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔

اب وہاں بالکل نئی عمارت ہے ــــــ عمارت کے مکین نے بتایا کہ ایک پاگل نما شخص آیا تھا۔ جو گھر اور گھر کے کمروں کی طرف اشارہ کر کے پتہ نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ان لوگوں نے اسے نکالنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن...... لیکن وہ گیا نہیں۔ دھنی رما کر باہر ہی جم گیا۔ ڈرانے دھمکانے پر بھی نہیں گیا۔ باہر برآمدے میں ہی سو گیا ــــــ جانتے ہیں ایسا کیوں ہوا، میں نے نوین صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں ممکن ہے اچانک اسے خیال آیا ہو۔ کیا اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی وہ اپنے مکان کو اپنا مکان نہیں کہہ سکتا۔ بس۔ اس طویل دشمنی کی آخری جنگ لڑنے وہ اپنے اس مکان میں گیا تھا۔

"اس کے پاس سے کچھ برآمد ہوا؟"

وہی بتانے جا رہا ہوں میں نے ٹھنڈی سانس چھوڑی۔ اس کے پاس تھا ہی کیا؟ جو ملتا۔ زندگی بھر کی کمائی بس ایک جھولا۔ کچھ پرانے کاغذ پتر، جس کی لکھائی اتنی دھندلی پڑ گئی تھی کہ کوئی مورخ ہی پڑھ سکتا تھا۔ ہاں کچھ چوڑیاں تھیں۔ ان چوڑیوں سے یاد آیا نجمہ بین سے اس کی والہانہ محبت کے پیچھے کوئی جذبہ کہانی کی شکل میں ضرور رہا ہو گا، جو اس کی موت کے ساتھ ہی راز رہ گیا۔ بہرکیف اب میں جس چیز کی طرف آ رہا ہوں وہ یقیناً آپ کو بھی چونکا دے گی۔

نوین بھائی نے کرسی پر ــــــ کروٹ بدلی ــــــ

میں نے ان کے تجسس کا زیادہ امتحان لیے بغیر کہا۔ وہ چیز تھی ویزا۔ پاکستان جانے کا ویزا۔ جس پر حال فی الحال کی تاریخ پڑی تھی۔ آپ کہتے ہیں وہ ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ مدتوں پہلے ہی مر چکا تھا۔ لیکن کیا مرنے سے پہلے وہ پاکستان جانے کا خواہش مند تھا۔ لیکن۔ کیوں۔؟ دراصل......"

نوین بھائی مضحکہ خیز ہنسی ہنسے۔ "ہو سکتا ہے وہ آدھی موت یہاں مر چکا ہو۔ اور آدھی موت کے لیے۔"

"نہیں......" میرا لہجہ اچانک تھوڑا سخت ہو گیا۔ یہیں پر آپ چوٹ کھا گئے نوین

بھائی۔ اور یہی غلام بخش کی کہانی کی سب سے سنسنی خیز اور آخری کڑی ہے۔ اب جو میں بتانے جارہا ہوں وہ بہت معمولی مگر بہت اہم ہے۔

میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا ـــــــ یاد رکھیے، اس کہانی کا سب سے اہم حصہ غلام بخش کے آخری ایام ہیں۔ آخری وقت میں یہ احساس اس کے اندر پیدا ہوا تھا کہ یہ مکان کیا اتنے برسوں بعد بھی اس کا نہیں ہے؟ اس نے اپنے اس موروثی گھر کے لیے کوشش کی ظاہر ہے گھر نہیں مل سکا۔ اس نے پاکستان جانے کا ارادہ کر لیا۔ ویزا تک بنوالیا۔ حقیقت یہی ہے کہ اس نے فوقیت اپنے مکان کو دی۔ وہ پاکستان گیا نہیں۔ کیونکہ یہ تلخ حقیقت اسے معلوم ہو گئی تھی کہ اب یہی اس کا گھر ہے اور اسے اسی گھر کے لیے کوشش کرنی ہے اور......

میں اظہر بائجان، میں نے گھوم کر نوین صاحب کی طرف دیکھا ـــــــ جو سکتے کے عالم میں میری طرف دیکھ رہے تھے اور میری ہر بات کے ساتھ ان کے چہرے پر بل بھی پڑنے لگے تھے۔ میں توقف سے مسکرایا۔ اور یہ رہی سب سے معمولی، سب سے اہم بات ـــــــ مرتے وقت اس نے اپنے ہونے کی آخری کیل ٹھونک دی۔

''مطلب؟'' نوین بھائی نے کرسی پر پہلو بدلا۔

میں دھیرے سے مسکرایا۔ ''مرا بھی کم بخت تو اپنے اسی باپ دادا والے پرانے گھر میں۔ ایسا کیوں کر ہوا۔ اس کا مطلب بتا سکتے ہیں آپ؟''

میں نے غور کیا۔ نوین بھائی کے چہرے کا مانس ذرا سا کھنچ گیا تھا۔

OO

ذہن جدید۔

جو زندہ نہیں

(اوتار سنگھ پاش، صفدر ہاشمی اور گورکھ پانڈے کے نام)

ذہن سائیں سائیں کر رہا ہے اور سائیں سائیں کرتے ذہن میں کہیں اس بچے کی تصویر ابھرتی ہے جس کے اجلے اجلے 'چکتوں' میں میرے اندر کی نفرت اور حقارت جذب ہو گئی تھی۔ وہ شہر کی بھیڑ میں ایک دم سے اکیلا، تنہا، اچٹتی سی انجان نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ میرے اندر جیسے کوئی چیخ رہا تھا۔ 'اس بچے کو جانتے ہو تم'...... اس بچے سے کوئی رشتہ ہے تمہارا...... رشتہ ہو بھی سکتا ہے اگر جانتے ہو تو؟'...... لیکن بے بس قدم ٹھہرتے کہاں ہیں اور جذبات جب صرف ایک تھوپی ہوئی لاچاری اوڑھ لیں تو...... میں اس بچے کو نہیں جانتا، کہیں سے بھی نہیں، تبھی تو ٹھہرا نہیں، رکا نہیں، اور ارتھی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے، بھیڑ میں ایک دم سے ننگا ہوتے ہوئے، اندر کے جذبات کو بھولی بسری یادوں کی دوپہر میں، مٹی کی گرد دھول اور تیز گرم ہوا میں اڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

شام کے چھ بج گئے تھے۔ ابھی تو مجھے شکایتی خطوط کے اس پلندے سے فارغ ہونا ہے، رپورٹ بنا کر بھیجنی ہے۔ اس کے بعد سبودھ کی ڈیوٹی بھی مجھے ہی نبھانی ہے۔ کہہ گیا ہے کہ آج ذرا دیر سے آؤں گا۔ مہانگر کے حال چال کا پنا تم ہی لکھ لینا____

شکایتی خطوط میں اور ہوتا ہی کیا ہے۔ سڑک ٹوٹ گئی ہے — برسات میں پانی جام ہو جاتا ہے — ٹریفک کی بتی خراب ہے — چاپاکل کے آس پاس بہت گندگی رہتی ہے — بیماری کے پھیلنے کا بہت خطرہ ہے — جلدی جلدی ان خطوط سے 'نبٹارہ' حاصل کر رہا ہوں۔ آٹھ منزلہ دفتر کی عمارت کے چوتھے فلور کی کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں تو پورا شہر ڈراؤنا دکھتا ہے — کسی بھوت کی طرح، اندھیرے نے جیسے پورے شہر کو نگل لیا ہے۔ کھڑکی سے باہر کی کئی کئی منزلہ عمارتیں روشنی میں چمکتی تو ہیں، لیکن اندر اپنی مجبوریوں میں لپٹے ہوئے لوگوں کا احساس بھی کراتی جاتی ہیں — سنولا دا تا والے کمرے میں وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا ہے اور کہہ رہا ہے۔ 'سالے ہر دم بزی رہتا ہے تو، جانتا ہوں میری موت کی خبر پا کر بھی اپنی مجبوریوں کے بوجھ تلے دبا رہی رہے گا، آ نہیں پائے گا، ہاں اندر سے اپنے احساس کو چھیلتا رہے گا، مگر اس سے کیا ہوتا ہے بزدل، اندر کے آدمی کو کمزور اور نکما بنا دینا، تجھے ڈر ہے نا، اتنا بڑا آفس، اتنا بڑا اخبار، تجھے کوئی بھی ری پلیس کر سکتا ہے، آخر تیری کرسی کو تیرے ہی بھائی بند ہو کتنے ہی پترکار گھورتے رہتے ہیں۔ قبضہ جمانے کے لیے، جو تجھ سے میٹھی میٹھی باتیں بھی کرتے ہیں لیکن من میں پھر بھی لوبھ، ایک لالچ، کہ تجھے یہاں سے کسی طرح نکلوایا جا سکے۔ میں جانتا ہوں، تجھے میری بات کڑوی لگ رہی ہوگی۔ مگر یہ سچ ہے، کرسی کی جنگ صرف وہیں نہیں ہے، یہاں بھی ہے۔ اپنے اس ساہتیہ کے علاقہ میں، جہاں نہیں ہونا چاہیے، کہیں کوئی ایماندار نہیں، سب بدبو دیتے ہوئے حالات کا حصہ بنے ہوئے، تبھی تو کوئی تبدیلی ممکن نہیں لگتی۔

ایک لمحے کو قلم کانپ جاتا ہے اور ہاتھ بھی۔ گھڑی دیکھتا ہوں، سات بجے تک مہانگری کی رپورٹ بھی مکمل کرنی ہے اور ...... لیکن ذہن میں مچی ہوئی ہلچل اور کرشنا ریڈی......

کرشنا ریڈی میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا ہے۔

''یہ دھوپ دیکھ رہے ہو۔'' وہ اچانک چلتے چلتے ٹھہر گیا ہے۔ ہمیشہ، ہر دم ہی اس

کے ساتھ ایسا ہوتا، ہر منظر کو غور سے دیکھنا، ٹھہرنا پھر جذباتی ہو جانا، تجزیہ کرنا اور جڑنا ــــــ، جڑنا ہی نہیں ــــــ ان سب سے زیادہ اس منظر کا ایک حصہ ہو جانا...... ریڈی کے ہونٹ بولتے رہتے ہیں۔

"یہ دھوپ دیکھ رہے ہو، جب یہ دھوپ میرے چھجے پر آتی ہے، بیٹھتی ہے' تو مجھے سرخ لگتی ہے، سرخ اور لہولہان۔ تب مجھے سارے منظر لہولہان لگتے ہیں اور میں خود بھی اندر سے لہولہان ہو جاتا ہوں۔"

ایک لمحے کو وہ چپ ہوا ہے۔ ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ آگے ریڈ سگنل ہے۔ بسیں، گاڑیاں، اسکوٹر، تین پہیے والے سائیکل سوار، سب کے سب گرین سگنل کے انتظار میں ــــــ کرشنا ریڈی میرے بازو کو پکڑ کر مجھے ایک طرف کنارے لے جاتا ہے۔ اب وہ اس عورت کو غور سے دیکھ رہا ہے جو گندے چیتھڑوں میں اپنے چھوٹے بچے کو دابے ایوننگ نیوز کی بہت سی کاپیاں لیے کھڑی ہے اور ایک لڑکا ریڈ سگنل کا فائدہ اٹھا کر گاڑیوں کے شیشوں میں جھانکتا، اسکوٹر والوں کے آگے ٹھہرتا اور بس کے آگے والے گیٹ سے چڑھ کر اخبار نچاتا اپنی سوکھی ہڈیوں، دھنسی آنکھوں اور پھٹے ہونٹوں کی نمائش کر رہا ہے۔ بس گاڑیوں کے شور کے بیچ آہستہ آہستہ ریڈی کی آواز ابھرتی ہے۔

"مجھے لگتا ہے غریبی صرف اپنے یہاں ہے ــــــ باہر کہیں نہیں، تم ان بچوں کو دیکھ رہے ہو، ریڈ لائٹ کی دکان پر اخبار بیچتے ہوئے ــــــ یہ بچے کبھی کسی اخبار کی سرخی نہیں بن سکتے۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے ایسے ہی ایک بچے کی موت دیکھی ہے۔ ریڈ لائٹ کے اچانک گرین ہو جانے پر جھٹکا کھاتی بس سے اچانک اترتے اور پیچھے سے آنے والی بس سے روند دیئے جاتے ہوگے ــــــ ملک کے حاشیے پر بھی کہیں ان بچوں کا مستقبل درج نہیں ہے۔ اور نہ ہم ان سے ذہنی رشتہ قائم رکھ پاتے ہیں۔ میں جب ان بھوکے سڑی انتڑیوں والے کسی بچے اور ان ننگے ادھ ننگے لاچار بھوکے غریبوں کی فوج دیکھتا ہوں جو جن پتھ یا کناٹ پلیس پر کسی باہری سیاح یا امریکی کا دامن پکڑتے ہوئے

بھوک سے جھلسے ہونٹ دکھا کر چند سکوں کی فرمائش کر رہے ہوتے ہیں...... تب مجھے اپنا وجود جھلستا ہوا لگتا ہے۔ شرم آتی ہے مجھے اپنے ہندوستانی ہونے پر۔۔۔۔۔ کبھی کبھی ایسے منظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ کوئی باہری سیاح ان پھٹے حال ننگے بچوں کی تصویریں کھینچ رہا ہے، جانتا ہوں اپنے ملک جا کر وہ ان تصویروں کی نمائش کریں گے، رسائل میں دیں گے اور ان بچوں کے سوکھے ہونٹ، زرد چہرے، دھنسے پیٹ، ان کی تفریح کے لیے اچھے داموں میں بک جائیں گے جس کو وہ شمپیئن یا کسی مہنگی شراب میں انڈیل دیں گے۔ لیکن یہ بچے تب بھی ایسے ہی رہیں گے، ایسے ہی زرد چہرے اور سوکھے ہونٹ والے...... ایک بار میں نے ایسے ہی ایک امریکی کا کیمرہ توڑنا چاہا تھا۔ پھر سوچا اس سے کیا ہوگا، کیا فرق پڑے گا۔ میں اس بچے کو کچھ دے تو نہیں سکتا......"

وہ اچانک ٹھہرتا ہے۔ 'دوست! حقیقت یہ ہے کہ سارا روگ پیٹ کی دوزخ کا ہے۔ جب ان انتڑیوں میں آگ لگتی ہے تو سب غلط صحیح ہو جاتا ہے اور سب ناجائز، جائز...... اور اس احساس کا کیا ہے۔ احساس تو پانی، ہوا اور دھول کی طرح ہے، پانی کی طرح لہر لہر اندر بہتے ہیں، ہوا کی طرح ذہن پر چھاتے ہیں اور دھول کی طرح وجود پر بیٹھ کر ڈستے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہاں بھی یہ احساس پانی، ہوا اور دھول کی طرح ہی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ وہ اس احساس کو پانی کی طرح دھو ڈالتے ہیں، ہوا کی طرح اڑا دیتے ہیں اور دھول کو برش سے جھاڑ دیتے ہیں۔"

کرشنا ریڈی سے میری سب سے پہلی ملاقات منڈی ہاؤس میں ہوئی تھی۔ تب وہ کلا سنگم میں ایک ناٹک کی ریہرسل میں مصروف تھا۔ اس زمانے میں مجھے دہلی آئے ہوئے کچھ ہی مہینے ہوئے تھے۔ اور اس بات سے انکار نہیں کہ اندر کے ادیب کو حرکت میں لانے کے لیے مجھے منڈی ہاؤس کا سہارا لینا پڑا تھا۔ یہاں الگ الگ رنگ کرمیوں، فن کاروں کا جمگھٹا، ہر طرح کے فن کاروں کے غول، ساہتیہ، ادب کی اونچی اونچی باتیں، ان سب سے میری دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ اچھا لگا تھا لیکن گھر سے آرزو اور تمناؤں کے محل کو لے کر مہانگری میں قدم جمانے والے فن کار کی روز روز ہلکی ہوتی

ہوئی جیب سے مایوسی کے سائے بھی گہرے ہونے لگے تھے۔انہی دنوں کئی ماہنامے اور ہفتہ واروں سے بات چلی تھی۔ کچھ امید سی بندھی تھی۔ کچھ جگہ سے فری لانسنگ کرنے کی دعوت بھی ملی تھی۔ کئی ایک جگہوں پر لکھ بھی رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ احساس زور پکڑنے لگا کہ قدم جم جائیں گے۔

اس دن اتفاق سے ہی چند دوستوں کے ہمراہ کلا سنگم آیا تو وہاں اس ناٹک کی ریہرسل نے مجھے چونکا دیا تھا۔ وہ انتہائی سنسنی خیز منظر تھا۔ ایک رکشہ والا اس شخص کی ہتیا کر رہا ہے جس نے اس کی پتنی کے ساتھ پہلے بلاتکار کیا، پھر جرم کا پردہ فاش ہونے کے ڈر سے اس کی ہتیا کر دی۔ پہلی بار میں ہی ریڈی کو دیکھ کر ڈر سا لگا تھا۔ اس کی آنکھیں، ہاتھوں میں ریہرسل کے وقت بھی پکڑا ہوا گنڈاسا، اس کی چیخ، لہجے سے تھوڑا بہت ساؤتھ انڈین ہونے کا احساس ہوا تھا، لیکن سب اس کے بے حد نیچرل ہونے میں چھپ گیا تھا۔

میں نے اپنے دوستوں سے تعریف کی۔ ”یار، سچ پوچھو تو پورے جیون میں اتنا نیچرل سین میں نے آج تک نہیں دیکھا۔“

میرے ایک ساتھی نے میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ ”یہ کرشنا ریڈی ہے، مجسم جذبات، اتنا سینٹی مینٹل آدمی میں نے زندگی میں آج تک نہیں دیکھا۔ ابھی ریہرسل ختم ہوتی ہے تو تم سے ملاتا ہوں۔“

دو تین ریہرسل کے بعد کرشنا کچھ تھک سا گیا تھا۔ لیکن ہر بار مجھے وہ ویسا ہی بھیانک شخص نظر آیا، اپنی پتنی کے ہتیارے پر گنڈاسا لے کر ٹوٹ پڑنے والا۔ اور اس کی جلتی ہوئی آنکھیں۔ پل میں لگا تھا، جیسے جسم کے سارے روئیں کھڑے ہو گئے ہوں، اندر تک جیسے کوئی تیز نشتر اتارتا چلا گیا ہو۔

ریہرسل کے ختم ہونے کے بعد پانی کا ایک ٹھنڈا گلاس تھامے وہ مجھ سے مل رہا تھا۔ وہی ساؤتھ انڈین لہجہ، پھر بھی سنبھل کر اس نے ادائیگی کی...... ”کرشنا...... ریڈی۔“

میں نے زھیرے سے کہا "تم نے جان ہی نکال دی یار، کیا پروفیشنل آرٹسٹ ہو۔؟"

"نہیں" وہ ہنستا ہوا بولا "بس دوستوں نے دھر لیا...... ایکٹنگ کرو، یہ فرسٹ ایکسپرینس ہے۔"

"اس سے پہلے۔"

"کبھی نہیں کیا" وہ مسکرا رہا تھا۔

"مائی گڈنس...... مگر اتنا نیچرل......"

کرشنا پھر ویسا ہی نظر آنے لگا تھا۔ اپنی پتنی کے ہتیارے کا بدلہ لینے والے رکشہ والے جیسا ـــــ ہونٹوں کو بھینچے وہ کہہ رہا تھا۔۔۔ "پتہ نہیں کیوں، مجھے خود آشچریہ ہے، میں نے کبھی کسی ناٹک میں بھاگ نہیں لیا۔ مگر ریہرسل کرتے ہوئے اچانک ہی لگنے لگا جیسے یہ حادثہ سچ مچ میری پتنی کے ساتھ ہوا ہے...... ریپ اور مرڈر، اور ہتیارا جب سامنے آگیا ہو تو......" وہ کھول رہا تھا، ابل رہا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے نارمل ہوا۔ "ایک پل کو بھی نہیں لگا کہ میں کرشنا ریڈی ہوں۔"

پھر وہ ہنسا تھا۔ ناٹک کی سطح پر ہی سہی، ہم جڑتے تو ہیں ایسی گھٹناؤں کے ساتھ، واقعات کے ساتھ اور ایسے لوگوں کے ساتھ ......اور ناٹک کے باہر ......"

پھر کرشنا ریڈی کی زندگی کے یکے بعد دیگرے کئی غلاف اترے۔ اب کچھ کچھ اس کے اندر کے آدمی کی پہچان ہونے لگی تھی۔ کرشنا مجھ سے چند مہینے پہلے ہی دلی آیا تھا۔ وہ رہنے والا مدراس کا ہی تھا۔ بھائیوں میں سب سے چھوٹا۔ لیکن بھائیوں کی آنکھوں کی کنکری۔ جب تک پتاجی زندہ رہے، کھانے پینے کی آسانی تھی۔ لیکن پتاجی کے مرتے ہی بھائیوں نے اس پر سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اسے لگنے لگا کہ بھائی اسے اس کا حصہ نہیں دینا چاہتے۔ بس اس احساس کا آنا تھا کہ اس نے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہا، کچھ بولا نہیں،

ایک صبح چپ چاپ دلّی کی گاڑی پکڑلی اور مہانگری آگیا۔ یوں کرنے کو تو وہاں بھی بہت کچھ تھا لیکن وہ رشتوں کے اس احساس سے بچنا چاہتا تھا، جو دھیرے دھیرے اس کے اندر زہر گھول رہے تھے۔ وہاں رہ کر رشتوں کے اس نازک احساس سے خود کو مکت کیسے رکھ سکتا تھا۔ ساہتیہ سے شروع سے ہی جڑاؤ رہا تھا۔ ہندی بہت اچھی تو نہیں تھی پھر بھی ٹھیک تھی۔ دلّی آنے کے کچھ ہی مہینوں کے اندر اس نے اپنی ہندی بہت حد تک ٹھیک کرلی تھی۔ لیکن ساؤتھ انڈین لہجے سے پوری طرح الگ نہیں ہوپایا تھا۔ میں نے ایک خاص بات کرشنا میں پائی، کرشنا بہت جلد جذباتی ہو جاتا تھا۔ چلتے چلتے، اٹھتے بیٹھتے، کسی بھی منظر کو دیکھ کر، یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ سڑک پر اگر ہم پیدل نکلتے تو تھوڑا راستہ بھی ہم گھنٹوں میں طے کرتے۔ وہ کسی کی آنکھیں دکھاتا، کبھی کسی مریل سے کتے کی طرف اشارہ کر کے ٹھنڈی آہ بھرتا، کسی بھک منگی عورت یا بوڑھے لاچار پر اس کی آواز لڑکھڑاتی، کبھی کسی رکشے والے کی طرف اشارہ کر کے اپنی تہذیب کی گرد اڑاتا، قدم قدم پر اس کے ٹھہرنے کے اس دستور سے شروع شروع میں ایک جھنجھلاہٹ سی ہوتی تھی، پھر آہستہ آہستہ میں نے خود کو اس کا عادی بنالیا۔ اس لیے کہ میرے اندر بھی ایک ساہتیہ کار چھپا بیٹھا تھا جو لکھنے کی حد تک یہ سب محسوس کرنے میں فخر کرتا تھا۔ ہاں یہ احساس کرشنا نے ہی کرایا تھا کہ ہماری زندگی کا ایک راستہ ان سے بھی ہو کر جاتا ہے۔ ہم اگر جڑتے نہیں تو ان سے کٹ بھی نہیں سکتے۔

تب کتنی باتیں اٹھی تھیں، کیوں؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ سب دیکھنے، سننے اور محسوس کرنے سے اندر کے آدمی کو بے چین کرنے کے سوا اور ہوتا ہی کیا ہے۔؟ جب اندر ایک اپنگ آدمی انگڑائی لیتا ہے اور ہار مان لیتا ہے کہ وہ اپاہج ہے اور ناکارہ...... تو......"

کرشنا ریڈی کی بھنویں تن گئی تھیں۔ "کیوں؟ کیسے نہیں کر سکتا، دراصل اپنگتا کا احساس ہی تو ہمیں اپنگ بناتا ہے۔"

"یہ سب باتیں کتابی ہیں کرشنا!" کہہ کر میں نے ٹال جانا چاہا تھا۔

لیکن کرشنا کی آنکھوں سے اچانک لہو چھلک آیا۔ "تب تم کیوں لکھتے ہو؟ کیوں سوچتے ہو؟ کیوں سرکاری نوکری کا لالچ چھوڑ کر جوتے گھسنے مہانگری چلے آئے۔ تم زندہ کیوں ہو...... بنا مقصد۔ اس لیے کہ دنیا میں آگئے اور اسی لیے جینے کی کارروائی مکمل کیے جا رہے ہو۔" اس نے نفرت سے میری طرف دیکھا۔ مجھے لگا جیسے اب وہ تھوک دے گا۔ تیز گھرنا اور نفرت سے۔

اس دن پہلی بار وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس لیے کہ لفظوں میں ہی سہی، اس نے مجھ سے نفرت کی تھی۔ میری طرف گھرنا سے دیکھا تھا۔ اسے پشچاتاپ بھی تو کرنا تھا۔ کئی بار زور دینے پر میں اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ اس نے جمنا پار کی ایک بستی میں غریبوں کے محلے میں ایک کمرہ لیا تھا۔ بس سے اترنے کے بعد بیس منٹ کا راستہ دھول بھری سڑک پر طے کرنے کے بعد اس نے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کے بیچ کی خالی جگہوں سے ہوتے ہوئے دور ایک چھوٹے سے کھپریل والے مکان کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "وہ ہے میرا گھر۔"

سچ کہوں تو اس سے پہلے دلّی میں ایسی بستیوں کا مجھے احساس نہیں تھا۔ میں نے تو اب تک مہانگری کی اونچی اونچی عمارتوں کا ہی درشن کیا تھا۔ جھونپڑی اور گندگی کے ڈھیر اس محلے کے بارے میں تو خواب و خیال میں بھی میرا دھیان نہ گیا تھا۔ ٹیڑھے میڑھے راستے، کنارے کنارے سلگتے ہوئے چولہے، اٹھتا ہوا دھواں، چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں لے کر باسی۔ ادھ باسی سبزیاں، پھل لے کر بیٹھے ہوئے، میلے ادھ میلے قصباتی لوگ، کسی کسی نل کے نیچے گندے میلے برتنوں کو مٹی سے دھوتی عورتیں، کڑکڑاتی ہوئی مرغیاں، مرغے، ننگے ادھ ننگے بچے، میلے ادھ میلے کپڑوں میں ادھر ادھر گھومتی ہوئی کمسن جوان لڑکیاں، کہیں کہیں چارپائی نکلی ہوئی، کچھ بوڑھے پرانے لوگ باتیں کرتے ہوئے ــــــ مجھے ان سب سے گھن سے لگ رہی تھی۔ کئی بار مجھے گندگی کے احساس سے ناک بھی بند کرنی پڑی۔ یہ بھی احساس تھا کہ ایسا کرتے ہوئے کرشنا دیکھ نہ لے، کہیں برا نہ مان جائے۔ آخر وہ مجھے پرانے زمانے کے کھپریل والے ایک پرانے

گھر میں لے گیا۔ باہر بیٹھے ہوئے جھبریل آوارہ کتے نے اسے دیکھ کر ایک بار بھوں کیا۔ پھر پونچھ ہلا کر اس کے پیچھے پیچھے تھوڑی دیر تک ہولیا۔ کرشنا نے جھک کر کتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

"موتی...... موتی، ابھی ڈسٹرب نہیں کرنا...... دوست آئے ہیں۔"

اچانک پلٹ کر اس نے میری طرف دیکھا، پھر کہا۔ "یہاں سب کچھ اپنا لگتا ہے، یہ پورا ماحول، یہ گھر، اس لیے کہ یہاں کہیں بھی کچھ بھی بناوٹی نہیں ہے، سب کچھ اوریجنل...... اندر آجاؤ۔"

پھر وہ مجھے ایک تنگ سی کوٹھری میں لے آیا۔ شام کے سات بج گئے تھے۔ ایک ٹوٹے سے اسٹول پر اینٹیں سجا کر جس کی چوتھی ٹانگ بنائی گئی تھی، مجھے بیٹھنے کے لیے کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے اندر چلا گیا۔ ایک پل کو میں نے اس کے کمرے کا جائزہ لیا۔ کھپریل کے ٹوٹنے سے ایک دو جگہ چھت کا خالی حصہ جھانک رہا تھا۔ جس کا مطلب تھا برسات کے دنوں میں اندر پانی بھی چوتا ہوگا۔ ایک طرف دروازے پر گرا ہوا ٹاٹ کا پردہ، ایک چارپائی جس پر لگ بھگ صاف چادر بچھی تھی۔ کنارے کچھ تمل اور ہندی رسالے، کچھ بکھرے ہوئے کاغذات، نونی لگی دیوار سے آڑے رکھی ہوئی، موڑی ہوئی چٹائی کے پاس ہی، زمین پر رکھی ہوئی مٹی کی صراحی، اسی کے پاس دیوار پر ایک ساتھ ٹھوکی گئی کئی کانٹیاں اور ان سے ہینگر میں لٹکتے ہوئے کچھ میلے ہوتے کپڑے...... یہی اس کی کل جنت تھی۔

کچھ دیر بعد وہ لوٹ آیا تھا۔ اب اس کے ہاتھوں میں چائے کے دو گلاس تھے۔ وہ خوش تھا۔ "اب تم نے میرا گھر دیکھ لیا۔ اچھا لگا نا، ارے ایسا گھر تو ہزاروں روپے خرچ کرنے کے بعد بھی نہیں ملے گا، آنے کے ساتھ ہی گرما گرم چائے پیو...... یار...... موج کرو۔"

چائے کی سڑپ لیتے ہوئے اس نے بتایا...... "اس گھر میں تین کمرے ہیں، دو کمرے اندر ہیں۔ بہار واسی ہیں یہ لوگ، تین جنے ہیں۔ باپ بیڑی بناتا ہے، اس کی

عورت بیڑی کا پتہ کاٹنے اور تمبا کو بھرنے میں اس کی مدد کرتی ہے، لڑکا بیچنے جاتا ہے۔ تم نہیں جانتے پتی پتنی کس انہماک سے اپنے کام میں جٹے رہتے ہیں ـــــ جیسے دنیا کا سب سے بڑا، سب سے ضروری اور سب سے اہم کام یہی ہو ـــــ میں بھی خالی وقت میں ان کی مدد کرنے بیٹھ جاتا ہوں ـــــ سچ کہتا ہوں۔ بڑا مزا آتا ہے۔"

ذرا ٹھہر کر اس نے خود ہی کہنا شروع کیا۔ "تم پوچھ سکتے ہو کہ میں نے یہاں رہنا کیوں قبول کیا، جمنا پار کی جھونپڑیوں کے بیچ بنی غریب بستی میں بیڑی بناتی عورت اور مرد سے میرا کیا رشتہ ہے، باہر جس کتے نے مجھے دیکھ کر پونچھ ہلائی تھی وہ مجھے کیوں عزیز ہے۔ وہ کتا صرف چند سوکھی روٹیوں کو پھینکنے کے عوض میرا دوست بن گیا ہے، میرے چند میٹھے بول نے بیڑی بنانے والے اس دمپتی (میاں بیوی) کے دل میں پیار بھر دیا ہے۔ مجھے لگتا ہے اپنے اندر کا کھوکھلا پن اور 'ٹوٹن' بانٹ رہا ہوں......ان کے ساتھ ......ان سے جڑتے ہوئے۔"

اس نے اچانک میری آنکھوں میں جھانکا۔ "ایک بات بتانا، زندگی کے روزمرہ کے کاموں میں گھلتے ملتے ہوئے ہم بہت خاص ہونا چاہتے ہیں، عام کیوں نہیں؟ نقاب سے الگ کی زندگی کا تصور کیوں نہیں ہے ہمارے پاس؟"

میں چپ چاپ سن رہا تھا، آہستہ آہستہ چائے سڑکتے ہوئے۔ سچ تو یہ تھا کہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ کمرے میں اٹھنے والی بسائن بو، چائے کے گلاس میں اتری ہوئی بیڑی کے پتوں کی گندھ۔ کچھ دیر بعد اندر سے ایک بوڑھا نکلا۔ نمستے کی مدرا میں ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ کھی کھی کر کے مسکرایا، پھر گلاس لے کر واپس لوٹ گیا۔ کرشنا ریڈی آہستہ سے بولا:

"یہ بپا تھے، میں انہیں بپا ہی کہتا ہوں۔ زندگی کو قریب سے دیکھو تو یہ سچائیاں زیادہ اپنی لگتی ہیں۔"

پھر وہ دیر تک بولتا رہا، ان سچائیوں کی جگالی کرتا رہا جو اندر کسی ویشیا (طوائف) کے سپنوں کی طرح پلتی رہی تھیں اور زندہ تھرکتے مانس، بوٹیوں کو نوچنے والے مردار

سے الگ، مانس ہی نوچتے آئے کسی جیو میں جیسے اس ویشیا نے اپنے سپنوں کا عکس دیکھ لیا ہو......اور جیسے برس ہا برس بعد اندر کے زہر کو باہر لانے کا راستہ دکھائی دیا ہو۔ وہ بولتا رہا...... "بس سے کچلے ہوئے بچے کی موت کوئی خبر کیوں نہیں ہو سکتی، سردی سے ٹھٹھر کر رات کے کسی خوفناک لمحے میں دم توڑ دینے والے لاوارث کی اینٹھی پڑی لاش کو دیکھنے کے بعد بھی اندر بیٹھا ہوا آدمی شانت کیوں رہتا ہے، اور وہ بچہ جو جن پتھ، کناٹ سرکس کی شاہراہوں پر کسی باہری سیاح کا دامن پکڑے چند سکوں کی فرمائش میں جھلس رہا ہوتا ہے۔ یہ سارے منظر ہمارے لیے بڑے کیوں نہیں بنتے......دل میں اترنے والے، چبھن دینے والے اور ایک زبردست چنگاری کی طرح اندر کے بھس بھرے مکان میں ایکدم سے آگ لگانے والے۔"

وہ ٹھہرا تھا...... "جنواد کا جنگل صرف ہمارے ذہنوں میں اگتا ہے، جگہ گھیرتا ہے، کبھی کسی واقعہ کو دیکھ کر پل بھر مچلتا ہے پھر اس زخمی شیر کی طرح غرا کر رہ جاتا ہے جو چبھے ہوئے کانٹے کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا۔ وہ تمہارے اندر پل بھر کی بے چینی پیدا کرنے، تھوڑی دیر کے لیے مرد جیسا بنانے کے احساس سے زیادہ حرارت نہیں بھر سکتا۔"

وہ بولتا رہا...... "یہ عورت مجھے اچھی لگتی ہے، بوڑھی، جھکی ہوئی اور جسم میں تمباکو کی گندھ رکھنے والی اور وہ بپا جو چائے کا خالی گلاس لے کر ابھی ابھی گئے ہیں، اور پھر جا کر ویسے ہی مٹی والی زمین پر دونوں دمپتی بیٹھ کر بیڑی بنانے میں لگ جائیں گے، تم انہیں دیکھو ــــــ یہ کام کرتے ہوئے جس وقت بپا لکھونی چڑھائے بیڑی کے پتے لپیٹتا اور اس میں تمباکو بھر رہا ہوتا اور چاچی چولہے پر رکھی جالی پر کھوں کھوں کرتی بیڑی سینک رہی ہوتی ــــــ چند سکوں کے لیے مشقت کی اس شردھا کو دیکھ کر تم اس غیر معمولی واقعہ سے اتنا جڑ دگے کہ ان کی تہہ سے ہوتے ہوئے اپنے جیسوں کے اندر بھی پہنچنے کا سراغ پا سکتے ہو۔"

اچانک وہ ٹھہرا تھا۔ "بور تو نہیں ہو رہے ہو، سورتی (کھینی) کھاتے ہو...... نہیں

تو رہنے دو...... جانے سے پہلے تمہیں ایک بات بتاؤں......اس دمپتی سے انجانے میں میں نے جینے کا ایک مقصد ڈھونڈھ لیا ہے۔ وہی مقصد جو اپنے آدمی ہونے کے احساس کو بڑھاوا دیتا ہے اور اچانک ایک چھوٹے سے کشکول میں پوری دنیا کی آبادی اتر کر مجھے دکھاتی ہے کہ دیکھو سب تمہارے اپنے ہیں......ایک جیسے...... تم جسے آدرش اور کورا فلسفہ کہہ کر ٹال جانا چاہتے ہو، میں اسے ہی زندگی سمجھ کر قبول کرنا چاہتا ہوں۔"

سچ تو یہ ہے کہ اس دن مجھ سے تمباکو کی گندھ دیتی چائے بھی نہیں پی گئی اور ایک حد تک میں اس کی الجھی ہوئی باتوں کے بوجھ تلے دب کر بور بھی ہو گیا تھا۔ مہانگری آنے کے بعد جھیلی گئی حقیقت نے سارے آدرشوں کو محض کتابی باتیں ثابت کرنے میں میری پوری مدد کی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ جذبات کے ایسے کمزور محل میں بھلا کرشنا ریڈی کتنے دنوں تک زندہ رہ پائے گا۔ اس بیچ دو باتیں ہوئی تھیں۔ کرشنا ریڈی نے پنچ تنتر جوائن کر لیا جو ایک ہندی ہفتہ وار اخبار تھا۔ اور میں بھارت جاگرن ڈیلی کے اس آٹھ منزلہ عمارت کا ایک حصہ بن گیا۔ پنچ تنتر کا آفس پاس میں ہی تھا۔ یہاں سے بس کا تیسرا اسٹاپ اکثر خالی وقت میں دیکھتا۔ دو کمرے کے بنے ہوئے چھوٹے سے آفس میں ہر جگہ کرشنا ریڈی ہی دکھائی دے رہا ہے، کبھی پیسٹنگ کرتا ہوا، کبھی کچھ لکھتا ہوا، 'گیلیوں' پر سرسری نگاہ ڈالتا ہوا۔ پروف پڑھتا ہوا، انچ اور پنسل سے جوڑ گھٹاؤ کرتا ہوا، کسی میگزین سے تصویریں کاٹتا ہوا، فوٹو چپکاتا ہوا، فون پر کاغذ کے آرڈر دیتا ہوا، وہ ہر جگہ تھا۔ کبھی کبھی مجھے دیکھ کر اپنے خاص ساؤتھ انڈین لہجے میں اس کی چیخ نکل جاتی......

"آئی...... ای...... ی...... ی...... او...... کیسے آئے...... کب آئے۔" پھر خود ہی کہتا۔

"سچ مانو تو بے ایمانی کر رہا ہوں، یہاں بھی—— دغا اور بے ایمانی......اس فیلڈ میں اس قدر ضمیر بیچنا ہوگا۔ سوچا بھی نہیں—— دوسرے پرچوں سے تصویریں چوری کرتے ہوئے، سنسنی خیز سرخیاں بناتے ہوئے، انگریزی سے ہندی کاپی کرتے ہوئے اندر ایک چوٹ سی پہنچتی ہے کہ ریڈی، یہ کیا کر رہے ہو تم...... کیا یہی کچھ تمہارا خواب ہے...... پھر مجھے بچپن یاد آتا ہے۔ جہاں نوخیز پاؤں میں مستقبل کے گھنگھرو دیکھنے والے، مجھے

ڈریم سیلر لگتے...... خواب بیچنے والے کہاں ہوں میں؟ یہ کیا کر رہا ہوں، کیسا آدرش، یتھارتھ اور واستویکتا، کیا یہی ہے۔ دوسرے پترکاروں کی چھپی چیزوں کے ساتھ بے ایمانی کرتے ہوئے۔"

"یہ بے ایمانی نہیں ہے۔" میں کھیج کر بولا۔ "اس لیے کہ تم پیٹ میں لگی آگ اور قلم کے بیچ ایک سمجھوتہ کر رہے ہو۔"

وہ ہنسا۔ "تو کیا سمجھوتے کے لیے ہمارے پاس اب صرف قلم ہی رہ گیا ہے۔؟"

"تو پھر اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

وہ اچانک ٹھٹھک گیا۔ قلم، کاغذ، قینچی، غیبی کول کی شیشی، کمپوزڈ یٹر اور اسکیل پنسل ایک طرف رکھ کر ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی۔ " ٹھیک کہتے ہو، کہیں کچھ سمجھوتہ کرنا ہی پڑتا ہے، کمرے کا کرایہ دینے سے لے کر دوستوں کو چائے پلانے تک ـــــــ، آدرش اتنے جھوٹے کیوں ہوتے ہیں...... اور کچھ اس لیے کہ نوّے کروڑ کی آبادی والے اس ملک میں ہمارے تمہارے جیسے لوگوں کی آبادی ہی زیادہ ہے جو اپنی مجبوری کو سمجھوتوں کے پلڑوں سے برابر کرنا چاہتے ہیں۔"

آج کی بات سے مجھے جھٹکا لگا تھا۔ احساس ہوا تھا کہ یہ شخص پنچ تنتر کے لیے زیادہ دن تک ایماندار نہیں رہ پائے گا۔ پھر مجھے منڈی ہاؤس میں اپنے آدرشوں کی قے کرتے کتنے ہی فنکار، رنگ کرمی، کوی، شاعر یاد آ گئے، جو ہر بھاگتے لمحے کے ساتھ اندھیرے سرات کا ایک حصہ بنتے جا رہے تھے ـــــــ جہاں عمر کا دھویں چھوڑتا انجن اپنی رفتار میں سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ ناامیدی، یاس، محرومی اور پل پل ٹوٹنے کا احساس پتہ بھی نہیں لگنے دیتا اور اندر کے آدمی کو چڑچڑا بنا کر رکھ دیتا ہے اور ایک خاص پڑاؤ پر جب خیال آتا ہے کتنی دور آ گئے ہم، سفر کے کتنے کم پڑاؤ رہ گئے مٹھی میں، اور کیا پایا کا حساب...... تب آنکھیں جلتی ہیں، بکھرتے ٹوٹتے خوابوں کے سلسلے پر نگاہ جاتی ہے۔ جہاں گھر ہوتا بھی

ہے تو بکھرا ہوا یا نہیں ہوتا کوئی گھر، کسی گھر کا خیال ـــــ نہیں ہوتا، کوئی پھول، کسی پھول سے بچے کی آرزو، مل بانٹ کر غم سہنے والی شریک حیات کی تمنا، لڑنے کا حوصلہ دینے والی، صحت بڑھانے والی، عمر...... عمر کا پڑاؤ کہیں پیچھے چھوٹ چکا ہوتا ہے، پھر کندھے پر پڑا ہوا جھولا ہوتا ہے، بے ترتیب بڑھی ہوئی داڑھی ہوتی ہے...... الجھنوں کو بیان کرتا جھریوں والا چہرہ ہوتا ہے اور تھکے ہارے وجود کو سہارا دینے کے لیے منڈی ہاؤس ہوتا ہے۔

میں جانتا ہوں یہ قصے نئے نہیں پرانے پڑ گئے ہیں۔ اونچی اونچی باتوں کی دہائیاں دینے والے جب اس جگمگ جگمگ کرتے ماحول میں کنارے لے جا کر کہتے ہیں کہ دو روپے ہوں گے، کل واپس کر دوں گا...... تب لگتا ہے سچ کا چہرہ اتنا مرجھایا کیوں ہے...... تب لگتا ہے پاش نے کیسے جھیلا ہو گا دکھ، اور کہا ہو گا ـــــ سب سے خطرناک ہوتا ہے ہمارے سپنوں کا مر جانا، اور جب کرشنا ریڈی کی ایسی ہی مٹھیاں میرے سامنے کھلی تھیں تو لگا تھا وہ پورا پورا میرے سامنے ننگا ہو گیا ہے، کسی ریچھ جیسا، سڑی ہوئی گندھ چھوڑتا، بڑے بڑے جھبڑے بالوں والا، جیسے اس کے پور پور سے بدبو پھوٹ پڑی ہو۔

ایک لمحے کو نگاہ اٹھائی تو دیکھا، کرشنا ریڈی سامنے کھڑا کہہ رہا تھا:

"پنچ تنتر چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ سرکولیشن اتنی کم ہو گئی تھی کہ مالک نے سارے اسٹاف کو الگ کر دیا، صرف مجھے رہنے دیا اور میرا کام تھا فائلنگ کرنا اور اس کا کام تھا کاغذ کا کوٹہ بلیک کرنا ـــــ پرانے اخباروں کی کترنیں کاٹ کر فائلنگ کرنے کے کام کو اپنا ضمیر کیسے برداشت کرتا۔ اب تو مانو گے کہ کہیں کچھ ہے ورنہ یہاں بھی سمجھوتہ کر لیا ہوتا کہ پیٹ کی آگ جب بولتی ہے تو......"

اس نے تھوڑے طنز کے ساتھ میری آنکھوں میں جھانکا "اب کیا کر رہا ہوں سنو گے تو شاید آگے سے ملو گے بھی نہیں۔ ہاں اس سے پہلے تمہیں ایک بات بتا دوں...... مجھے جینے کا مقصد مل گیا ہے۔"

"شادی کر لی؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، ایک بچے کا باپ بن گیا ہوں۔" کرشنا ریڈی ہنسا۔ "جس دن پنچ تنتر

چھوڑا اسی دن یہ قصہ ہول ___ پریشان تھا، رات میں بوتل کھولی اور پوری بوتل خالی کر کے جب گھر کی طرف لوٹ رہا تھا تو ایک بے سہارا بچہ مل گیا۔ قریب دس گیارہ سال کا۔ "ایک پل کو وہ ٹھہرا پھر کہا۔ "کسی بہت کمزور لمحے کا سچ ہوتا ہے، ہمارا ٹوٹنا یا سمجھوتہ، رات کے وقت پلیا سے گزرتے ہوئے اس بچے پر نگاہ گئی تھی۔ لاوارث، بے سہارا...... میلے کچیلے لباس میں پلیا کے ستون سے خود کو ٹکائے روتا ہوا، لگا تھا یہ انہی بچوں میں سے ایک ہے جو جن پتھ یا کناٹ سرکس میں کسی باہری سیاح کا دامن پکڑے اپنی سوکھی زبان دکھا رہا ہے...... لگا تھا تمام ساہتیہ رچنے سے زیادہ اہم کام ہے...... اس ایک ایسے بچے کی پرورش، اس کی دیکھ بھال، جو آسانی سے ہم سب سے ہو سکتی ہے اور اس کے لیے ضرورت ہے صرف اور صرف اپنی مضبوطی اور ایک سچے احساس کی ___ وہ پلٹا، 'اس سے ملو گے۔' اچانک اس نے دکھ کی سانس لی۔ "اسے چمڑے کی بیماری ہے، دو پیسے ہو جائیں تو اس کا علاج کراؤں گا۔"

مجھے ایسے ہی سناٹے میں دفن کرتا رہتا ہے۔ یہ شخص ___ ہمیشہ سے ___ حیرت اور تعجب کی قبروں میں۔ بولتا جاتا ہے اور موقع بھی نہیں دیتا کہ میں خود پر پڑی منوں مٹی کو ہٹاتا ہوا اس قبر سے باہر نکل سکوں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ آٹھ سو روپے ماہوار پر ایک ساؤتھ انڈین ڈھابے میں ویٹر ہو گیا ہے۔ یہ بولتے ہوئے ہنسا تھا کرشنا...... "اب تم سے ملاقات کم ہو گی، اس لیے کہ چھٹی نہیں ہے۔ آٹھ سو روپے ماہانہ اور ٹپ الگ۔" وہ ہنس رہا تھا۔ پترکاریتا سے اڈلی، سانبھر اور ڈوسا کی دنیا میں آنے تک آدمی وہی رہتا ہے، کم از کم میرے لیے کوئی پیشہ میری مجبوری نہیں بن سکتا۔ ہاں اس نوکری میں آرام نہیں ہے ___ سوائے رات کے۔ سارے دن کی ٹوٹن کو نکالنے کے علاوہ ' تمہیں بتاؤں، ایسی شاندار نیند مہانگری میں پہلی بار آئی ہے اور مجھے لگتا ہے ایسی شاندار نیند بھی نصیب والوں کو ہی ملتی ہے۔"

ایک دن اس کے ڈھابے گیا تھا۔ جہاں برتن نچاتے ہوئے وہ میری میز پر ٹھہرا۔ "ساب کیا لاؤں، اڈلی...... ڈوسا...... سانبھر...... کھانا پلیٹ ___ ' کھانے کے آرڈر

کے ساتھ ہی وہ ایک اسٹیل کے گلاس میں جھٹ پٹ پانی رکھ گیا۔ پھر ایک تھال میں دو طرح کی سبزی، سانبھر اور چاول لاکر رکھ گیا ــــــ پھر ایک پلیٹ میں دہی لے آیا۔ اور پھر دوسرے آرڈرس لینے میں مشغول ہو گیا۔ اس دن اس نے زیادہ بات نہیں کی۔ صرف اتنا کہا کہ "یہ بزی آور ہے، کبھی وقت نکال کر وہ خود ہی آجائے گا۔"

سچ کہوں تو میرا من اندر سے بھیگ گیا تھا۔ جیسے تیسے کھایا، پر کھایا نہیں گیا لگا تھا کسی دن میں بھی یہاں پہنچ سکتا ہوں، یہاں اس ڈھابے میں، ٹھیک کرشنا ریڈی کی طرح۔ جس دن چوتھے فلور کی وہ کرسی میرے آگے سے کھسکالی جائے گی اور اتنے بڑے شہر کی اتنی ڈھیر ساری عمارتوں میں میری میز کہیں نہیں ہوگی ــــــ تب کون پوچھے گا ــــــ؟ کیا انہی سپنوں کی خاطر؟ آکاش میں چمکنے والے چاند ستارے حقیقی زندگی میں محض کلپنا ہی ہوتے ہیں، دھرتی پر نہیں اترتے ــــــ پھر لگا تھا پاش کو کتنی محنت پڑی ہوگی۔ یہ کہتے ہوئے، سب سے خطرناک ہوتا ہے ہمارے سپنوں کا مر جانا۔

ایک دن اس کے گھر بھی گیا تھا۔ جہاں ایک چھوٹے سے بچے نے آدھے میلے، آدھے صاف کپڑوں میں میری رہبری کی تھی اور ایک گلاس میں پانی لایا تھا۔ جہاں اب تمباکو کی گندھ کے ساتھ پانی میں اتر آئی تھی اجلے چمڑے کی بو...... اس کے ہاتھ میں اُگے اجلے اجلے چکتے دیکھ کر میں نے مصنوعی مسکراہٹ سے کہا تھا۔ "گلاس لے جاؤ بیٹے، ابھی نہیں پیوں گا۔"

بچے کے ساتھ کرشنا ریڈی بھی ایک پل کو ٹھہرا تھا، جیسے میرے سامنے ننگا ہوتے ہوتے بچا ہو۔ لڑکا پھر باہر بھاگ گیا۔ جب تک میں وہاں رہا اندر نہیں آیا۔ ہاں ایک دو بار کسی کام سے باہر آئے تھے بپّا اور چاچی...... دونوں بار لگا اب وہاں اپنے پن کی وہ دیوار ڈھہ گئی ہے۔ کرشنا ریڈی بھی خاموش رہا۔ کچھ بتایا نہیں۔ ہاں اندر سے پکائی جا رہی بیڑی کی گندھ باہر آ رہی تھی، باہر کی ہوا سے گھلتی ملتی ہوئی۔

میں نے دھیرے سے کہا۔ "سب ٹھیک تو ہے کرشنا؟"

"نہیں۔" اس نے گردن ہلائی۔ لمحے بھر کو چپ رہنے کے بعد پھٹ پڑا......

"نہیں، کچھ بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔ اپنے پن کی آنکھیں بھی جھوٹ بولتی ہیں...... ایک جیسے خون کے ہونے پر سب متفق ہوتے تو فساد کیوں ہوتے اور دنگے—؟ لوٹ مار آتش زنی؟ مجھے لگتا ہے امیروں میں جتنی یونیٹی ہے غریبوں میں نہیں۔ ایک غریب دوسرے غریب کو دیکھنا نہیں چاہتا، برداشت نہیں کرتا۔ جب کہ اپنی غریبی دیکھ کر دوسرے کی غریبی سے پیار کرنا چاہیے تھا۔ مگر یہی نہیں ہوتا۔ جیسے ایک بھک منگا دیکھتا ہے کہ اس کی روزی چھیننے ایک دوسرا بھی آگیا ہے۔" اب وہ اپنے مطلب پر آیا تھا۔ "بپا کہتے ہیں اس لڑکے کو باہر نکال دو، یہ نہیں رہے گا...... رہے گا تو باہر ہی موتے گا بھرے گا، یہاں اندر نہیں۔ یہ بیمر یا ہے، بیماری پھیلائے گا۔"

ایک پل کو بچے کے اجلے اجلے چکتے مجھے بھی گھیرتے ہیں چاروں طرف سے، نفرت اور حقارت کی میل کو ہٹاتا ہوا، اندر کے ایماندار شخص کا چہرہ دیکھنا ایسے میں ایک دم نادانی جیسا معلوم ہوتا ہے۔

پھر واقعات کے رتھ کتنی تیزی میں چلے۔ کچھ کچھ خبریں تو منڈی ہاؤس سے ہی معلوم ہوتی رہیں۔ اپنی اخباری دنیا سے اتنی فرصت ہی کب ملتی کہ کرشنا کے درد کا ساتھی بن پاتا۔ ہاں یہ ساتھی نہ بننے کا ہی غم تھا کہ اس دن میں نے ایک کویتا لکھی۔ کیوں لکھتا ہوں میں؟ کس لیے...... اس چھوٹے سے بچے میں چکتے ہی دیکھے...... لاچارگی اور بے بسی نہیں۔ سب کچھ کہیں ایک مشینی بننے کی کارروائی دکھتی ہے اور اس کارروائی سے اس طرح جوجھا تھا میں:

"ہاں مجھے اپنے قلم کو توڑ دینا چاہیے /
اس لیے کہ کیوں لکھوں؟ کا کوئی جواز میرے پاس نہیں ہے /
مجھے قلم کے فریضے سے مکت ہو جانا چاہیے /
اس لیے کہ میں نے سردی سے ٹھٹھرتی اس ماں میں
ایک سستی عورت دیکھنے کی کوشش کی تھی /
جو اپنے بچے کو چھاتی سے لپٹائے

مجھ سے چند سکے طلب کر رہی تھی /
میں نے اس بچے کو بھی نظر انداز کیا /
جو لہلہاتی دوپہر میں ریڈ لائٹ کی دوکان پر /
ایوننگ نیوز کی کاپی لیے بے چارگی کی آنکھوں سے مجھے تک رہا تھا /
اور میں آگے بڑھ گیا تھا /
مہانگر کی سڑک پر بس سے کچلے جانے والے نوجوان کا حادثہ بھی /
میرے لیے محض روزانہ کے ایک واقعے جیسا تھا /
اخبار کے دنگے، فساد، بھوک اور ائر کریش میں مرنے والے انسان /
میرے لیے انجانوں جیسے تھے /
جن کے لیے اُداس نہیں ہوا جاتا /
سڑک کے کنارے فٹ پاتھوں پر بیٹھے ہوئے بھکاری، بھکارن، بچے، بوڑھے، جوان عورتیں
میرے لیے ملک کے دامن میں لگے ان بد نما داغوں جیسے تھے
جن کے اس حال کی ذمہ داری صرف اور صرف ان پر ہی عائد ہوتی ہے /
اور جو ایک ناسور کی طرح
ملک کی فضا کو اپنی غریبی کے میلے تن سے گندہ کیے رہتے ہیں /
روزانہ ہونے والے واقعات کے سرد ہاتھوں نے /
مجھے بھی مطلق سرد کر رکھا ہے /
میں اتنا ہی سرد ہوں اور پتھر جتنا سڑک کے چوراہے پر نصب پتھر کا بُت /
ہاں مجھے اپنے قلم کو توڑ دینا چاہیے /
اس لیے کہ 'کیوں لکھوں' کا کوئی جواز میرے پاس نہیں ہے /"
لکھ کر لگا تھا یہ میری آخری کویتا ہے، اس کے بعد کچھ نہیں لکھوں گا...... کبھی نہیں۔ اس لیے کہ میں نے دوسروں کی ہی طرح مشین کی سی بے حسی اوڑھ لی ہے۔

بیدردی سے اپنے سچ کے احساس کو کھرچتے ہوئے، اندر کا آدمی ویسا ہی رہتا ہے...... تھکا ہارا اور بوجھل۔ تبھی تو کرشنا کے ڈھابے سے نکالے جانے کی بات پر بھی میں پگھلا نہیں تھا۔ صرف سنا کہ وہ اپنے بیمار بچے کو ڈھابے لے جاتا تھا۔ مالک نے کئی بار منع کیا۔ " گاہک کتراتے ہیں، اس کا باہر بیٹھنا ٹھیک نہیں۔" مگر کرشنا نہیں مانا۔ بار بار منع کرنے کے بعد......اور آخر مالک نے اس کو ڈھابہ چھوڑ دینے کے لیے کہا۔ کرشنا نے ڈھابہ چھوڑ دیا۔ پھر کئی جگہ کے چکر مارے...... وہی پتر کاریتا، اونچے اونچے دفتر، منڈی ہاؤس، دوستوں نے بھی صرف تسلی اور سانتونا کے پھل ہی دیے...... ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ خبریں ملتی رہیں۔ دوست یار کرشنا سے ملنے سے کترانے لگے ہیں۔ وہ جب تب ان سے پیسے مانگ بیٹھتا ہے۔ کوئی کب تک دے سکتا ہے، اور جہاں واپس ملنے کی صورت ہی نظر نہ آئے وہاں دیتے ہوئے۔ پھر معلوم ہوا وہ جمنا پار والا گھر بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس کی وجہ بھی وہی بچہ تھا۔ کرشنا بچے کو لیے گھومتا رہتا ہے ___ یہاں وہاں، کبھی منڈی ہاؤس...... سب اس سے بچتے ہیں، پہچاننے سے انکار کرتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے سچ یہی ہے، سچ کا بودھ ایسی ہی حالت میں ہوتا ہے ہمیں۔ تبھی تو ایسی حالت کے بعد بھی کرشنا مجھ تک نہیں پہنچا تھا، میرے آفس آیا نہ ہی میرے کمرے پر آیا۔ سچ، وہ اس سچ کو جان گیا ہے کہ میں بھی اس بھیڑ سے الگ نہیں ہوں۔ اس کے پسرے ہوئے خالی ہاتھوں کا میرے پاس بھی کوئی جواب نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ ہم سچ کو صرف وہاں ٹٹولتے ہیں جہاں مردہ آنکھیں ہوتی ہیں اور بے گور و کفن لاش پر جب مردار کی بوٹیاں نوچنے والے گدھ منڈراتے ہیں، تو؟ ہم انہی گدھوں میں سے ایک گدھ بن جاتے ہیں۔ ایک تماشائی، ایک مبصر، اور تب جذبات کی پیلی آندھیاں اٹھتی ہیں اور ایسے اٹھتی ہیں کہ پورا آسمان ان آندھیوں سے سرخ ہو جاتا ہے۔ اور تب وہ لاش ایک سرخی بن جاتی ہے، ایک خبر بن جاتی ہے۔

انہی دنوں صفدر ہاشمی کی ہتیا ہوئی۔ اخبار کی بے جان سرخیوں کو ایک گرم خبر ہاتھ آگئی۔ جلوس در جلوس، آگ اگلتی سرخیاں در سرخیاں، تعزیتی میٹنگیں، گھیراؤ، نکڑ

ڈرامے، جذبات جیسے سارے باندھ توڑ کر بہہ آئے تھے، لگا تھا ہمارے یہاں مردہ شخص کو ہیرو بنانے کی روایت بہت پرانی ہے۔ زندگی میں تو اسے ہم کچھ دے نہیں سکتے۔ ہاں مرنے کے بعد کسی کی لاٹری کھل جاتی ہے۔ اور لاٹری کھولنے والے اس کے جگری یار، دوست، رفیق، سب بن جاتے ہیں، ان خبروں سے انجانے طور پر میں بھی جڑا تھا۔ سنسنی خیز جذباتی سرخیاں لگائی تھیں، اپنی بات کہنے کے لیے، سینے میں اتارے گئے نشتر کے لیے سرکار سے جواب مانگا تھا۔ میں نے سیاہ حاشیے پر صفدر ہاشمی کے ہلہ بولنے کی دردناک موت درج کی تھی۔ پھر لگا تھا، احساس کی حد شاید یہیں تک ہے۔ شروعات سے اٹھنے تک کی حد......

اور یہ حد اس دن منڈی ہاؤس میں دیکھنے میں آئی، شام کے ساڑھے چھ بجے، جب رات دھیرے دھیرے شہر پر اپنا قبضہ جما رہی تھی۔ شری رام آرٹ سینٹر کے باہر چائے والے کی دکان کے پاس دیکھا...... کچھ بھیڑ ہے، کوئی شخص چیخ رہا ہے۔ زور زور سے بولنے کی آواز آرہی ہے۔ آواز کچھ جانی پہچانی سی لگی تھی۔ کسی نے کہا...... ''کرشنا ریڈی ہے پاگل ہو گیا ہے۔''

میں تیزی سے آگے بڑھا۔ کاروں کی قطار کے بیچ ایک دم سے راستہ بناتے ہوئے اور اچانک ٹھہر گیا تھا...... گہرے سناٹے میں۔

وہ وہیں اس چھتنار پیڑ کے سائے میں کھڑا تھا۔ اس چھوٹے سے بچے کا ہاتھ تھامے ـــــ اس کے اجلے اجلے چکتے مجھے ایک دم سے بہت بڑے ہوتے دکھائی دیے...... وہ بچہ کسی پتھر کی مورت جیسا تھا...... بت بنا ہوا۔ کبھی کبھی آنکھیں اٹھا کر کسی کو دیکھ لیتا۔ پھر ویسے ہی نظر جھکا کر پتھر کے بت کی طرح کھڑا ہو جاتا۔

کرشنا کا انگ انگ تھرک رہا تھا ـــــ جیسے وہ کافی دیر سے بول رہا ہو۔ میں بھی اس سے کافی دنوں بعد مل رہا تھا اور ان کچھ دنوں میں وہ بالکل سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ آنکھیں دھنس گئی تھیں ـــــ گال تو پہلے سے ہی پچکے تھے۔ اب اس کا پورا جسم کسی مردہ ڈھانچے کی طرح دکھنے لگا تھا۔ مگر آواز ویسی ہی کرخت، اندر اندر تک اتر جانے والی۔ اس کو گھیرے کافی لوگ

کھڑے تھے۔ ایک دو آدمیوں کو ہٹاتے ہوئے میں تیزی سے آگے بڑھا۔ جسم میں جیسے خون کا دوران ایک دم سے بڑھ گیا تھا۔ کرشنا کی آواز اندر تک پھیلتی جاتی تھی۔

"صرف ایک صفدر ہاشمی نہیں، نوّے کروڑ کی اس آبادی والے ملک میں میں آپ کو دکھاؤں، کتنے ہی صفدر ہاشمی بھرے پڑے ہیں، یہاں اس منڈی ہاؤس میں، جو خود کو رنگ کرمی کہتے ہیں، آرٹسٹ بتاتے ہیں، حلیہ بگاڑ کر، داڑھی رکھ کر۔ ہو سکتا ہے یہ آپ کے لیے آٹھواں عجوبہ ہوں، مگر ان میں سے بہتوں کو اچھی طرح جانتا ہوں، اور جانتا ہوں اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ سب جی ضرور رہے ہیں۔ مگر ان کی ہتیا ہو چکی ہے۔ اس لیے کہ بہت سہہ سکنے کی حد سے بھی آگے نکل کر سہتے چلے آنے کا یہ ڈھونگ رچے جا رہے ہیں، عمر کے پچھواڑے پیچھے چھوٹے ہوئے آدمی کی ارتھی کو کندھا دیتے ہوئے بھی انہیں مدت ہو چکی ہے۔ آپ ایک صفدر ہاشمی کی ہتیا پر اس لیے چلا رہے ہو کہ سرکار نے ہلا بولنے پر اس کے نام لکھ دیا...... ایک دردناک سفر کا انجام، ایک بے درد موت...... اور یہاں فن کے جسم پر بھنبھناتے لاچاری کے کیڑے ہر صبح بہت سے گمنام فنکاروں ان کے ماتھے پر ایک بے نام ہتیا درج کر رہے ہیں اس لیے کہ ان میں سے بہتوں کے سپنوں کی ہتیا ہو چکی ہے۔"

وہ ہانپ رہا تھا۔ "اس لیے ایک صفدر ہاشمی کی ہتیا کا ماتم کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہو سکے تو نوّے کروڑ کی آبادی میں جی رہے بہت سارے صفدر ہاشمیوں کو......"

اور اس کے بعد اچانک وہ ہوا جس کا ہم سب تصور بھی نہیں کر پائے تھے۔ اچانک ہی وہ بولتے بولتے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ اس کے گلے سے پھنسی پھنسی، بھنچی بھنچی آواز نکلی۔ "مگر تم کسی کو روک نہیں سکتے، کسی کو بچا نہیں سکتے اس کی ہتیا ہونے سے۔ اس لیے کہ جب اس شخص کے سپنوں کی ہتیا ہو جاتی ہے...... جس کے پیچھے وہ اپنا مستقبل داؤ پر لگا چکا ہوتا ہے، تو آپ نہیں جانتے......"

بولتے بولتے وہ ٹھہرا، اور اس سے پہلے کہ لوگ کچھ سمجھ پاتے وہ اپنے اس بچے کا ہاتھ پکڑ کر بغیر کسی سے کچھ کہے آگے بڑھ گیا تھا۔ ہم سب جیسے کاٹھ کی مورت کی طرح اپنی جگہ تھم کر اپنے ہی وجود میں پیوست اس بے درد سچائی کو کھرچنے میں لگے

تھے۔ سر نیچا کیے، اور ایسے میں ایک پاگل اپنے بیمار بچے کا ہاتھ پکڑے بھیڑ میں یکا یک ہم سب کو ننگا کر کے کہیں گم ہو گیا تھا۔

اس کے بعد وہ منڈی ہاؤس میں دکھائی نہیں دیا۔ کافی دنوں تک۔ ہاں بہت دنوں پہلے کی اس کی ایک بات مجھے یاد آتی رہی جو کناٹ سرکس اور جن پتھ کی ان زندہ لاوارث لاشوں کو دیکھ کر کبھی اس نے کہی تھی۔ "یہ زندہ کہاں ہیں؟ کسی زاویے سے...... کیا جینا ایسا ہوتا ہے؟ ایسی ہوتی ہے زندگی؟ جہاں ماضی، مستقبل، حال سب ایک جیسے ہیں۔ تم نے اس گندے نالے کو دیکھا ہے جو سارے شہر کی گندگی بٹور کر تیز بدبو چھوڑتا ہوا کالے پانی کے جیسا بہتا رہتا ہے۔ جن سے تم گھن کرتے ہو۔" وہ پلٹا [illegible]... اچانک "اور تم بھی زندہ۔ [illegible] تم اس گندے نالے سے جڑے نہیں ہو، اس لیے کہ اس گندگی میں تمہارا بھی ایک حصہ ہے، تم ان لاوارث زندہ لاشوں سے جڑتے نہیں ہو تو تم بھی زندہ نہیں ہو۔"

کئی بار دوستوں سے پوچھا...... پاگل کہاں گیا...... کہاں گیا کرشنا، کہیں کوئی کھوج خبر نہیں۔ ہر جگہ مایوسی، اندھیرا، کوئی نہیں جانتا اسے، کہاں گیا...... کسی کو کوئی خبر نہیں۔ لیکن خبر اچانک سنگین سرخیوں کا ایک حصہ بن گئی ہے...... سنسنی خیز اور دل دہلا دینے والی............

گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر کرشنا ریڈی نے خود کشی کر لی...... چند مہینوں سے وہ جمناپار کی ہی ایک غریب بستی میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

ایک پل کو میں سناٹے میں آ گیا تھا، ایسے گہرے سناٹے میں جس کا جال ہمیشہ سے موت بنتی آئی ہے۔ یقین نہیں ہوا کہ یہ سچ بھی ہو سکتا ہے۔ کرشنا ریڈی جیسا آدمی خود کشی بھی کر سکتا ہے...... مگر کیوں......؟ کیا وجہ ہوئی، اور وجہ کے طور پر وہ آدھی ادھوری لائنیں چیختی ہیں جو اس کے خالی کمرے سے، اس کے لکھنے والی سونی میز سے

برآمد ہوئی ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ چھوڑ گیا ہے آدھے ادھورے سامان، مٹی کی صراحی، ایک ٹوٹی ہوئی چٹائی، کمرے کے دو مہینے کا باقی کرایہ اور مکان مالک کی آس لگائی آنکھوں میں اپنی موت کے بعد بھی ایک خلش اور تیز نفرت۔

"جب سپنے قتل ہوتے ہیں تو تم نہیں جانتے

اندر کیسی توڑ پھوڑ مچتی ہے

کیسی ہلچل جاگتی ہے

عمر کے پکھواڑے پیچھے چھوٹے خوبصورت سپنوں کے احساس کی جب کرچیاں چبھتی ہیں

ڈستی ہیں تب

جاگتی ہے کتابِ زیست کے آخری پنّوں کو پڑھنے کی خواہش۔

ہندی میں لکھی یہی کچھ بس آخری آدھی ادھوری لائنیں۔ زمین پر جمے ہوئے خون کے قطرے، اور صندوق نما کمرے کی چھت کے بیچ کی کڑی سے رسیوں سے جھولتی کرشنا کی لاش۔ تب اس کا لڑکا کہیں باہر کھیلنے گیا تھا، واپس لوٹنے پر جب دروازہ نہیں کھلا...... بہت پیٹنے پر بھی تب......

میرا جسم اچانک روح سے خالی ہونے لگا ہے۔ لگتا ہے سناٹا اور تاریکی دونوں مل کر مجھے دبوچ رہے ہیں، خود میں سمانے کے لیے۔ دور تک ایک اندھیری ختم نہ ہونے والی گپھا ہے اور اس گپھا میں بے روح جسم کے ساتھ میں اترتا جاتا ہوں۔

آج شام میں اس کی تعزیت میں ہونے والی میٹنگ کے خاتمے کے بعد بوجھل سا لوٹا ہوں۔ ان چیخوں اور نعروں میں بھی شامل ہوا ہوں جو اس کی ارتھی کے ساتھ دور دور تک گونجتے رہے تھے...... آسمان کو لال لال لالیوں سے پوتتے ہوئے، سرخ لہولہان بناتے ہوئے، میں ان سب کو جانتا ہوں جو اس کے دوست کبھی نہیں رہے، جن کے قرض اُس پر بقایا تھے...... جو اُس سے ملنے سے کتراتے تھے۔ اچانک مرکر وہ ان سب کا ہیرو بن گیا ہے...... اخبار کی سنسنی خیز سرخیوں تک کا ہیرو...... کوئی تیز آواز میں

چلایا ہے۔ "کرشنا ریڈی کی موت کے ذمہ دار ہم سب ہیں۔"

اور پھر ایک لمبی خاموشی چھا گئی...... دور تک سناٹا ہی سناٹا۔ انتم یاترا سے دفتر یاترا تک، اس چپی کی سوندھی مٹی لیے لوٹا ہوں تو قدم نہیں اٹھتے...... آگے نہیں بڑھتے...... شونیہ ہین، ہو گیا ہوں۔ ایک دوست ہوتے ہوئے اپنے دوست کی آتم ہتیا پر مجھے ایک سنسنی خیز خبر بنانے کا حکم ملا ہے...... کیسے کہوں کہ کرشنا ریڈی کی موت ایک گرما گرم خبر نہیں بن سکتی۔ میں نہیں لکھ سکتا...... کچھ بھی نہیں...... تھوڑے سے شبد بھی نہیں۔ اس لیے کہ آپ سب مرے ہوئے ہو۔ اس لیے کہ آپ آج جان رہے ہو کہ کرشنا ریڈی مر گیا ہے۔ کرشنا ریڈی تو اسی دن مر گیا تھا جب پہلی بار وہ مہانگری کی اس بھیڑ کا ایک حصہ بنا تھا۔ جب پیدا ہوتے ہی جذبات اور احساسات کی مالا اس نے اپنی گردن میں ڈالی تھی۔ تب سے وہ تِل تِل کر کے مرتا رہا تھا، اس وقت بھی جب اس کے اندر کے ساہتیہ کار کی قدر نہیں کی گئی اور وہ ڈھابے میں برتن دھوتا رہا۔ ایک بیمار بچے کو زندگی کا مقصد بنا کر جینے کی کوشش کرتا رہا...... اور آپ...... اس کی موت کی خبر سے اخبار کی سیل بڑھانا چاہتے ہو، تو سن لیجئے آپ سب مرے ہوئے ہو...... آپ سب......

وہ بچہ اب بھی آنکھوں میں گڑ رہا ہے...... یکبارگی اس نے میری طرف دیکھا تھا جیسے مجھے یاد کرا رہا ہو۔ "ایک بار میں آپ کے لیے پانی لایا تھا۔" پھر انجانے پن سے وہ دوسری طرف دیکھنے لگا تھا...... مجھے لگا جیسے اس بچے کی آنکھوں سے اچانک ہی تیز آگ کے شعلے نکلے ہوں اور میں پورا پورا اس شعلے میں جلتا جاتا ہوں...... جلتا جاتا ہوں۔

OO

عصری ادب ۱۹۸۷ء

آخری موڑ سے پہلے

(۱)

"ہاں! ہم پنجاب جارہے ہیں۔"

ابا نے کہا تو ایسا لگا، جیسے کسی نے جسم سے سارا خون ہی نچوڑ لیا ہو۔ یہ ٹیچرس اسٹرائیک، دہشت پسندوں کے روزانہ کے کارنامے ...... تنہائی کے کسی پراسرار گوشے میں فکر کی لمبی مسافت کے بعد ابا یہ اچانک کیسے فیصلے پر پہنچے تھے۔ چہرہ پڑھا تو وہاں وہ پرانے ابا تھے ہی نہیں جو چناؤ میں پنجاب بھیجے جانے کی خبر سن کر کیسے بوکھلائے او رڈرے ڈرے ہمارے سامنے کھڑے تھے...... پھر اماں تھیں، جن کا سپید چہرہ کچھ اتنا ڈراؤنا دکھنے لگا تھا...... کہ لگتا تھا، زندگی میں کبھی بھی اس چہرے نے مسکراہٹ اور خوشی کی کوئی جھلک نہ دیکھی ہوگی اور بھاگلپور والا بھائی عامر تھا...... سب ایک دوسرے کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کسی بھیانک حادثے کے بعد دیکھتے ہیں۔ اور پنجاب بھیجے جانے سے زیادہ بھیانک حادثہ دوسرا کیا ہوگا۔

"میرے خیال سے......"

کرفیوزدہ ماحول میں عامر کی آواز ایسے ابھری جیسے سناٹی سڑک پر گشت کرتی ہوئی پولیس کے جوتے بجے ہوں۔ سب نے عامر کی طرف چونک کر دیکھا جس کے چہرے پر اچانک بھاگلپور کا خون اتر آیا تھا......،

'میرے خیال میں ابا کو وہاں نہیں جانا چاہیے۔'
گشتی پولیس نے جیسے فلیگ مارچ کیا ہو۔

ٹن...... ٹن......

اماں کی آنکھوں میں خبریں سنتے سنتے، کلاشنکوف لیے بیٹھے 'کھڑاکو'(۱) نے جیسے اپنا مورچہ سنبھال لیا...... 'موئی نوکری گئی بھاڑ میں......'

"کھاؤ گی کیا۔ایں......"

ابا کے آگے جیسے بس یہی مسئلہ تھا جو موت سے زیادہ بھیانک تھا۔ تبھی تو موت کا نوالہ بننے سے پہلے بھی ابا کو یہی فکر تھی۔ گھر کا کیا ہوگا۔اماں کا،اس کا،وہ تو ابھی پڑھ رہا ہے۔رقیہ کا،اس کی شادی بھی تو ہونی ہے،اگر وقت نے انہیں لقمہ اجل بننے کے لیے ہی چنا ہے تو وہ انکار کیسے کر سکتے ہیں۔

ہم نے زندگی کے کسی بھی امتحان میں اس سے قبل ابا کا اتنا سپید اور خوفزدہ چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔وہ تو جیسے آتی ہوئی موت کو دیکھ رہے تھے۔گم سم۔

اماں پہلے تو چپ رہیں۔مگر ماحول میں پسری خاموشی اور بوجھل پن کے بعد ان کی بڑبڑاہٹ خود بخود ہی شروع ہو گئی......

"یہ حکومت کسی کو اچھا بھلا،خوش دیکھ ہی نہیں سکتی۔۔۔۔ کیا روز مرنے والے کم پڑ رہے ہیں جو اچھے بھلوں کو موت کے منہ میں جھونک دو۔نگوڑے ٹیچر...... لے دے کے یہی غریب رہ گئے ہیں۔چناؤ میں پنجاب جانے کے لیے۔بچوں کا مستقبل سدھارتے ہیں نا،سو حکومت نے سوچا،چلو اب چناؤ کو ان کے پلے باندھ دو۔سرکاری افسر تو نا کہہ دیں گے لیکن یہ نگوڑے جانور...... یہ نا تو جانتے ہی نہیں......"

اس نے دھیرے سے کہنا چاہا۔"اماں۔دوسرے اور بھی اسٹرائیک پر جا رہے ہیں۔"

ابا نے پھر کہا۔"تقدیر میں جہاں موت لکھی ہو گی۔وہیں ہو گی۔"

---

(۱) آتنک وادی(دہشت پسند)

عامر نے غصہ دکھایا۔ "تو پھر پنجاب جا کر کیوں مریں۔ ایک وہی جگہ رہ گئی ہے مرنے کو۔ ملک سلگ رہا ہے۔ چاروں طرف آگ لگی ہے اور ان کو چناؤ کی پڑی ہے۔ پنجاب میں چناؤ کرا کر کیا تیر مارلیں گے یہ۔ کھڑا کوؤں کو سمجھاتے ہوئے کتنے برس بیت گئے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب پنجاب سے قتل و غارت کی خبر نہ آتی ہو......ہاں، چناؤ کرائیں گے۔'

'چناؤ تو ہوگا ہی......اس نے ڈرتے ڈرتے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کی آنکھوں میں جھانکا...... چناؤ تو ہوگا ہی۔ اس لیے کہ چناؤ کوئی راستہ نہ سہی، ایک راستہ تو ہے......اپنے اختیاروں کو سمجھنے کا ایک سلسلہ تو ہے......یعنی جس دن یہ اپنے اختیاروں کو سمجھنے لگیں گے اس دن بہت کچھ ختم ہو جائے گا۔ دلوں کا خوف بھی۔ اور......

'یعنی کسی نہ کسی کو پہل کرنی ہوگی..........'عامر پھر غصے سے دہاڑا۔ مہرہ بنا ہو یا گا چچا ابا کو؛

پنجاب جانا زندگی اور موت سے جڑا ہوا معاملہ نہ ہوتا تو وہ بھی اس بحث میں ضرور حصہ لیتا کہ کہنے کو اس کے پاس بھی بہت کچھ تھا...... یہ ملک کہاں جا رہا ہے؟ اتنی اشانتی لوگوں کے دلوں میں کیوں بستی ہے؟ لگتا تھا، ہم صرف مہرے بچ گئے ہیں، ایک بوسیدہ سی شطرنج پر برسوں سے استعمال شدہ مہرے۔ چالیں تو کوئی اور چل رہا ہے اور یہ مہرے گھس پٹ گئے ہیں، برسوں سے ملنے والی مات کے بعد اور مسلسل توڑ پھوڑ کے عمل سے گزرتے ہوئے۔ کبھی کبھی لگتا کوئی دوغلا بستا ہے اندر، جو فوراً اپنی بات چھپالیتا ہے۔ سچ پر جھوٹ کی نقاب ڈال دیتا ہے۔ ہم کیا کچھ چاہتے ہیں اور کئے کچھ چلے جاتے ہیں...... پھر یہ کہنا، اپنی صفائی دینا، بن جاتا ہے...... کہ سنو، ہم مسلمان ہیں تو کیا۔ ہمیں غلط مت سمجھو۔ بابری مسجد کا معاملہ اٹھتا ہے تو کیا۔ ہمیں غلط مت سمجھو۔ نواز شریف دوغلی پالیسی اپناتے ہیں تو کیا، ہماری وفاداری کو غلط آنکھوں سے مت دیکھو۔ ہر پل، ہر

لمحہ، بے حسیت اور بزدلانہ رویہ کے بطور اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے لگا ہے، اپنے پاس اپنا کہنے کو کچھ بھی نہیں بچا،نہ غصہ، نہ احتجاج، نہ لفظ...... سب ملکی مسائل کی نذر ہو گئے ،یا اپنی ذات کو ہندو دوستوں کے سامنے چم چم چمکانے کے کام آ گئے۔'

ابا ہمیں انٹلکچوئل کہتے ہوئے ہنستے ہیں۔ بہت دیکھے ہیں تم جیسے باتیں بنانے والے۔ جان رکھو، یہ سب بس لفظ ہیں،......

ہم نے آزادی نہیں دیکھی۔ کتابوں میں پڑھی ہے۔ابا بار بار اس لٹی پٹی آزادی کو کتابوں سے کھینچ لاتے ہیں۔ کہ دیکھو بابری مسجد تو اس وقت بھی تھی لیکن آنکھوں میں شہتیر ڈھونڈنے والی نظریں اس وقت اس طرح مندر مسجد کہاں دیکھتی تھیں۔

"مندر مسجد نہیں دیکھتی تھیں۔ اس لیے کہ انہیں تو ایک دوسرے کو کاٹنے مارنے کا بھوت سوار تھا۔بات تو ایک ہی ہے ابا۔یا تو کاٹنے مارنے کے لیے فرق تلاش کرو۔راستہ پیدا کرو۔ کل ان لوگوں کے پاس ہندستان سے علیحدہ ملک پاکستان کا معاملہ تو تھا ہی......اور آج کی پیڑھی کے پاس......،

وہ کہتا تو ابا سنجیدہ ہو جاتے......

تم کیا جانو آزادی کا مطلب 'ہاں۔ تم آزادی کا مذاق اڑا سکتے ہو۔ دیکھی نہیں نا......مل گئی۔اس لیے اس دور کا زخم کیا جانو...... آنکھیں گیلی ہوتی ہیں۔واقعات کے پل صراط سے گزر کر خود کا محاسبہ کرتی ہوئی گلوگیر ہو جاتی ہیں۔ نفرت کی ابتدا کب سے ہوئی؟ شاید تم سچ کہتے ہو...... تاریخ کے کھوہ میں جاتا ہوں تو وہاں بھی قتل وغارت کے ہی چھینٹے ہیں۔ ہر جگہ، ہر باب، ہر حاشیے پر...... غدر کی بات کرو یا جنگ آزادی کے بعد بدلتے ہوئے حالات کا آئینہ دیکھو۔ حالات زیادہ اور کم نہیں، ہمیشہ خراب رہے ہیں، بس، اتنا کہنا زیادہ ٹھیک ہے۔"

اس نے ابا کی آنکھوں میں جھانکا......اس کیوں کا جواب آپ کو نہیں لگتا۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ کیوں تو ہمیشہ سے ہے......اگر اسے مذہب کے خانوں میں دیکھئے تو الگ الگ جماعتیں شروع سے ہی تمام صلح صفائی اور دوستی کے باوجود الگ الگ قومیت کی

آنکھوں کو ایک ذرا فاصلے سے دیکھتی آئی ہیں۔"

وہ اچانک ٹھہر گیا۔ اس نے ابا کو ایکدم غور سے دیکھا۔ اسے لگا، دنیا ایکدم سے ٹھہر گئی۔ ابا کے کرتے پائجامے اور معصومیت، سادگی سے جکڑے بھولے بھالے وجود میں جنون کہاں رکھا تھا؟ اماں کی کلام پاک چومتی آنکھوں میں، محنت لگن سے 'ملیدہ' بناتے ہاتھوں میں وہ اسلام کا پرچم کہاں چھپا تھا جو ایک دم اچانک بہت سوں کا جنون بن جاتا ہے۔ جو گلی گلی، سڑکوں سڑکوں معصوم خون کی بارش کرتا پھرتا ہے۔ پھر وہ ڈھیر سارے لوگ اچانک ابا امی کا لباس پہنے غول کے غول کہاں سے آجاتے ہیں۔ مذہبی جنونیوں کا لباس پہنے...... چیختے چلاتے، گھر جلاتے، مار کاٹ کرتے...... لگا، تب یہی چہرے معصومیت اور سادگی کے پتلے اچانک خونخوار بن جاتے ہوں گے...... درندے ...... ایک دوسرے کو لوٹتے، گھر جلاتے ہوئے...... پنجاب میں درندگی کی یہ پہل کیسے ہوئی ہوگی۔ یہ کھڑاکو اور دہشت پسند کیسے ہوتے ہوں گے...... انسانی جانوں کے تعاقب میں بیٹھے۔ بس میں گھسے، مسافروں کے غول میں چھپے۔ اچھی بھلی جاتی ہوئی بس روک دی۔ مسافروں کو ہتھیاروں کے زور پر اتارا، کاٹ دیا۔ ایک لہولہان منظر کو جنم دیا اور چھپ گئے۔ پھر کسی دوسری بس، دوسرے مسافروں کے انتظار میں...... آزادی...... تب بھی یہی خون میں لت پت آزادی ہوتی تھے، ابا جسے کتابوں کے بوسیدہ پنوں سے پپڑی جمے ہونٹوں تک لاتے ہوئے سرد آہ بھرتے تھے۔

ابا ٹیچر تھے ــــــ سرکاری اسکول میں ــــــ کبھی کبھی موڈ میں ہوتے تو ہنس کر کہتے۔

"ہمیں تو ٹیچری مل گئی۔ غنیمت۔ اپنی خبر لو۔ ہندو ملک میں کوئی سی بھی نوکری نہیں ملنے والی۔"

ابا کی بات پر غصہ آتا۔ "ہندو ملک؟ کس کے ذہن کی پیداوار ہے ابا؟ اسی لیے تو لوگ ہمیں غدار اور پاکستانی تک کہتے ہیں۔"

ابا بگڑتے نہیں مسکراتے ہیں۔ پڑھانے کا یہ تو فائدہ ہوا، پکے پولیٹیشن بن گئے

ہیں۔ من ہی من مسکراتے ہیں۔ پھر ایک شوشہ چھوڑتے ہیں۔

''کچھ بھی کہہ لو۔ کچھ ہی برسوں میں بی جے پی کی سرکار تو آنے والی ہے۔ پھر یہاں ہندوراشٹر یہ ہوگا۔ ہندوراشٹر یہ......''

''یہ سب وہم ہے آپ کا۔ ذہنی گندگی۔''

''نہیں میاں''۔ابا سنجیدہ ہو جاتے۔''انہوں نے محسوس کرلیا ہے کہ ہندوستان کی باگ ڈور اپنے طرز اور اپنے طور طریقوں میں ان کے ہاتھوں میں ہونی چاہئے۔ اور جب وہ اپنے طور طریقوں اور اپنے طرز کا استعمال کریں گے تو وہاں تم جیسے مسلمانوں کا گزر نہیں ہوگا میاں۔ تم وہاں اونچے عہدوں پر بھی نہیں ہوگے۔ کتوں سے بدتر ہوگے''۔

''جیسے پاکستان میں ہندو ہیں۔''

ابا کی گرجتی آنکھوں نے گھور کر دیکھا۔ ''تم ہی لوگوں نے...... تم ہی لوگوں نے ان جیسوں کو بڑھاوا دیا ہے۔ انہیں اپنے ارادوں میں مضبوط بنایا ہے۔ ہاں۔ ہم......اب کہاں رہ گئے۔''

لگا تھا، ابا اپنی پہچان بھول رہے ہیں۔ یا بھول گئے ہیں۔ ابا کو اپنی پہچان کرانے کی ضرورت ہے۔ ہم تو ہر جگہ ہیں۔ سیاست سے لے کر کرکٹ، ہر جگہ ......ہاں ہم ویسے نہیں ہیں اور ہو بھی نہیں سکتے لیکن ہم ہر جگہ ہیں —— ہم حیثیت بھر جنگ بھی لڑتے ہیں۔ ہارتے بھی ہیں۔ بحال بھی ہوتے ہیں۔

بابری مسجد کی بات چلتی تو دیکھتا، ابا پرانی کتابوں سے تاریخی شواہد اکٹھی کرتے پھر رہے ہیں۔ پھر بڑے فخر سے بتاتے، آج اسکول میں رما بابو اتہاس کے ٹیچر سے بحث چھڑ گئی۔ بس فلاں کتاب سامنے رکھ دی۔ ایرے غیرے کی کتاب سے بھلا کیا پتہ چلتا۔ رما بابو چپ...... بولے...... ہاں یہ بات تو ہے......'' ہنستے ہیں...... رام مندر اور بابری مسجد کا فیصلہ کرنے کے لیے تو آپ جیسے لوگوں کو بلانا چاہئے......ارے ہمیں بلایا جائے تو ایک منٹ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیں۔''

کشمیر لبریشن فرنٹ والوں پر ابا ناراض ہوتے۔ ''انہی لوگوں نے ہندوستان میں

مسلمانوں کی ساکھ گرائی ہے۔ میاں اسکول میں ٹیچر دوستوں سے زور دے کر اپنی وکالت کرنی پڑتی ہے کہ امان اللہ خاں اور اس کے گروپ کے لوگ غلط کر رہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ اپنی ساکھ بنی رہے۔ اپناڈنکا بجتا رہے۔ اپنی وفاداری کاڈنکا۔"

"اسی وفاداری کاڈنکا بجاتے بجاتے آپ شک کے دائرے میں آگئے ہیں ابا، آپ قوم ومذہب اور بھائی برادری جیسی باتوں پر اتنی مغزماری کیوں کر رہے ہیں۔ چھوٹی سی بات ہے۔ دوسرا ملک اگر ہمارا بھلا نہیں چاہتا تو ہمارا دشمن ہوا۔ یہاں اگر مگر یا وکالت کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"ضرورت پڑتی ہے میاں، ابا کو اپنی بات ثابت کرنے کی جلدی ہوتی۔ شک کی سوئیاں جب تمہاری طرف بلند ہوتی ہیں تو صفائی نہیں دو گے۔ کشمیر ہو یا پاکستان کا مسئلہ، ہم زیادہ سے زیادہ اپنے بچاؤ اور اپنی صفائی دینے میں لگے رہتے ہیں۔"

"مطلب یہ ہوا کہ ہندوستان سے ہمارا ذہنی، جسمانی، اور روحانی لگاؤ نہیں ہے۔ اس لیے اگر لگاؤ ہوتا تو ہندوستان کو نقصان پہنچانے والی ہر جماعت اور ہر ملک ہمارا دشمن ہوتا۔"

'کہنا آسان ہے...... آسان ہے......'

ابا دو چار بار اس لفظ کو دہراتے ہیں۔ خاموش ہو جاتے ہیں۔

میں دیکھتا ہوں۔ ابا چپ ہیں۔ آنکھوں میں اندھیری پرچھائیاں اتر رہی ہیں۔ نظروں میں کہیں اپنے ہی لیے بغاوت کی رسہ کشی چلتی ہے۔ دو چار سال پہلے اس سدا بہار چہرے پر جھریوں کا ایسا جال نہیں پھیلا تھا۔ جیسا ابھی، اسی لمحے' ذہن پر مسلسل گشت کرتے واقعات کا محاسبہ اپنی وفاداری غداری کی گتھم گتھی میں، جھریاں کم ہوتی ہیں...... آنکھیں اٹھا کر بغور میری طرف دیکھا ہے۔

'سچ کہتے ہو۔ بزدل تھا تو پاکستان کیوں نہیں چلا گیا۔ یہاں کیوں رہ گیا۔ اپنے آپ کو اذیت دینے کے لیے، برف جیسا یخ لہجہ ......ان برسوں میں کتنی بار خود سے جنگ کرنی پڑی ہے...... سمجھ رہے ہو میری بات کو۔ اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے۔

ہاں! کہ جو غلط ہو رہا ہے ملک کے نقشے پر، وہ ہم نہیں ہیں۔ وہ ہم نہیں کر رہے۔ گھنٹوں تنہائی کے گوشے میں بیمار لفظوں کے سہارے اپنی تسلی کرائی ہے کہ وہ...... ہم نہیں ہیں منا۔ ادھر چند برسوں میں اپنی طرف شک سے اٹھی ہوئی کتنی ہی انگلیاں دیکھی ہیں منا۔ پہلے نہیں لیکن اب...... لگتا ہے، رما جیسوں کی آنکھوں میں بھی اپنے لیے سوالوں کی پرچھائیاں دیکھتا ہوں۔ کہ مولوی، رتھ یاتراؤں کی بھیڑ میں کب تک اپنی وفاداری ثابت کرتے رہو گے تم؟ یہ یاترائیں تو نکلتی رہیں گی۔ ایک بابری مسجد کا معاملہ حل ہوگا تو یہ دہشت پسند دوسری بابری مسجد کا معاملہ کھڑا کر دیں گے۔ ایک پاکستان سے کام نہیں چلے گا تو ہزاروں کشمیری ٹائیگرس کو شک کا لباس پہنا کر تمہارے سامنے لے آئیں گے...... کہ اب بتاؤ...... جواب دو......"

ابا کے لب تھرتھرائے۔ 'برامت ماننا'...... ہم سے بہتر تو وہ قانونی مجرم ہے، کم از کم جسے روز تھانے آکر یہ ثابت تو نہیں کرنا پڑتا کہ اس نے جرم نہیں کیا۔ اور ہم...... واقعات کے رتھ ہر لمحہ اس ملک میں ہمیں اجنبی بناتے جا رہے ہیں۔ اور ہر لمحہ محاسبہ کرنا پڑتا ہے کہ...... کہ ہم اس ملک کے لیے کتنے ایماندار ہیں...... ایسے ہر کٹھن لمحے میں، ہمیں اپنی ہی عدالت میں صفائی دینے کے لیے حاضر ہونا پڑتا ہے۔

اسے لگتا ہے، وہ اچانک بہہ گیا ہے۔ ابا کے لفظوں کے بہاؤ میں...... وہ، جس نے کبھی خود کو عدم تحفظ کے احساس سے دوچار نہیں پایا۔ عدم تحفظ کا جذبہ، جسے ہمیشہ بیمار ذہن کی پیداوار لگتا آیا ہے...... مگر یہ...... اپنی عدالت میں بار بار سر جھکائے اس اعلان نامے پر دستخط کرنا...... کہ جو بھی ہو رہا ہے وہ ہم نہیں ہیں...... بار بار خود کے کٹھہرے میں خود ہی منصف بننا...... خود ہی گواہی دینا...... یہ سب......؟

عامر چپکے سے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے...... "تمہاری طرح کبھی میں بھی سوچتا تھا کہ یہ الگ الگ مذہبی خانوں میں جنون کے بارود کیوں رکھے ہیں۔ مگر اب...... شاید میں ہی نہیں...... مجھ سے پہلے بھی میری طرح ہی بہت سے لوگ ایسا سوچتے تھے...... مگر اب رفتہ رفتہ......"

اس کی آواز کمزور پڑ رہی تھی...... بھاگلپور کی آگ نے سب کچھ جلادیا......، اس کی آنکھوں میں لاوے کی چنگاریاں تھیں۔ جل تو سب کچھ بہت پہلے ہی گیا تھا...... مگر جھیلنے سے پہلے تک تسلیوں کے بول تو تھے ہی ہمارے پاس......وہ بھی سلگ گئے تو......؟ صرف ایک ہی سوال رہ جاتا ہے۔ عدم تحفظ کا...... کیا ہم یہاں محفوظ ہیں؟

تبدیلیوں نے کیسے کیسے گھاٹ کا پانی پیا۔ اس کے پاس ان باتوں کا کیا جواب ہے۔ سرکاری اسکول میں کام کرنے والے ابا کے دل ودماغ میں اپجے خوف اور باغیانہ سوچ کا ذمہ دار کون ہے......؟ مذاق کرنے کی عادت...... چٹکی لینا......بات بات میں ہنسانا...... لطیفے سنانا...... کالج کے لڑکے لڑکیوں کی دلچسپ باتوں کو مزے لے لے کر سنانا...... بھاری پڑی...... لیکن سب ایک بھاگلپور کے جلتے ہی ختم ہوگئے۔ رواں دواں بولتے ہونٹوں کو چپ کی دیمک چاٹ گئی۔ ہر وقت مسکراتی آنکھوں میں جیسے کوئی کھڑا کو کلاشنکوف لے کر بیٹھ گیا۔ چہکتی آواز میں سانپ کی پھنکار شامل ہوگئی۔

ابا کہتے تھے۔ کہیں جاؤ، موت مسلمانوں کے تعاقب میں نکلی ہوئی ہے۔ جمن بھائی پاکستان چلے گئے تو وہاں کون سے بخش دیئے گئے۔ سارا خاندان شہید ہوگیا۔ بلوائیوں اور حملہ آوروں نے صرف یادیں چھوڑی ہیں۔ کتنی خوشی خوشی پاکستان گئے تھے بھیا...... کہتے تھے اپنا ملک اور سکون کی سانس لیتے تھے۔ مجھ سے بھی کہتے تھے...... تم بھی چلے آؤ۔ اپنا ملک جو ٹھہرا۔"

"اپنا ملک......ابا ہنستے نہیں...... آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کے قطرے گرتے ہیں......وہ بلوائی کون تھے......اپنے سگے...... جنہوں نے جمن کے پورے خاندان کو کاٹ ڈالا تھا...... کون تھے؟"

ابا سچ ہی تو کہتے تھے۔ موت مسلمانوں کے تعاقب میں نکلی ہوئی ہے...... کہیں جاؤ...... بخشے نہیں جاؤ گے...... چن چن کر ہر جگہ مارے جاؤ گے...... تین ہی بھائیوں کا خاندان تو تھا ابا کا۔ سب قسمت کی بات......ایک بھائی پاکستان چلے گئے۔ ابا دلی آگئے تو نصیب میں سرکاری اسکول کی ملازمت لکھی تھی۔ رشید چچا بھاگلپور رہ گئے۔ کہتے تھے

وہیں کاروبار کریں گے۔ اپنی محنت اور لگن سے کتنی ترقی کی تھی۔ چند برسوں میں ہی کاروبار کو کتنا آگے بڑھالیا...... یاد ہے، گرمیوں کی چھٹیوں میں دو سال قبل ہی تو ابا اسے بھاگلپور لے کر گئے تھے۔ پھر ایک بڑی سی کرانہ کی دکان دکھائی تھی، جہاں رشید چچا اور عامر کے بڑے بھائی بیٹھتے تھے۔ رشید چچا کی آنکھوں میں کیسے اندر دھنشی قمقمے روشن تھے۔ جب کاروبار شروع کیا تھا، تب یہاں بس تھوڑے بہت صابن، بچوں کی کاپیاں، پینسل اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں تھیں......اور آج......"

روشن آنکھیں ترقی کی دو منزلہ عمارت کی جانب اٹھ جاتی ہیں۔ "آج اللہ کا دیا سب کچھ ہے میاں......"

ابا رشید چچا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہیں...... "فائدہ تو تجارت میں ہی ہے بھائی۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔ آباد رکھے......"

وقت گزر گیا لیکن اس رات کھانے پر اسے رشید چچا کا خوفزدہ چہرہ اب تک یاد ہے "......ہاں......دعا......کرو......بھائی......کہ......ہم......لوگ......خوش رہیں......آ......با......د......رہیں......" لفظ برف کی طرح ٹوٹ رہے تھے۔

"مسلمانوں کی ترقی کس سے دیکھی جاتی ہے بھائی۔ آگ لگانے والے دشمنوں کی آنکھیں اب اس شہر پر ہیں۔ کتنی ہی بار شہر میں حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا......دعا کرو۔ یہاں کچھ بھی نہیں ہو......سب چین سکون سے رہیں......"

اور ابا سچ کہتے ہیں، موت مسلمانوں کے تعاقب میں نکلی ہوئی ہے۔ اس دن آسمان سے خون کی بارش ہوئی تھی......شاید......سب کچھ تو ختم ہو گیا......گہرے سناٹے سے جنمی خوفناکی اور عامر کا لہولہان بت چہرہ۔ رقیہ کی ساون جھڑتی آنکھیں، اماں کی الاپ، عامر کے چیخ لفظ......سب کچھ ختم ہو گیا چچا ابا......

"شاید اللہ کی یہی مرضی تھی۔ تمہیں علی گڑھ میں داخلہ دلوادیا۔ خاندان کا کوئی وارث......"

"علی گڑھ کون سا محفوظ ہے چچا ابا......"

اسے عامر کے لفظوں میں سانپ کی وہی پھنکار محسوس ہوئی۔
اور......اباجی کہتے ہیں...... موت مسلمانوں کے تعاقب میں......

(۲)

پنجاب کی خبر کا ابا پر اثر ہونا واجب تھا...... کمرے میں اُمڈی ہوئی دہشت سے لگا، وہ سارے منظر پھر سے زندہ ہو گئے ہوں۔

عامر کے ہونٹوں کے سانپ نے پھر پھن پھیلایا"......چچا ابا نہیں جائیں گے......"

رقیہ بولی۔"ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے۔ کوئی بچ کر نہیں آتا وہاں سے۔"

اس نے اماں کی طرف دیکھا، رقیہ کے آخری لفظ سے جن کے چہرے پر خوف کی پرتیں نمایاں ہو گئی تھیں۔

"لیکن۔ سب جائیں گے تو بھلا میں کیسے نہیں جاؤں گا۔"

"آپ نہیں جائیں گے بلا سے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا، نوکری سے نکال دیئے جائیں گے۔ نکال دیں۔ میری جوتی......"

یہ اماں کا احتجاج تھا۔"جان تو بچی رہے گی۔ جان ہے تو جہان ہے۔"

"شام میں رما بھائی اور دو۔ ایک ٹیچر آئیں گے"

"ابا کے لفظ نپے تلے پڑ رہے تھے۔ ان سے بات چیت کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہو گا۔"

اس نے نگاہ اٹھائی۔ بوکھلائی ہوئی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ کمرے کے بوجھل سے ماحول کو دیکھا۔ لگا، جیسے کسی شمشان یا قبرستان میں آ گیا ہے......سب کی آنکھوں میں خوف کے سانپ کنڈلی مارے بیٹھے ہیں۔ سب کی آنکھوں میں جیسے موت سلگ رہی ہے......ابا رما چچا کو بہت مانتے تھے۔ رما چچا یعنی رما کانت ......وہ بھی بہار کے ایک گاؤں سے تھے...... اتہاس کے ٹیچر۔ اب تو گاؤں کی زمین بیچ کر یہیں مکان بنوا لیا

تھا۔ جب بھی ابا کے سامنے کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا، رما چچا کسی سایہ دار برگد کی طرح پیش آتے......ابا ان کی ہر بات مانتے تھے......کہتے تھے۔ پرانے لوگوں میں یہی تو اپنا پن ہے۔ یہ اپنا پن اب کھوجنے پر بھی نہیں ملے گا۔

شام میں.........گھر میں ہی چھوٹی سی بیٹھک جم گئی۔ وہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوا تو ابا سمیت رما چچا اور باقی تینوں ٹیچروں کے چہرے بھی لٹکے تھے......"کیا ہوگا" کے خوف سے۔

رما چچا نے دھیمے سر میں کہا......"اعلیٰ افسروں نے جانے سے انکار کر دیا۔ اب تلوار ٹیچروں کے سر پر ہے......کل تک کوئی فیصلہ لے لینا ہے۔"

"ہم میں سے کوئی نہیں جائے گا......" رگھوناتھ بابو جل کر بولے۔

رما چچا کی آنکھوں میں بھی خوف تھا۔ "یہ تو وہی بات ہوئی کہ اوکھلی میں سر ڈال دو۔ حکومت ہمیں آخر کہاں تک حفاظت دے گی۔ پولنگ بوتھ تک۔ بچ کر آ گئے تب بھی کیا ٹھکانا کہ ہمارا نام کھڑا کوؤں کی ہٹ لسٹ میں شامل نہ ہو۔"

رگھوناتھ بابو چونک گئے۔ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے......ہم نہیں جائیں گے۔

رما چچا نے گھور کر رگھوناتھ کو دیکھا......"سوال صرف اکیلے تمہارے جانے کا تو نہیں ہے۔ رگھوناتھ مسئلے کا حل سوچنا ہے۔ سب یہی کہہ رہے ہیں۔ پنجاب جانے کا مطلب ہے کوئی صاف بچ کر نہیں آئے گا۔"

ابا نے دھیمے سر میں احتجاج کیا......"جو اچھا لگے وہی کرو بھائی۔ ہاں ایک بات ہے۔ کون کہاں محفوظ ہے۔ آگ تو سب جگہ لگی ہوئی ہے بھائی۔ سڑک پر، بس میں، گاڑی میں......، اب تو ہر آنکھ میں کھڑا کو نظر آتا ہے......ہر آدمی لگتا ہے بندوق تانے سامنے کھڑا ہے۔ بس میں بھی ہر وقت جی گھبراتا ہے......کہ اب دھماکہ ہوگا اور بس کے ساتھ ہمارے بھی پرزے اڑ جائیں گے.........سوتے جاگتے ہم اس خوف سے الگ نہیں ہو پاتے۔

رما چچا آگے بڑھے۔ دھیرے سے ابا کے کندھے تھپتھپائے......ڈرو مت۔ سب

ٹھیک ہو جائے گا۔

مگر اسے معلوم تھا۔ سب ایک دوسرے کی تسلیوں کے لیے لفظ اچھال رہے ہیں۔ بس سب ٹھیک نہیں ہوگا۔ امید کی جوت بجھتی جا رہی ہے ایک ایک کر کے۔ بھگوے جھنڈوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے...... پھیلتی جا رہی ہے......اور کلاشنکوف لیے ہوئے کھڑا کو سب کی آنکھوں میں بس گیا ہے......

اس دن اس نے دیکھا۔ ابا دیر تک کمرے میں ٹہلتے رہے۔ نیند نہیں تھی۔ سارے گھر کی نیند اچٹی ہوئی تھی۔ عامر بالکونی پر جینس کی پینٹ اور جرسی پہنے کرسی پر ادھ لیٹا پرانی یادوں سے شاید بھاگلپور چرا رہا تھا۔ وہ چپکے سے آیا۔ عامر نے نظر تک نہیں اٹھائی۔ موسم میں خنکی تھی۔ اس نے دھیرے سے عامر کا کندھا تھپتھپایا......اندر جا کر سو جاؤ۔ ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔

کمرے میں رقیہ بت بنی کتاب کے ایک ہی صفحہ کو گھنٹوں سے تکے جا رہی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر آیا تو ابا ٹیرس پر گہری سوچ میں ڈوبے ٹہل رہے تھے۔ اور عامر، ویسے ہی جرسی اور جینس کی پینٹ میں کرسی پر ادھ لیٹا پڑا تھا۔

پتہ نہیں کیوں......انجانے خوف سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جیسے گھر پر کسی کی میت پڑی ہو اور سب کے سب اداسی سے لپٹی اس سے وابستہ یادوں کو اوڑھے گہرے اندھیرے کو گھور رہے ہوں۔ ایک ٹک......

بجلی سی چمکی۔ آسمان سے کوئی تارا ٹوٹا اور دور تک ایک لکیر سی آسمان کو پاٹتی ہوئی چلی گئی۔ اور......اس دن سچ مچ ایک حادثہ ہو گیا...... آدھی رات میں رما چچا کے یہاں سے ایک آدمی بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے بتایا کہ رما چچا جب گھر لوٹ رہے تھے تو کسی نے انہیں چاقو مار دیا۔ بجلی زوروں میں چمکی اور جیسے اس کے وجود میں گھستی چلی گئی۔ جیسے اس کے گوشت کے پور پور میں سما گئی۔

اسے لگا۔ ابا کہہ رہے ہوں...... پرانے لوگوں میں یہی تو اپنا پن ہے۔ یہ اپنا پن اب کھوجنے پر بھی نہیں ملے گا۔ اور......رما چچا دھیرے سے ابا کے کندھوں پر ہاتھ رکھ

رہے ہوں......ڈرو مت۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔
اس نے دیکھا، رما چچا کے مرنے کی خبر لانے والے کو ابا نے زوروں سے جکڑ لیا ہے۔ ابا وحشت سے چیخ پڑے ہیں۔
"کس نے مارا۔ بولتے کیوں نہیں۔ کس نے مارا"
ابا کا پورا بدن لرز رہا ہے۔ "کس نے مارا۔؟"
"پتہ نہیں۔ ماسٹر جی کا تو کوئی دشمن بھی نہیں تھا۔"
"اسے لگا۔ ابا کے کھردرے ہاتھ خبر لانے والے کے کندھوں میں پیوست ہو گئے ہیں۔ اسے ابا کی دلخراش چیخ سنائی دی۔
اسے صرف اتنا لگا، موت صرف مسلمانوں کے تعاقب میں نہیں نکلی ہے۔ موت تو سب کے تعاقب میں نکل پڑی ہے......اسے لگا، سب بدلتی ہوئی بے رحم فضا کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں بن گئے ہیں......سب اپنے اپنے موت کے ٹھکانوں کی تلاش میں دوڑ لگا رہے ہیں...اور موت مسکراتی ہوئی کہہ رہی ہے بھاگو گے کہاں؟ جاؤ گے کہاں...جاؤ گے کہاں؟. مرادآباد.. مئو۔ بھاگلپور، فیض آباد ...... بنارس ...... علیگڑھ ...... کہاں جاؤ گے۔ کہاں بھاگو گے۔ پنجاب۔ کشمیر۔ میں تو سب جگہ ہوں......سب کی آنکھوں میں بستی ہوں......میں ہی کھڑا کو ہوں......میں ہی دہشت گرد اور میں ہی خوف بن کر سب کی آنکھوں میں سلگ رہی ہوں...... کہاں کہاں بھاگو گے۔
اسے لگا، فرار کہیں نہیں ہے۔ ابا کسی لاعلاج مریض کی طرح ہاتھ جھٹک کر بستر پر لیٹ گئے ہوں...... آنکھوں میں گہرے حلقے پڑ گئے۔ روتے روتے آنکھیں سوج گئی ہیں......
عامر کھڑکی سے دوسری طرف دیکھ رہا ہے...... ٹھہر ٹھہر کر کمرے کے بوجھل ماحول میں اماں کی سسکیاں گونج جاتی ہیں۔ ابا کے اندر جیسے کشمکش چل رہی ہے......ابھی ابھی تو رما چچا کے "داہ سنسکار" سے لوٹے ہیں۔ تب سے بت بنے ہوئے ہیں۔ اماں نے سر میں تیل ڈالا۔ ابا کچھ نہیں کہتے...... کچھ نہیں بولتے۔ صرف پتھر بن

گئے ہیں...... آنکھوں میں جیسے یادیں سلگ رہی ہیں۔

ابا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اور جیسے بوجھل کمرہ اچانک زلزلے سے ڈول گیا۔ "سنو! ہم پنجاب جا رہے ہیں۔"

انہوں نے پہلے اماں کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف۔ کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے عامر نے خوف سے جھرجھری لی۔

"اگر ہمارا جانا رڈ نہیں ہوتا ہے...... تو......" ابا کی آنکھیں کمرے کی اجاڑ دیواروں کو گھور رہی تھیں...... "کوئی جائے نہ جائے، میں جاؤں گا...... مجھے کوئی خوف نہیں...... ہاں سنا...... مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔"

ابا کے منہ سے لرزتی ہوئی سانس پھوٹ رہی تھی......اس لیے کہ میں جان گیا ہوں...... گولی تو کہیں سے بھی آسکتی ہے...... کہیں سے بھی...... کسی کو بھی مار سکتی ہے...... کیا پتہ یہیں کوئی کھڑا کو چھپا ہو...... میں نے فیصلہ کر لیا ہے......"

خنکی بڑھ گئی تھی......

ابا کے ہونٹوں سے گرم گرم جھانس اٹھ رہی تھی اور آواز کی برف پگھل پگھل کر ٹوٹ رہی تھی......

○○

نیا سفر ۱۹۹۲ء

یہ کسی تھکی ہوئی رات کی داستان نہیں ہے۔(۱)

"سارا کچھ بس تبدیل ہوا چاہتا ہے۔ یقیناً تم بھی دیکھو گے۔" شمو بھائی نے اتنی زور سے مکا مارا کہ میز پر رکھے شراب کے گلاسوں میں تھر تھراہٹ دوڑ گئی۔

پرویز احمد نے جیب سے ٹرپیل فائیو نکال کر سگریٹ سلگایا۔۔ "ممکن ہے ایسا ہوتا ہو۔ مگر تعجب ہے......"

وہ دیر تک تعجب ہے کی گردان کرتے رہے—— میز پر اب شراب کے خالی گلاس پڑے تھے—— "آفیسر چوائس" کی بوتل خالی تھی اور اس کی شراب ہمارے اندر اتر کر دماغ میں کھلبلی مچا رہی تھی۔

شمو بھائی نے پھر زور سے کہا۔ "تبدیلی ایک الگ چیز ہے اور تبدیلی ضروری بھی ہے۔ دنیا گھومتی ہے۔ زمین کے نیچے پڑا قارون کا خزانہ گھومتا ہے،......اور ایک خاص وقت میں۔۔۔ میں تو کہتا ہوں اگر اسے مذہب سے نہیں جوڑا جائے تو......اور اگر جوڑ بھی لیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں سب کچھ الٹا پلٹا ہو سکتا ہے، یعنی ہم جانور بننے کی حد تک جانور بن سکتے ہیں یا جانور انسان بننے کی حد تک انسان...... نہیں، شاید اپنی بات ٹھیک طرح سے سمجھا نہیں پا رہا ہوں...... مسٹر کمال تم ہی کہو——"

وہ لاچاری سے، بے بسی سے اپنے کمزور لفظوں کا ماتم کرتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

"میں......!" میں تھوڑا جھجھکا۔ مگر صداقت یہ تھی کہ اس بحث کا آغاز بھی میں نے ہی کیا تھا۔ میں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

"تو میرے معزز دوست......! یقین کیجئے جو میں کہنے جارہا ہوں وہ میری موجودگی کے امکان تک، جو آپ بھی اس وقت محسوس کررہے ہیں، صحیح ہے۔ درست ہے اور اس میں شک کرنے جیسی کسی بات کو دخل نہیں۔۔۔"

پرویز احمد نے اس طرح سے منہ بنایا جیسے اسے میری تمہید ناگوار خاطر گزری ہو۔

میں نے گہرا سانس کھینچا۔ "مجھے معاف کیجئے گا۔، مجھے قصہ بیان کرنے کا ہنر نہیں آتا۔ مگر اس دن۔ میں سچ کہتا ہوں۔ میری بیٹی نے جو ابھی کانوینٹ میں پڑھتی ہے، بڑی سمجھدار ہے آپ اس سے ملے ہیں...... وہی ایلیشا کمال، آپ اسے بے بی یا کسی دوسرے نام سے پکار کے تو دیکھئے۔ آپ کا جینا اگر دوبھر نہیں کردے تو پھر بے شک میرا نام بدل دیجئے۔ ایلیشا کمال، وہ اسی نام سے آپ کو ملے گی اور آپ سے بھرپور قابلیت اور ذہانت کی باتیں کرے گی۔ میری بیٹی مجھ سے برابر کہتی ہے...... دیکھئے تعجب مت کیجئے گا۔ میں جو کہہ رہا ہوں وہ سوفیصدی سچ ہے...... کہ ڈیڈی ادھر بہت دنوں سے میں نے جلتا ہوا مکان نہیں دیکھا،۔۔۔ اور آپ یقین کریں کہ کسی دھواں دیتے مکان کی سچی تصویر کھینچنے کے لیے وہ کس قدر پریشان ہوچکی ہے۔ ہندوستانی معاشرہ میں سانس لینے والے ایک باپ کی حیثیت سے، آپ سمجھ سکتے ہوں گے، بیٹی کی کیفیت دیکھ کر مجھے کس قدر کوفت اور تکلیف ہوتی ہوگی۔۔۔ نہیں آپ فرض نہیں کرسکتے۔ مگر اس دن...... ایک اور پیگ بنالوں۔ اس کم بخت آفیسر چوائس کا بھی جواب نہیں۔"

"نہیں مسٹر کمال۔۔۔!" شموبھائی نے ناراضگی دکھائی "آپ پہلے ہی بہت پی چکے ہیں"

"اوہ۔! ہاں تو میرے معزز دوستو۔۔۔! اس دن آپ کو شاید یاد ہوگا دسمبر کی ۲۶ تاریخ تھی، اور آس پاس کے مکانوں سے دھواں اٹھتے ہوئے کچھ ایسے دکھتا

تھا، جیسا کہ میں بچپن میں دیکھا کرتا تھا، اپنے ننھیال والے گھر کے پاس والی چمنی سے دھواں اٹھتے ہوئے اور آپ مجھے ایک کمزور باپ سمجھ کر معاف کر دیں، میں نے دیکھا، ایلیشا کمال کے چہرے پر حیرت کی حد تک خوشی کی جگمگاہٹ تھی وہ ممی پر قدرے خفا تھی۔ کہ تم کچھ بھی سنبھال کر نہیں رکھتیں ممی۔۔۔، تم میں یہی بری عادت ہے، میرا وہ جاپان والا کیمرہ کہاں ہے۔؟ جو مارگریٹ آنٹی نے دیا تھا۔

صوفے پر چائے کا خالی کپ رکھتے ہوئے میں نے بھی اپنی جانب سے ایک کمزور سی مدافعت کی۔ ''ایلیشا بیٹی، باہر گھر جل رہے ہیں......''

وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح مجھ پر یعنی اپنے باپ پر جھپٹی۔۔۔ ''تو...... مجھے بھی معلوم ہے، لیکن آخر آپ چاہتے کیا ہیں ڈیڈی۔ کیا آگ لگنا میری دانست میں کم از کم میرے لیے...... لیکن آپ نہیں سمجھیں گے۔ آپ تو وہ ہیں کہ صبح میں ایک کپ چائے اخبار سے پہلے آپ کو دینا کوئی بھول جائے تو آپ گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں۔...... نہیں، ایسا ہے تو آپ کو میری بات سمجھنی چاہئے کہ جو رشتہ ایک کپ چائے سے آپ کا ہے وہی۔ اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ آگ اور دھواں کو دیکھنا۔'' بات پوری نہ کرنے کی صورت میں وہ تھوڑی چلائی بھی تھی ''میں ضروری نہیں سمجھتی ڈیڈی کہ آپ کو ہر بات کی وضاحت کرتی چلوں ''

''نہیں...... تم ایک سمجھدار لڑکی ہو۔ ویسے ہر بات کی وضاحت ضروری بھی نہیں۔ ''میرے چہرے پر جیسے کہ اس طرح کے موقع پر ایک پھیکی ہنسی آجاتی ہے،...... مجھے کہنے دیجئے، میں اپنی ضدی اور سرکش ایلیشا کمال کی باتوں کی تائید میں ہاں میں ہاں ملا رہا تھا ایک کمزور باپ کی طرح۔ نہیں میرے معزز دوستو! آپ اداس مت ہوئیے۔ یہ ہم جیسے تمام باپوں کا مقدر ہے اور میں کہتا ہوں، اس سے زیادہ ہو بھی کیا سکتا ہے۔ میرے ہاتھوں میں شاید اس دن کا اخبار بھی تھا جس میں مرنے والوں کی اور...... کہنے دیجئے، مختلف طریقوں سے مرنیوالوں کی خبریں اتنی کم تھیں کہ مجھے پورا اخبار ہی غیر دلچسپ، باسی اور مسکرائیے نہیں جھوٹا محسوس ہوا۔ میں نے ایلیشا کی طرف

دیکھا جس کے غصے سے بھرے چہرے پر کیمرہ مل جانے کی وجہ سے گمشدہ ایکسائٹمنٹ لوٹ آیا تھا۔ پھر وہ ممی کو لیے ہوئے تیسری منزل کی سیڑھیاں تیز تیز طے کرنے لگی۔

پرویز احمد نے برا سامنہ بنایا۔ چھوٹی سی بات ہے، اتنی تمہید کی ضرورت نہیں، میرے بچے کو بھی دھواں پسند ہے اور میں بتاؤں۔ یوں تو وہ محض آٹھ سال کا ہے۔ چھوٹی چھوٹی کاغذ کی جھونپڑیاں بناتا ہے پھر انہیں آگ دکھاتا ہے۔ پھر خوش خوش اپنی ممی کو آواز لگائے گا کہ ممی دیکھو، جھونپڑی جل گئی، وہ اتنے مزے میں کہتا ہے کہ ہمیں سنتے ہوئے اچھا لگتا ہے کہ کاش وہ کاغذ کی ایسی ہی اور جھونپڑیاں بناتا اور انہیں آگ دکھاتا۔۔۔،

شمو بھائی نے منہ بنایا۔ ''کوئی نئی بات نہیں مسٹر کمال! آپ آگے کہیں۔''

''آگے۔۔ میں آنکھوں کے سامنے ایلیشا کو اوپر چھت پر دیکھ رہا تھا۔ وہ ایسے ایکسائیٹڈ تھی جیسے بچپن میں، میں پہلی بار پیرس، سمندر اور تاج محل کو دیکھ کر ہوا تھا۔ آپ بخوبی جانتے ہیں، ہمارا گھر تین منزلہ ہے، تیسری منزل سے سارا شہر آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ شر پسندوں نے جو دو چار گھر پھونک ڈالے تھے یہ اسی کا دھواں تھا۔ آگ اور دھویں کی کالی لپٹوں سے آسمان بھر گیا تھا۔ معزز دوستو! آپ فرض نہیں کر سکتے میری ایلیشا اس موقع پر کیسی خوش تھی۔ وہ آگ کی لپٹوں اور آسمان پر پھیلے دھویں کو کیمرے میں اضطرابی جوش کے ساتھ نظر بند کرنے لگی تو میری بیوی چلائیں۔ ٹھہرو۔ اور پھر وہ چھت کی منڈیر پر گالوں پر ہاتھ رکھ کر کسی قدر بے نیازی ظاہر کرتی ہوئی پوز دینے لگیں کہ ''ہاں ایلیشا اب تصویر لے لو۔'' میں نے دیکھا میری بچی کے چہرے پر صبح کی تازگی اور سکون کی آمیزش تھی۔ وہ مسکرائی بھی۔ ''ممّی وہاٹ اے ونڈر فل آئیڈیا۔ دھویں میں تمہارا چہرہ۔ نیور مائنڈ ممی۔ بڑھتی عمر، تمہارے چہرے کے رنکلس اور دھواں۔ میں تو کہتی ہوں کہ یہ تصویر اس ملک سے باہر چلی جائے تو کوئی بڑا انعام ضرور جیت کر لائے گی۔''

''اور میرے معزز دوستو! ٹھیک اسی وقت راکی ہمیں نیچے نہ پا کر پونچھ ہلاتا ہوا اوپر چلا آیا تھا۔ بھونکتے ہوئے اس نے اپنی خفگی کا اظہار بھی کیا کہ ہم اسے بغیر بتائے

کیوں چلے آئے،دو چار بار وہ مجھے بھی دیکھ کر بھونکا۔ پھر میرے پیروں کے پاس آکر دم ہلانے لگا۔ ایلیشا نے چلا کر کہا "راکسی، ادھر ممی کے پاس چلو کھڑے ہو جاؤ" وہ دھویں، ممی اور راکسی کو کسی مخصوص پوز میں کیمرے میں بند کرنا چاہتی تھی۔

باہر جب کہ آگ لگی ہوئی تھی۔ دھواں اٹھ رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا مجھے ایک کمزور باپ کو...... آپ ہنسیں گے نہیں۔ اس وقت بھی جس وقت ایلیشا اس پُر آشوب منظر کی تصویریں لے رہی تھی، نہیں، آپ مانیں گے نہیں، میں کچھ کہنے کی ہمت جٹا رہا تھا کیوں کہ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ سب کچھ بدل رہا ہے اور یہ میرے گھر والے ابھی سے اس طرح اپنی دیکھنے والی عینکوں کو نہیں بدلیں گے تو۔۔۔ شاید سب کچھ بہت جلد بدل جائے۔ نہیں شمو بھائی، میں نے پہلے ہی کہا ہے آپ ہنسیں گے نہیں، میں سچ بول رہا ہوں میں نے ایلیشا کو ڈانٹ پلائی تھی۔ صحیح معنوں میں شمو بھائی ایک باپ کی طرح ــــ ایلیشا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔"

"تو کیا پھر اس نے بھی آپ کو۔۔۔۔" شمو بھائی پر ہنسی کا دورہ پڑا تھا۔

"دیکھیے، اب آپ مذاق اڑا رہے ہیں میرا، جب کہ میں نے حقیقت بیانی کی ہے، میں ماں بیٹی پر خوب ناراض ہوا اور وہ راکسی۔۔۔ سچ کہتا ہوں ساری کہانی بس یہیں سے شروع ہوتی ہے، باہر آگ دھواں اور تصویر لیتی ایلیشا۔ پھر ہم تینوں کی زبردست جھڑپ اور راکسی کا ہمیشہ کی طرح سہمے سہمے انداز میں یہ سب دیکھنا۔ جبکہ ایلیشا چلائی بھی تھی کہ ڈیڈ COMMUNALISM جیسی گپ کو اخباروں نے بھی چھاپنے سے انکار کر دیا ہے اور آپ بہر کیف...... اصل بات تو یہی ہے کہ میں لڑائی کر کے ریڈنگ روم میں ہی سو گیا۔ رات کا پچھلا پہر بیت گیا تھا۔ اچانک مجھے اپنے کمرے میں کسی کے بولنے کی بھنبھناہٹ سنائی پڑی، آواز اس قدر دھیمی اور مہذب تھی کہ نیند اچٹ گئی۔ کیا یہ کوئی خواب تھا۔۔۔ لیٹے لیٹے میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔۔۔۔ دروازہ شاید رات میں کھلا رہ گیا تھا۔ اب مجھے خوف کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ کوئی قریب ہی کھڑا تھا اور میں اس کی باتوں کو صاف سن رہا تھا۔ وہ جو بھی تھا۔ لیکن مجھ سے یوں مخاطب تھا۔

"سنئے آپ ہماری درندگی اور جبلّت سب کچھ لے چکے ہیں نرم شائستہ لہجہ، آپ سن رہے ہیں نا، مہینوں میں، برسوں میں اور شاید صدیوں میں آپ تھوڑا تھوڑا کر کے اپنے انسان ہونے کے خطرے کو۔ (ہنسی) کم کرتے رہے ہیں۔ برا مت مانیے، انسان تو آپ کو اپنے علاوہ پسند تھے نہیں، جانور آپ کے پالتو بن چکے تھے...... آپ سن رہے ہیں نا، خیر۔ اس غیر دلچسپ گفتگو سے مجھے کوئی لینا دینا نہیں۔ میں صرف اتنی التجا کرنے آیا ہوں کہ اگر آپ کو ہم سے کچھ لینے کا حق ہے تو ہمیں بھی۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا، آپ ہم سے ہماری جبلّت لے چکے ہیں، آپ اپنی تھوڑی سی انسانیت ہمیں دے سکتے ہیں"

شمو بھائی نے پینترا بدلا۔

پرویز احمد نے ٹرپیل فائیو کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی میں اپنی دھن میں مزید آگے بڑھا۔ یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن یہ ہمارا راکسی تھا جو رات کے کسی پہر نیند نہ آنے کی وجہ سے چپ چاپ میرے کمرے میں داخل ہو گیا تھا اور اب میرا پاؤں سہلا رہا تھا۔ میں نے جھٹ اٹھ کر بلب روشن کیا۔ اور سچ کہتا ہوں، راکسی کی آنکھوں میں......"

شمو بھائی نے زور سے ایک مکا میز پر مارا ــــ "درست ہے بالکل درست ہے، ایک وقت آتا ہے جب ہر شے اپنی اصل سے فرار چاہتی ہے، اور کسی دوسرے روپ میں منتقل ہونے کے لیے زور مارتی ہے، اور اگر تم نے یہی کچھ یہاں سنانے کے لیے ہمیں بلایا ہے تو......،

پرویز احمد نے دھیرے سے ان کا ہاتھ پکڑا، بیٹھنے کا اشارہ کیا!! ہاں تو آگے کیا ہوا۔؟ میں نے پھر آفیسر چوائس کے ایک چھوٹے پیگ کی طلب ظاہر کی ــــ، شمو بھائی کے منع کرنے پر میں نے قصہ کو جاری رکھا ــــ، ہاں تو معزز دوستو، اس رات۔

اور سچ کہوں تو کہانی بس ایک رات کی ہی ہے۔ اف معاذ اللہ، کیسی خوفناک تاریک رات تھی جس دن ایلیشا کمال آگ کی لپٹوں اور دھواں کی تصویر لے رہی تھی۔ ''نہیں شمو بھائی میں نے ایلیشا کو سچ مچ ڈانٹا تھا۔''

''یہ کیا بات ہے ایلیشا، باہر مکان جل رہے ہیں اور تم تصویریں اتار رہی ہو۔''

اور ایلیشا کا جواب تھا۔

''مجھے مزا آتا ہے ڈیڈی، ایسی تصویریں اتارتے ہوئے، میں صحیح معنوں میں پاگل ہو جاتی ہوں۔''

میں نے ہونٹ چبائے ''یہ سب وحشی پن ہے، میں کہتا ہوں پوری قوم غیر مہذب ہوتی جا رہی ہے'' میں شاید چلایا تھا۔ تم نہیں جانتیں ایلیشا! شرپسندوں کا اگلا نشانہ ہمارا اپنا گھر بھی ہو سکتا ہے۔''

میں نے سوچا تھا کہ یہ جملہ جیسے ہی میرے منہ سے ادا ہو گا، اس کے چہرے پر ایک عجیب سی چپی چھا جائے گی، وہ بوکھلا جائے گی۔ سہمی سہمی سی اپنی غلطی کی معافی مانگے گی۔ مگر نہیں میرے معزز دوستو، اس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا جوش تھا۔

''اوہ ڈیڈی۔ کیا سچ مچ ایسا ہو گا۔ نہیں آپ مذاق کر رہے ہیں، آپ نہیں جانتے، دھویں سے مجھے کتنا پیار ہے۔''

''پاگل......'' میں دوبارہ چلایا۔ ''ابھی شاید تمہیں فساد کا تجربہ نہیں ہے، فساد میں جانتی ہو اور کیا ہوتا ہے ـــــ ظالم صرف گھر ہی نہیں جلاتے ہیں بلکہ کمسن اور جوان لڑکیوں کو کھینچ کھینچ کر......''

ایلیشا نے جیسے سحر زدہ ہو کر میری آنکھوں میں جھانکا۔۔۔ ''آپ اپنے لفظوں سے مجھے بے خود اور پاگل بنا رہے ہیں ڈیڈی۔ وہ مسکرائی تو اس کی آنکھوں میں شیرنی جیسی چمک تھی۔ آپ ہمیشہ بھول جاتے ہیں، جبکہ آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا جنم ہی ان آگ اور دھویں کے درمیان ہوا ہے، ممی کہتی ہیں نا کہ جب میں پیدا ہوئی تھی تو شہر

یوں جل رہا تھا جیسے دیوالی منائی جا رہی ہو۔" ایلیشا سامنے والے صوفے پر دھنستی ہوئی بولی۔ "اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ہسٹری کی اسٹوڈینٹ ہوں، قتل و غارت، قوموں کی جنگ اور ورلڈ وار...... یہ سب میرے پسندیدہ موضوعات ہیں" وہ ہنس رہی تھی۔ "اب آپ ان پر لکچر پلا کر زیادہ بور نہیں کریں گے ڈیڈی، میں کہہ سکتی ہوں، مجھے ان سب سے پیار ہے۔"

پھر ایلیشا کوئی انگریزی گانے کی دھن گنگناتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے ایلیشا کی ممی کو بلا کر سمجھایا۔

"اسے روکو! وہ پاگل ہو رہی ہے۔"

ممّی نے برا سا منہ بنایا۔ "شادی کے فوراً بعد تمہیں بیٹا چاہیے تھا۔ اس لیے اس کی ہر بات میں پاگل پن نظر آتا ہے۔"

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا کہ اس بڑھاپے میں، میں اس کے اندر اپنی بچی، اپنی ایلیشا کو جوں کا توں اترتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میرے لیے یہ حیرت انگیز انکشاف تھا۔

"دھواں تمہیں اچھا لگتا ہے کیا۔؟"

اس نے پلٹ کر جوابی حملہ کیا۔ "تمہیں اچھا نہیں لگتا کیا؟ یاد ہے جب گیس کے چولہے کا رواج نہیں تھا تو ہم کچے چولہوں پر کھانا بناتے تھے، باہر او سارا باورچی خانے کی دیواریں سب دھویں سے بھر جاتی تھیں۔ تم برآمدے میں ہی کرسی نکال کر کتاب پڑھتے تھے۔ میں چلاتی بھی تھی کہ دھواں ہو رہا ہے، آنکھیں خراب ہو جائیں گی اور تمہارا جواب ہوتا تھا" دھویں سے آنکھیں پڑپڑاتی ہیں تو اچھا لگتا ہے۔"

"تب جوانی تھی، جوانی میں ایسی سب پاگل حرکتیں اور عادتیں اچھی لگتی ہیں۔"

"تو ایلیشا کو کیوں منع کرتے ہو، یاد ہے جس روز وہ پیدا ہوئی تھی اس روز بھی شہر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ پھر جب وہ اسکول جانے کو ہوئی تب بھی ہر دوسرے پانچویں مہینے یہی عالم رہا۔ ہمیں بھی یہ سب دیکھتے ہوئے اب برسوں گزر چکے ہیں، اور

ایلیشا کا تو بچپن ہی اس کے سائے میں پلا ہے۔" وہ مسکرائی، "یہ دھواں اس کا دوست بن چکا ہے۔"

"لیکن کل معاملہ بھی تو دوسرا تھا، کم از کم اتنا خطرہ نہیں تھا۔"

"ہنو۔۔۔" اس نے بے دردی سے میری بات کاٹ دی، "خطرہ بس تمہاری گفتگو اور تمہارے لفظوں میں ہے، بیٹھے بیٹھے جب خود کو بہت بوڑھا محسوس کرتے ہو تو ڈر جاتے ہو، میں تمہاری طرح بوڑھی نہیں ہوئی ہوں۔"

میں نے دیکھا، اس نے ایلیشا کے گانے کی بھونڈی نقل کی تھی اور شاید اسے ایلیشا کی نقل کرنی بھی چاہیے تھی۔ کیوں کہ اب وہ پہلے والی مسز کمال نہیں تھی، جو ایک معمولی سا افسر تھا، اب اسے بھی یہ حق حاصل تھا کہ وہ دوسرے افسران کی بیویوں کی طرح کلب جائے اور کلب میں اپنے رنگ ڈھنگ کچھ ایسا ہی رکھے جیسا کہ ایلیشا رکھتی ہے یا دوسرے افسران کی بیویاں۔ ہاں بیشک، مجھے اس کے بہروپ پر تنقید کرنے کا کوئی حق نہیں، کیوں شمو بھائی۔؟"

پرویز احمد نے ٹرپیل فائیو سے دوسرا سگریٹ نکال لیا۔

شمو بھائی بوجھل ہو کر بولے۔ "اس رات؟"

"آپ نے خبر پڑھی ہو گی، فساد کی لپیٹ میں ہمارا محلّہ بھی آ گیا تھا۔" میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہاں۔۔۔" شمو بھائی نے خاصی بیزاری اور اکتاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

"شام تک خبر آ گئی کہ شرپسندوں کا ارادہ آج ہمارے محلے پر حملہ بولنے کا ہے اور ہمیں بھی اس کے لیے تیار رہنا چاہیے، آس پاس کے گھروں میں کوئی بھی اس رات نہیں سویا۔ میرے پڑوسی نے مجھ سے آکر دریافت کیا۔"

"آپ کے پاس لائسنس والی بندوق وغیرہ تو ہے نا۔۔؟"

"ہاں۔۔۔"

"اسے سڑک کی طرف تانے ہوشیار رہیے گا۔"

میں نے دریافت کیا۔ "اگر مان لو، بھیڑ حملہ کرنے پر اتر آتی ہے اور بچاؤ کے لیے گولی چل جاتی ہے۔۔۔۔ کوئی زخمی ہوتا ہے یا ہلاک تو اس صورت میں دفعہ ۳۰۲ تو نہیں بنتی۔"

پڑوسی نے مضحکہ اڑایا۔ "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ، آپ جو کچھ بھی کریں گے اپنا گھر اپنی جان بچانے کے لیے کریں گے، یاد رکھیے، باہر سڑک کی طرف بندوق تان کر۔ ہشیار۔ ویسے ہم سب تیار ہیں۔"

میں کمرے میں آیا تو ایلیشا ریکارڈ پر کسی انگریزی ڈانس کی پریکٹس کر رہی تھی۔

"بند کرو۔۔۔" میں زور سے چلایا۔

اس نے گھوم کر ناگواری اور غصے سے میری طرف دیکھا۔

"آج کی رات جنگ کی رات ہے، باہر سے حملہ ہو سکتا ہے، ہمیں تیار رہنا چاہیے۔"

میں ذرا اونچی آواز میں بولا۔ پھر ٹھہر گیا، میں نے محسوس کیا، میری آواز میں بھی کسی خطرے اور خوف کو دخل نہیں تھا، بلکہ ابھی جو مکالمہ میرے منہ سے نکلا تھا اس میں بھی ایک طرح کا ایکسائٹمنٹ پوشیدہ تھا۔ مجھے کیا چاہیے، مجھے استاد کہ ہوا کہ جوابی حملے کے طور پر میں نے زور زور سے بجتا ہوا ریکارڈ آف کر دیا "ہمیں حکم ہوا کہ ہم چھتوں پر بندوق تان کر تیار رہیں۔ گھر کی تمام بتیاں بجھا دیں اور اس سے پہلے، آپ کو تعجب ہو گا، میرے چہرے پر سراسیمگی کی جگہ مسکراہٹ تھی۔ کیوں نہ ایک ایک کپ گرما گرم چائے ہو جائے۔"

باہر سے ہنگامے کی آواز آ رہی تھی۔ ہم آرام سے کمرے میں چائے پی رہے تھے باہر شاید پورا محلّہ جمع تھا۔۔۔۔ ایلیشا کی آنکھوں میں جنگلی بلیوں جیسی چمک تھی۔۔۔۔ میں نے تیز آواز میں کہا۔ چائے جلدی ختم کرو، پھر اوپر چلیں گے" مجھے خود پر بار بار غصہ آ رہا تھا باہر پڑوسی کس قدر پریشان ہیں۔ مجھے جتنا پریشان ہونا چاہئے تھا میں نہیں

ہوں۔۔۔۔، اس کے بر خلاف راکسی ہر جگہ خطرے کی بو سونگھتا چل رہا تھا۔ وہ ہم سے زیادہ پریشان تھا اور بار بار اوپر نیچے کر رہا تھا۔۔۔۔" کبھی دروازہ جھانک کر چلا آتا۔۔۔۔ پھر سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا جاتا۔ اس کے بعد ہمارے کمرے میں واپس آ کر بے چینی سے پونچھ ہلانے لگتا۔ جیسے ہمیں سونے سے جگانے کی کوشش کر رہا ہو۔

چائے پینے کے بعد ہم اٹھے تو ایلیشا نے چہچہاہٹ کے انداز میں کہا۔۔۔"ڈیڈی میں وہ مارگریٹ آنٹی والا کوٹ پہن لوں، جسے پہن کر میں پوری انگریز لگتی ہوں"

"ہم گھر میں ہیں کسی پکنک پارٹی میں نہیں جا رہے ہیں۔" میں نے لہجہ کو بھاری بناتے ہوئے کہا "باہر دھواں اٹھ رہا ہے......"

"اوہ...... میں تو بھول ہی گئی تھی ڈیڈی، اچھا وہ جاپان والا کیمرہ لے لوں۔"

اس سے پہلے کہ میں ناراضگی یا خفگی کا اظہار کرتا باہر گولی دغنے کا دھماکہ ہوا، ہم سے پہلے راکسی تیز تیز سیڑھیاں پھلانگتا ہوا کوٹھے پر بھاگ گیا۔

سڑک سنسان ہو رہی تھی، بندوق کی نال سڑک کی طرف تانے ہم چھپ کر بیٹھ گئے۔ آس پاس کے گھروں سے ایسی کئی کھڑکیاں (ممکن ہے میرا خیال ہو) وحشت زدہ سی باہر کو جھانک رہی تھیں۔ ہمیں ایک ہی طرح سے بیٹھے بیٹھے گھنٹوں گزر گئے تھے مگر ہم کس بات کا انتظار کر رہے تھے؟ راکسی بار بار پونچھ ہلاتا ہوا اوپر سے نیچے کر رہا تھا۔ ایلیشا کچھ دیر سانس روکے بیٹھی رہی، پھر اکتا گئی تو منع کرنے کے باوجود مارگریٹ آنٹی والا کوٹ پہن کر اوپر آ گئی، اور چھت پر مزے لے لے کر ٹہلنے لگی دو تین گھنٹے جب اسی حال میں گزر گئے تو میں نے پلٹ کر بیوی سے کہا، چلو چلتے ہیں، کچھ بھی نہیں ہوا بندوق پکڑے پکڑے ہاتھ درد کر گئے۔"

شمو بھائی نے برا سا منہ بنایا۔"جب کچھ بھی نہیں ہوا، پھر کیا سنانے کے لیے آپ نے ہمیں یہاں روک رکھا ہے......"

"کیوں نہ دوسری آفیسر چوائس کھول ہی لی جائے میں دھیرے سے مسکرایا۔ اس لیے کہ جو بات اب آپ کو سنانے والا ہوں اس کے لیے...... یہ بھی ممکن ہے آپ

ماننے سے ہی انکار کریں، مگر میرے معزز دوستو، آپ بہتر جانتے ہیں، مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اسی کے ساتھ میں نے اپنے لیے ایک بڑا سا پیگ تیار کر لیا گلاس ہونٹوں سے سٹایا پھر تلخی بھرا گھونٹ معدے میں اتارتا ہوا بولا۔

"دوستو! مجھے خود بھی اس بات کی حیرانی ہے کہ بندوق چھت پر لئے کیا ہم کچھ ہونے کے انتظار میں بیٹھے تھے؟ اگر نہیں تو پھر ہمیں دکھ کس بات کا تھا؟ کہ کچھ نہیں ہوا؟ اور سچ پوچھئے تو اسی بات نے ہمیں کافی دیر تک پریشان کیا تھا۔ ایلیشا کا جوش کسی کمزور نشہ کی طرح ٹوٹ چکا تھا___ میری بیوی کا موڈ بھی بہت خراب تھا۔ اس رات ہم تینوں میں پھر جھگڑا ہوا___ جس وقت جھگڑا ہوا اس وقت بھی راکسی ہمارے کمرے میں ہی تھا اور مہذب طریقے سے اپنی پونچھ ہلا ہلا کر شاید کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔

ایلیشا بولی۔ "تم جھوٹ بولتے ہو ڈیڈی۔ کچھ بھی نہیں ہوا، میں اچھی خاصی ڈانس کی پریکٹس کر رہی تھی۔"

گو کہ میرے اپنے چہرے پر بھی کسی گلیمر کی پرت موجود تھی۔ اس پرت کو خارج کرتا ہوا میں ہونٹ چبا چبا کر اپنی صفائی دے رہا تھا اور فساد کے برے نتائج کو سفاک لفظوں کے ساتھ بیان کر رہا تھا مگر درست ہے، میں ایلیشا اور اس کی ممی دونوں کے موڈ کو بحال کرنے میں ناکام رہا غصے میں بغیر کھائے پیئے سب سونے چلے گئے میں بھی اپنے بیڈروم میں واپس آ گیا اور نہ جانے کب میری نیند لگ گئی۔ میرے معزز دوستو۔۔۔ انگریزوں کا رہن سہن قرینہ، لباس، مجھے بے انتہا پسند ہیں۔ میری کپڑوں والی الماری میں نفیس سے نفیس لباس رکھے ہیں۔ ایلیشا جب دس سال کی تھی اور میرے سر کے بال سفید ہونے لگے تھے تو سیاہ سفید بالوں کے امتزاج نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ میرے دوستوں کا بھی کہنا تھا کہ ان کی آمیزش نے میری شخصیت کو انتہائی سنجیدگی اور وقار عطا کیا ہے، میں سوٹ پہن کر، سر پر ہیٹ لگائے، ہاتھ میں اسٹک تھامے رات کے وقت معزہ یعنی اپنی بیوی کے ساتھ چہل قدمی کو نکلتا تھا۔"

پرویز کا چہرہ بدستور بوجھل تھا، مجھے یقین تھا اسے میری تمہید گراں گزر رہی تھی اور اسی لیے وہ بار بار کرسی پر پینترے بدل رہا تھا۔۔۔میں نے آفیسر چوائس کا ایک گھونٹ بھرا، پھر کہا...... "میری بات سے آپ بھی اتفاق کریں گے کہ جو ذائقہ اس شراب میں ہے، وہ کسی میں نہیں۔ کیوں شمو بھائی؟ آں۔ ناراض مت ہوئیے، میں اس رات کے قصہ پر واپس آ رہا ہوں شک اور انکار کی سرحد یہیں سے شروع ہوتی ہے اور اب کہانی بالکل ختم پر ہے میری نیند اچٹ گئی وہی دھیما اور مہذب لہجہ ...... جیسے کوئی میرے قریب کھڑا چبا چبا کر نرمی اور متانت سے لفظوں کی ادائیگی کر رہا ہو، اور ادائیگی کرنے والا اتنا پاس کھڑا ہو کہ اس کی سانسیں بھی گننے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہو ......وہی نرم ملائم اور مہذب انداز گفتگو۔"

سنئے اب یہاں آپ کو، یا سب کو میری ضرورت ہی کیا ہے وفاداری اور غلامی کی آپ کی نظروں میں قیمت ہی کیا رہی؟ ناراض مت ہوئیے۔ غور کیجئے، آپ ہم میں سے سب کچھ لے چکے ہیں۔ ہماری حیوانیت، درندگی، جبلت۔ نہیں اس میں افسوس کرنے جیسی کوئی بات نہیں ہے محترم۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجئے، لیکن اتنا یاد رکھیے گا، اپنی وفاداری اور غلامی، میں نے ٹھیک طرح سے نبھائی، کیوں ٹھیک ہے نا؟ تو جاتے جاتے آپ سے تھوڑی سی انسانیت مانگ رہا ہوں۔ اگر آپ کے اندر بچ گئی ہے تو ...... نہیں؟ ......اچھا الوادع......"

میں جانتا تھا شمو بھائی، آپ یقین نہیں کریں گے، مگر اس وقت یہاں میری موجودگی کی حد تک، جس کا آپ کہیں تو میں ثبوت بھی دے سکتا ہوں......وہ راکسی ہی تھا، اور وہ وہی میرے مخصوص لباس میں تھا۔ سوٹ، ہیٹ، ہاتھ میں اسٹک، اس نے ہیٹ اتار کر، جھک کر مجھے سلام کیا پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا

○○

راشٹریہ سہارا (سالنامہ) آجکل (ہندی)

آئندہ (پاکستان)

یہ کسی تھکی ہوئی رات کی داستان نہیں ہے۔ (۲)

صاحبو! میرا یقین کیجئے، مرنے والا آدمی کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور وہ بھی ایسی صورت میں جب موت یوں میری آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو۔ کتے کی صورت، تو صاحبو، اسے گالی مت تصور کیجئے۔ بس یہی غلطی ہوئی مجھ سے اور میں اقرار کرتا ہوں کہ ......اس رات نہ میں نے پی رکھی تھی، نہ کسی طرح کا دوسرا کوئی نشہ کر رکھا تھا۔ اور نہ .... صاحبو! اس اقرار سے بھی اگر آپ کوئی نتیجہ نہ نکال پا رہے ہوں تو مجھے سوجوتے مار لیجیے مگر خدا کے واسطے اس کتے کو ضرور تلاش کیجیے جو پتہ نہیں کب کیسے اس اندھی تاریک رات میں، اس گلی سے ہوتا ہوا چپ چاپ میرے بدن میں اتر آیا تھا۔

یقین نہیں آیا تو میں آپ کو اس پراسرار ڈراؤنی اور تاریک رات کی اس گلی میں لے جاتا ہوں جہاں بدبو تھی یا میں تھا۔ گلی کا چوکیدار تھا اور ایک کتا جس کی سہمی سہمی آنکھیں کبھی میری طرف دیکھتیں، کبھی بند گیٹ کے باہر سنسان سڑک کو اور پھر گلے سے بھوں بھوں کی دھیمی آواز نکال کر چپی سادھ لیتیں۔

صاحبو، سچ تو یہ ہے کہ اس رات کچھ بھی نہیں ہوا تھا ــــــ بس ایک چھوٹا موٹا معمولی سا فساد ہو گیا۔ معمولی سا فساد، آپ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بالکل جائز ہے۔

یہ کیا کہ چند محلے جل گئے۔ کچھ گاڑیاں پھونک دی گئیں۔ کچھ بچے نذر آتش کر دیے گئے۔ کچھ نوجوان ہلاک کر دیے گئے۔ پھر سب کچھ معمول پر...... نہیں جناب...... یہ کیا کچھ ایڈونچر چاہیے۔ مجھے، آپ کو، پولیس کو، روزانہ اخبار پڑھنے والوں کو، اور ٹی وی دیکھنے والوں کو، جیسے کوئی بھونچال آتا ہے۔ جیسے کوئی قیامت ٹوٹتی ہے اور سچ پوچھیے تو
...... نہیں صاحبو، رنجیدہ مت ہوئیے، میں واقعات سے کاٹ نہیں رہا ہوں آپ کو......
چاہتا ہوں کہ واقعات سمجھنے سے پہلے آپ مجھ سے یوں واقف ہو جائیں، جیسے اس کتے سے جس سے آپ کو آگے چل کر واقف ہونا ہے۔ تو صاحبو، عام طور پر خواب دیکھنے والے حضرات کی طرح میں بھی خواب دیکھتا ہوں اور خواب بھی کیسا۔ خواب میں بم کے گولے پھوٹتے ہیں۔ ہلچل مچتی ہے، جتنی زیادہ ہلچل مچتی ہے، اتنی دیر تک لگتا ہے جیسے اندر سے کوئی انجانی خوشی امل رہی ہے۔ میں مشتعل ہوتا ہوں، مشتعل ہوتا ہوں اور خوش بھی ہوتا ہوں۔ اب مان لیجیے، آپ کمرے میں بیٹھے ہیں، میں بھی بیٹھا ہوں تو میری خواہش ہوتی ہے، ساری اشیاء سالم اور جامد کیوں ہیں۔ کچھ ہو۔ جیسے بھڑاک سے پنکھا گر جائے۔ بلب پھٹ جائے یا دیواریں ہلنے لگیں۔ آس پاس کے مکانات ملبے کے ڈھیر بن جائیں۔ مزدور جب اینٹیں توڑتے ہیں تو مجھے مزہ ملتا ہے۔

اچھا چلئے اب آپ کو وہ واقعہ سناتا ہوں......اس دن...... آپ سمجھ گئے ہوں گے، مجھے مشتعل ہونے کا اچھا خاصا بہانہ مل گیا ہوگا۔ اور صاحبو، تسلیاں دینے والے بہت تھے مگر صاحبو، دل کی دھڑکن اتنی تیز رفتار تھی کہ ان تسلیوں کو فریم کرا کر دل کے قید خانے میں رکھنے کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں بچی تھی۔ میں جس محلے میں ہوں، اس سے تو آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ اپنی ذات کا ایک اکیلا میں ہوں، شاید ایسے ہی موقعے کے لیے میرے احباب مجھے سمجھایا کرتے تھے کہ وہ مکان چھوڑ دو کہ ہوشیاری اسی میں ہے اور آگ لگانے والی اپنی آنکھیں بھی ایسے موقع پر بے خبری میں مُند جاتی ہیں......
تو صاحبو! فساد ہونا طے تھا یا یوں کہیے کہ جو فضا بن رہی تھی اس نے گویا صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ میاں بھاگنا ہو تو ابھی سے نو دو گیارہ ہو لو، اس لیے کہ فساد اس ملک کا

مانسون تو ہے نہیں، جس کے آنے میں شک ہو۔ پھر کیا تھا، گھر والوں کو افرا تفری میں رشتہ داروں کے یہاں بھجوا کر خود اکیلا ڈٹ گیا کہ اندر اس خوف و دہشت کی فضا میں کچھ ایسا گلیمر ضرور تھا، جو دیکھنا چاہتا تھا کہ آگے آگے کیا ہوتا ہے۔

اور اس رات ...... دو محلّہ چھوڑ کر دکھن محلّہ کے ہاشم بھائی بھاگے بھاگے گھر آئے، دروازہ کھٹکھٹایا، اپنی خشخشی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے۔

"میاں بہت ڈھیٹ ہو چکی۔ اب بھاگ بھی چلو۔ آج کی خیریت نہیں۔ کوئی جگہ ہے بھی یا نہیں۔ اپنے یہاں کی مسجد میں کافی لوگ چھپے ہیں، تم بھی نکل لو......"

میں تو نہیں، لیکں ہاشم بھائی خبر سنانے کے بعد ایسے بھاگے جیسے پیچھے کتے پڑ گئے ہوں۔ شام ہوتے ہی سڑک ایسے خاموش ہو گئی جیسے کرفیو کا اعلان ہو چکا ہو۔ آسمان کی رنگت بھی پیلی پڑ گئی تھی۔ میں سڑک پر آیا تو پانچ گھر چھوڑ کر پان والے کے پاس کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ باتوں میں فساد کی بارود کی مہک اس قدر تھی کہ میں تھکا سا کمرے میں گیا۔ ایک ایک دروازہ چیک کیا، تالا لگایا۔ پھر باہر نکل آیا۔ تب تک رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ سڑک سناٹے میں ڈوبی تھی۔ مجھے لگا، اب گھر چھوڑ دینا چاہیے۔

بس اسی خیال کے تحت میں سرپٹ دوڑ پڑا۔ ٹھیک اسی وقت سنسان سڑک پر کئی لوگ دوڑتے بھاگتے نظر آئے۔ پھر گولی چلنے کی تیز آواز ہوئی ــــــ پولیس جیپ کا سائرن بھی بج اٹھا۔ میں اور تیز دوڑا۔ سانس جیسے جسم سے اپنا ناطہ توڑ لینے پر آمادہ تھی کہ ٹھیک اسی وقت مجھے کسی نے ہاتھوں سے پکڑ کر گلی میں کھینچ لیا۔

"پاگل ہو، کہاں دوڑ رہے ہو۔ موت کو دعوت دے رہے ہو کیا۔"

میں نے گھوم کر دیکھا۔ اس آدمی کو پہچانتا تھا میں ــــ چھوٹے سے شہر میں رہنے کے زیادہ تر فائدوں میں سے ایک ہے کہ ہر چہرہ شناسا لگتا ہے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ شیو پوری کا چوکیدار ہے۔ اور یہ گلی جس میں چوکیدار نے مجھے کھینچا تھا۔ آمنے سامنے کے چار چھ گھروں کو جوڑنے والی ایک تنگ گلی تھی۔ جس سے اکثر و بیشتر گزرنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا ــــ میں جب بھی ادھر سے گزرتا، ناک بند کر کے گزرتا ــــ

کیونکہ آگے کے دو مکان کے باہری حصے کا سنڈاس اسی گلی کو کھلتا تھا اور اس کی بدبو پوری گلی میں اس قدر گونجتی تھی کہ زیادہ تر لوگ اس طرف جانے سے بھاگتے تھے۔ مگر میرا کیا تھا، آنکھیں کھولیں تو چاروں طرف بدبو کے بھبکے ہی تو تھے جنہیں سونگھتا ہوا میں بڑا ہوا تھا...... چوکیدار نے مجھے اندر کر لیا ____ پھر گیٹ چڑھا دیا ____ ٹھیک اسی وقت پولیس جیپ سائرن بجاتی ہوئی پاس سے گزر گئی۔

چوکیدار نے دھیرے سے کہا۔

"پھنس گئے۔ اب کرفیو لگ گیا ہے۔"

اس نے ایسے معنی خیز اشارہ سے میری طرف دیکھا جیسے آنکھوں آنکھوں میں میری شرافت کے سارے کپڑے جسم سے الگ کر رہا ہو کہ میاں اب بولو۔ باہر کرفیو اور یہ تنگ بدبودار گلی۔ کہاں جاؤ گے۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ ہلکے اندھیرے میں گندہ سا چیتھڑا بچھائے کوئی فقیر آرام سے ایک طرف سو رہا تھا۔ اس کے قریب میں ایک کتے کی ڈراؤنی آنکھیں چمک رہی تھیں، میں نے چوکیدار کی طرف گھوم کر دیکھا۔

چوکیدار بولا۔ وہ پارس گلی والا فقیر ہے۔ کچھ بولتا وولتا نہیں ہے۔

کتے نے ایک بار پھر دھیرے سے بھوں کیا۔ شاید کتا بھی حالات کی نزاکت سمجھ چکا تھا۔ وہ وہاں سے دھیرے دھیرے چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ پیروں سے الجھنے کی کوشش کی۔ میں نے سانس روک لی۔ یارب کتے سے زندگی میں اتنا ڈرتا آیا تھا کہ شاید بھوت پریت سے بھی اتنا ڈر نہ لگتا ہوگا۔

چوکیدار بولا۔ یہ کتا کاٹتا نہیں ہے۔ صرف سونگھتا ہے۔

"کیوں؟"

"سونگھ کر پہچان جاتا ہے کہ اپنا آدمی ہے یا نہیں۔"

میں نے پھر پوچھا۔ "کتے کو بھلا اس کی تمیز کیسے ہوتی ہے؟"

اس پر چوکیدار خاموش رہا۔ کچھ وقفہ بعد اس نے انجانے میں اپنا ڈنڈا پٹکا۔ پھر ایک دم سے چونک گیا۔ جیسے اچانک خیال آیا ہو۔ آج وہ ڈیوٹی نہیں دے سکتا۔ اور اس

تنگ گلی میں سب کے سب کسی اپرادھی کی طرح پھنس گئے ہوں...... وہ پھس پھسی سی ہنسی ہنسا۔

"کیا کہیں۔ عادت چھوٹتی نہیں نا۔"

میں چپ چاپ چلتا ہوا گیٹ تک آ گیا۔

رات دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ لوہے کا گیٹ اس وقت ہمارے لیے جیل کی آہنی سلاخوں کی طرح تھا۔ سوئے ہوئے فقیر نے منہ سے عجب سی آواز نکالی تھی۔ پھر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ کتا اب اس کے سرہانے آ گیا تھا۔ اور اپنا منہ اس کے میلے کچیلے منہ کے پاس لے جا کر کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کھڑے کھڑے پاؤں میں درد ہونے لگا تھا۔ میں نے اندھیری گلی میں ذرا آگے بڑھنے کی کوشش کی تو چوکیدار کی آواز سنائی پڑی۔

"آگے پاخانہ بہہ رہا ہے۔ اس طرف مت جائیے۔"

کیا...... مجھے اچانک ابکائی سی محسوس ہوئی۔ خوف کی شدت نے بدبو کے احساس کو اب تک مجھ سے دور رکھا تھا۔ اب مجھے شدید قسم کی بدبو محسوس ہو رہی تھی، اس قدر شدید کہ ناک پھٹ رہی تھی ...... باہر کیسے جاؤں، اور سچ یہ بھی ہے کہ رات کسی بھی طرح یہاں نہیں گزار سکتا۔ کھڑا بھی نہیں رہ سکتا۔ بچھانے کے لیے بھی پاس میں کوئی چادر نہ تھی۔ اور یوں اس طرح پینٹ شرٹ پہنے، گندی گلی میں تو لیٹنے کا سوال نہیں تھا۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہو چکی تھی۔ میں گھر سے بھاگا ہی کیوں؟ قیامت خیز ہولناک رات۔ ہم سے کچھ ہی دوری پر اندھیرے میں پاخانہ بہہ رہا تھا۔ کھلے سنڈاس سے بدبو کے بھبھکے آگ کے شعلوں کی طرح تیزی سے ہماری طرف لپک رہے تھے۔

کتا کھگھیایا، فقیر کو کھانسی اٹھی تھی۔

چوکیدار بولا۔ کرفیو رات بھر رہے گا۔ چلو سونے کی کوشش کرو۔

اس نے ڈنڈے کو سرہانے رکھا اور آرام سے ایسے لیٹ گیا کہ اچھے بھلے لوگ گھر

کے آرام دہ بستروں پر نہیں لیٹتے ہوں گے۔ اس نے ایسی بے فکری سے آنکھیں موند لیں جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ کتا فقیر کے پاس سے اٹھا۔ چوکیدار کے پاس آکر دم ہلانے لگا۔ چوکیدار نے دھیرے سے ہوں ہاں کر کے کتے کو بھگایا۔ کتا اب وہاں سے ہو کر میرے پیر کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

اُف معاذ اللہ ـــــــ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور جیسے ٹھنڈ لہر پتوار کی طرح میرے بدن کو چیرتی چلی گئی۔ وہ آنکھیں، میں جانتا ہوں، آپ یقین نہیں کریں گے اور آپ یقین کریں بھی تو کیسے جبکہ خود پہلی بار مجھے بھی یقین نہیں آیا۔ ان میں جنگلی جانوروں یا جبلت جیسی کوئی چمک نہیں تھی۔ خلاف توقع وہاں انسانی نفرت موجود تھی۔ ہاں شدید انسانی نفرت، کتے نے منہ پھیر لیا۔ اور اپنی نفرت میری آنکھوں میں اتار کر چپ چاپ آگے چلتا بنا۔

میں نے پھر سوچا۔ کیا میں یہاں لیٹ سکتا ہوں۔ نہیں۔ تو کیوں نہیں لیٹ سکتا۔ اخلاقیات کے سارے درس یہاں، اس کرفیو زدہ رات کی آغوش میں، اس تنگ بدبو دار گلی میں، چپکے چپکے سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ پیٹ میں بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا، جاتے وقت خواہش ہوئی تھی۔ کم از کم بریڈ اور سلائس ہی کھالوں ـــــ بعد میں موقع ملے نہ ملے۔ مگر بھوک ایسے موقع پر، سنسان سڑک پر پولیس جیپ کی طرح بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔

اچانک تیز بدبو کا بھبھکا اٹھا تھا۔ پچھلے دروازے سے ہوا کے جھونکے اس طرح اندر آگئے تھے، جیسے چھوٹے بچے، تھوڑے سے گیٹ سے باہر جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ نہیں مجھے سونا چاہیے، مگر کہاں...... نیند بہت ضروری ہے پیارے...... مگر۔ کتا مجھے گھور رہا تھا، اب مجھے احساس ہوا یہ بدبو کتے کے بدن سے اٹھی تھی اور میرے بدن میں منتقل ہو رہی تھی۔

کئی ماہ ہوئے، میری بیوی نے کہا تھا۔ گھر میں سب چیزیں موجود ہیں۔ صرف ...... وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ میرے سمجھنے کا انتظار کرتی رہی۔ ایک ضروری

اسٹیٹس سمبل۔ کتا۔ ایشن ہو یا پھر بھورا جھبرا معصوم سا کتا...... جیسے ...... میں نے غصے میں بیوی کو ڈانٹا۔ بکومت۔ کتے ذلیل ہوتے ہیں۔"

"انسانوں سے بھی"۔ بیوی اردو افسانہ لکھنے والے واہیات ادیبوں کی طرح جیسے فلسفے کا توپ داغنے پر آمادہ تھی۔

"ہاں!اس سے بھی زیادہ۔" میرا جواب تھا۔

مجھے لگا، کتا میری آنکھوں میں اپنے لیے نفرت کی کہانی تلاش کر رہا ہو۔

میں نے غصے میں کہا۔ کم بخت ڈرامت، میں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا اپنی بیوی سے۔

فقیر اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اور اپنے کان کھجلا رہا تھا۔ پھر ٹٹول کر دلائی میں چھپائی ہوئی روٹی اس نے نکالی۔ روٹی کا ٹکڑا توڑ کر اس نے اپنے منہ میں ڈالا۔ میں نے دیکھا۔ وہ میری طرف بھی ایسا ہی ایک چھوٹا سا ٹکڑا بڑھا رہا تھا۔

اس بار جب سنسان سڑک سے پولیس جیپ سائرن بجاتی ہوئی گزری تو میں نے حواس بحال کیے ــــــ سوچا، آواز دے کر پولیس کو پکاروں۔ بتاؤں کہ انجانے میں، میں کیسی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے یقین تھا، پولیس والے کسی محفوظ مقام پر مجھے ضرور پہنچادیں گے۔

"چوکیدار نے چلا کر کہا۔ گیٹ تک جاؤ گے تو پولیس پکڑ لے گی۔"

میری گھبراہٹ دیکھ کر اس نے بے سرے انداز میں ہنسنا شروع کر دیا۔

صاحبو، مجھے کہنے دیجیے۔ آج اور اب سے پہلے میں صرف سنتا آیا تھا کہ نیند تو کانٹوں پر بھی آجاتی ہے۔ پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ سوکھی روٹی کے ٹکڑے ڈکار کر فقیر لمبی تان کر سو گیا تھا۔ چوکیدار اب پھر سے سو گیا تھا اور خراٹے بھر رہا تھا۔ کتے نے بھی ادھر ادھر گھوم کر تھوڑی سی جگہ ہتھیالی تھی۔ نیند ضروری ہے۔ بدبو کا کیا ہے۔ بدبو تو جنم سے سونگھتا رہا ہوں۔ یہاں وہاں آس پاس چاروں طرف۔ میں نے خود

کو سمجھایااور وہیں، ایک طرف اپنے لیے جگہ بنا کر اوندھا ہو گیا۔

اور صاحبو، سچ کہتا ہوں، مانیں نہ مانیں مجھے نیند آ گئی۔ اور نیند بھی کم بخت ایسی قاتل کہ کچھ بھی یاد نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں اور کن لوگوں کے بیچ ہوں۔ کہنا چاہیے میں گھوڑے بیچ کر سویا۔ اور میری ظالم نیند اس وقت ٹوٹی جب کرفیو میں ڈھیل کا اعلان ہو چکا تھا۔ ہلکی سی آنکھیں چوندھیائیں تو میں سمجھ گیا، اب اس جگہ میں تنہا بچ گیا ہوں۔ فقیر شاید پو پھٹتے ہی کہیں نکل گیا۔ کتا بھی اپنے ساتھیوں کی تلاش میں باہر جا چکا تھا۔ چوکیدار بھی غائب تھا۔ گیٹ کھل گیا تھا، گو دھوپ ابھی نہیں نکلی تھی، لیکن ساری رات کرفیو کے بعد والا سویرا تھا، جس کے ہٹتے ہی ڈر اور خوف کو چمگادڑ کے بچے کی طرح سینے سے چمٹائے لوگ سڑکوں پر آ نکلے تھے۔ میں نے انگڑائی لے کر اٹھنا چاہا تو ایسے چونک گیا جیسے ہاتھ اچانک کسی دھار دار چیز پر پڑ گیا ہو۔ یہ بوٹ تھا اور بہر حال میں اسے خوب پہچانتا تھا۔ یہ سرکاری بوٹ تھا۔ اور جو آدمی اسے پہنے تھا وہ بغور مجھے اور میرے قیمتی لباس کو دیکھ رہا تھا۔

"چلو......"

میں نے اٹھنے کی کوشش کی، بولنا چاہا مگر، دفعتاً چونک گیا۔ میرے نرخرے سے انسان کی جگہ کتے کی آواز نکل رہی تھی۔

سرکاری آدمی ایک دم سے بوکھلا اٹھا......

"کون ہو تم؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟ اس جگہ ...... اس کی آنکھوں میں حیرت سے زیادہ زہر بھرا ہوا تھا۔ "جانتے نہیں شہر میں کرفیو لگا ہے۔"

میں...... میں اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ میں ایک شریف شہری ہوں۔ اس ملک کا ایک معزز شہری۔ میں یہاں قریب میں ہی آباد ہوں اور اچانک فساد چھڑ جانے کی وجہ سے محفوظ مقام کی تلاش میں...... مگر بد قسمتی سے میں اس جگہ پھنس گیا مگر یہ کیا——میرے نرخرے سے لگاتار کتے کے بھونکنے کی آواز نکل رہی تھی۔

"تم...... تم ہو کون؟"

سرکاری آدمی اب کچھ غصے اور شک بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں......" کتا پھر گھگھایا۔

"سب پتہ چل جائے گا بچو۔ چلو تھانے۔"

مجھے تھانے لے جا کر اس نے اپنے سے سینئر باس کو سیلوٹ مارا پھر دھیرے دھیرے کچھ پھسپھسانے لگا۔ میں نے کان لگایا تو پتہ چلا وہ میرے بارے میں ہی بول رہا تھا۔

"یس سر۔ یہی آدمی ہے۔ نہیں، سر، مجھے شک نہیں یقین ہے ـــــ اس کے کپڑے دیکھیے سر۔ شہر میں جو کچھ بھی ہوا، میرا یقین کیجیے۔ سر، یہی آدمی ہے۔ یہ آدمی مجھے مشتبہ حالت میں اس جگہ ملا۔ نہیں سر، میرا منہ مت کھلوایئے۔ اب میں کیا بتاؤں۔ نہیں سر ـــــ میں ٹھیک بتا نہیں سکتا۔ نہیں۔ آپ سننا ہی چاہتے ہیں۔ سر تو سنیے۔ وہاں سنڈاس کھلے ہوئے تھے اور پکلے پاخانے کی دھار بہہ رہی تھی۔ اور یہ آدمی ایسی بے فکری کی نیند سویا تھا کہ ......ذرا ملاحظہ فرمایئے سر یہ آدمی......اس کا حلیہ ......اس کا لباس......اس کی آواز......ہاں تو جی......اب تم بتاؤ۔ کون ہو تم؟ دیکھو سیدھے سیدھے سچ سچ بتادو۔"

اب وہ میری طرف غضب ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے منہ کھولا۔ اور کیا بتاؤں...... مجھے خوشی سے زیادہ حیرت اور حیرت سے زیادہ خوشی ہوئی کہ میں، اپنی ہی آواز میں ہمکلام تھا۔

"میں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

آفیسر نے چونک کر اپنے جونیئر کو دیکھا......

"تم تو کہتے تھے کہ یہ......"

"یس سر۔ میں سو فیصد سچ کہتا ہوں"

"اگر یہ سچ ہے تو اب...... یعنی تم بھی دیکھ رہے ہو......"

"میں ایک شریف آدمی ہوں سر، اور یہ مجھ پر تہمت ہے، الزام ہے۔"

سینئر کے لہجے میں غصہ تھا...... "شٹ اپ یہ تو عام انسانوں کی طرح باتیں کر رہا ہے"

جونیئر نے ایک زور کا چانٹا میرے گال پر لگایا کہ اس وقت اسے میرے منہ سے کتے والی آواز کی زیادہ ضرورت تھی۔ مجھے غصہ آیا۔ میں نے زندگی میں کبھی اس طرح کی بے عزتی برداشت نہیں کی تھی۔ میں نے دیکھا، جونیئر سینئر دھیرے دھیرے آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے...... میں نے انہیں اپنی طرف سے مطمئن کرنے کے لیے دوبارہ الفاظ جوڑے۔ مگر یہ کیا۔ وہ نرخرے سے نکلتی ہوئی کتے کی آواز۔

جونیئر خوفزدہ ہو کر بولا۔ دیکھیے سر...... دیکھا، نا......

سینئر کی نظریں میرے چہرے پر گڑی تھیں۔

"میں...... میں ٹھیک ہوں سر" مجھے خود تعجب تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

"لو، اب تو یہ پھر آدمی کی طرح بولنے لگا"

"مگر یہ پہلے کتے کی طرح بولا تھا اور آپ نے بھی آواز سنی تھی" جونیئر زور دے کر بولا۔

"ہاں سنی تو تھی مگر اب......"

جونیئر، سینئر کے کان میں دھیرے سے پھسپھسایا۔ نہیں سر، آپ غور کیجیے، غور کیجیے۔ میں کہہ رہا ہوں نا، یہ جو ہو رہا ہے اس وقت پورے ملک میں۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیجیے سر۔ ہنڈریڈ پرسنٹ سر، مجھے یقین ہے۔ اور کیا صرف دو ہاتھ دو پیر کا ہونا ہی انسان ہونا ہوتا ہے۔ یس سر، وہاں وہ پرانے زمانے کا سنڈاس...... اور آپ نہیں جانتے سر۔ وہ جو ہو رہا ہے...... پورے ملک میں...... یہ آدمی ہے سر۔"

وہ جو بھی کہنا چاہتا ہو مگر اس کے لیے شاید اس کے پاس موزوں الفاظ نہیں تھے۔ غصے میں وہ اپنے بال نوچ رہا تھا۔ اس نے پھر سر سہلایا۔ "تو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ سارے فساد کے پیچھے بس اس کتے کا۔ نہیں سر، میرا اعتراض یہی ہے۔ آپ اسے انسان کیوں کہتے ہیں۔ ایک کتے کو انسان۔ جو میں اب آپ کو سنانے جا رہا ہوں......"

جس وقت جونیئر سینئر افسر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ساڑھے سات بجے کا

وقت ہوگا، دھوپ آسمانوں کو چھیدتی ہوئی کمرے میں گھس آئی تھی۔ ٹھیک اسی وقت ایک کانسٹبل ایک پٹے والے کتے کو جو کہ زنجیر سے بندھا تھا۔ کھینچتا ہوا اندر لے کر چلا آیا۔

اس سے پہلے کہ ہم کچھ سمجھ پاتے، کانسٹبل چلا کر بولا۔ سر، چمتکار ہو گیا۔ انہونی ہو گی۔

سینئر غصے میں دہاڑا۔ ''بکو کیا بکنا چاہتے ہو۔''

''سر۔ اس کتے کی آواز سنیے۔ جی ہاں سر۔ غور سے سنیے۔''

اور...... بالکل سچ کہتا ہوں صاحبو، وہ کتا انسانی آواز میں بول رہا تھا۔

''شرافت کا زمانہ نہیں رہا۔ سراسر ظلم ہے، زیادتی ہے۔ آپ لوگ کسی بھی شریف کتے کو پکڑ کر اندر بند کر لیتے ہیں۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔''

کتا بڑبڑا رہا تھا۔ سینئر کی آنکھیں پھیل گئی تھیں ـــــ جونیئر پر غشی طاری تھی۔ اور تب سینئر نے دھیرے سے جونیئر کے کندھے تھپتھپائے۔ بولا ـــــ

''سنو...... غور سے سنو۔ ایسا ہوتا ہے..... ایک خاص مدت میں...... جب ہم ارتقا پذیر ہوتے ہیں...... سمجھ رہے ہو نا...... ارتقا پذیر...... تنزلی کے راستے بھی یہیں سے پھوٹتے ہیں، سمجھ رہے ہو نا...... یعنی اگر کچھ بدل جائے۔ ہم تم ہو جائیں۔ تم ہم...... فیشن سے لے کر اخلاقیات...... یعنی کتا انسان ہو جائے اور انسان..... ایک خاص وقت میں...... یعنی یہ ارتقاء کا بہت معمولی سا دستور ہے...... تم سمجھ رہے ہو نا...... دراصل زمین اپنے مرکز سے ہٹ رہی ہے۔ نیا پرانا ہو رہا ہے۔ یعنی...... میں جو کہہ رہا ہوں...... تم سمجھ......''

سینئر ٹھہر ٹھہر کر سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر صاحبو، جو بات اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، وہ ناقابل یقین ہے۔ سینئر بول ضرور رہا تھا مگر۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ بولنے کی کوشش ضرور کر رہا تھا مگر اس کے نرخرے سے مستقل کتوں جیسی آواز نکل رہی تھی اور سب چونک کر حیرت سے اسے دیکھے جا رہے تھے۔

○○

دستک ۱۹۹۶ء

اقبالیہ بیان

(ایک غیر ضروری کردار کے بہانے)

سب انسپکٹر پھٹک چند کو یہ پوری دنیا ہی غلط نظر آتی تھی۔ وہ ہر بات کو اس طرح غلط انداز سے دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا کہ اپنے بچوں تک پر شک کر بیٹھتا اور نتیجتاً ان بچوں کی اماں کو پھٹک چند کے سامنے قصوروار بننا پڑتا...... "کہ یہ اپنے ماتھے کا تل دیکھو اور یہ بچے کے پاؤں کا تل۔ ذرا غور سے دیکھو۔ دونوں کتنے مشابہہ ہیں......اور اب بھی تم شک کرتے ہو کہ یہ تمہارے بچے نہیں ہیں۔"

"مگر کم بخت شکلیں اتنی جدا جدا کیوں ہیں؟" پھٹک چند مونچھوں پر تاؤ دیتا۔

پتنی، پتی کے انسپکٹرانہ مزاج سے واقف ہوتی۔ اس کے نرم پڑتے ہی شروع ہو جاتی...... لو اب اس کے بارے میں مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ شکلیں بنانا تو بھگوان جانے، مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ بڑے ہوں تو مونچھیں بالکل آپ جیسی ہوں گی۔ بڑی بڑی اور کڑی کڑی۔"

پھٹک چند کی باچھیں کھل جاتیں۔ وہ کچھ زیادہ ہی قوت اور فخر سے مونچھیں اینٹھنے لگتا۔ یہاں تک کہ دیکھنے والوں کی نظریں درد کر جاتیں۔

ایسا نہیں ہے کہ پھنک چند ہمیشہ سے غلط دیکھنے کا عادی رہا ہے مگر ایک تو اس کی بلوان بدھی اور اس پر سے سب انسپکٹری کا نشہ۔ دن رات چور، اچکے، ڈاکوؤں کی صحبت میں اس کی مت بھی چوپٹ ہو گئی تھی۔ پھنک چند کا خیال تھا کہ یہ پولیس کی ذات ہے جس نے دنیا کو سدھار کر رکھا ہوا ہے۔ ورنہ اگر پولیس نہ ہوتی تو سارے ہی چور اچکے ڈاکو ہوتے۔ پھنک چند کو پولیس کے ڈنڈے پر اتنا فخر تھا کہ جب اس کا پرموشن حولدار سے سب انسپکٹر کے لیے ہوا تو بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لو، اب یہ خاص الخاص ڈنڈا ہاتھ سے گیا۔ حوالداری میں تو یہ ڈنڈا ہر وقت کا ساتھی تھا۔ سب انسپکٹری میں ڈنڈے کا ایسا ساتھ کہاں۔ وہ تو پرموشن اور پیسہ بڑھنے کا چکر نہ ہوتا تو کبھی وہ اس ڈنڈے کو ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ اور سب انسپکٹری کا عہدہ قبول ہی نہ کرتا مگر......

دنیاداری ہو یا، پولیٹکس، پھنک چند کے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہوتا۔ تھانہ کلائیں چک کے، اس کے ساتھی بھی اس کے جنرل نالج سے خاصا رعب کھاتے تھے۔ خاص کر اس وقت جب وہ دیش کی پالیٹکس کے بارے میں چیخ چیخ کر گفتگو کر رہا ہوتا......

"سب سالے آتنک وادی ہو گئے ہیں۔ سالے اندر سے ہی آتنک وادی تھے تبھی تو انگریز آگئے۔ دیش کو غلام بنادیا۔ پھر سالی آزادی ملی بھی تو کیا، وہی آتنک وادی بھتری چھری سے دیش کو لہولہان کیے جا رہے ہیں......"

پھنک اپنے خیال سے مطمئن ہو کر مونچھوں کو تاؤ دیتا اور سوچتا۔ پولیس نہ ہوتی تو دیش کہاں جاتا — نرک میں......اور کیا......؟"

پھنک چند اپنی نوکری سے مطمئن تھا۔ وہ پولیس کی نوکری کو اس قدر باوقار مانتا تھا کہ دوسری تمام نوکریوں پر پولیس کی نوکری کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کے اختیار اور دائرے میں اگر کوئی اونچ نیچ ہو بھی جاتی تو وہ اسے صحیح گردانتا تھا۔ تھپڑ، مار پیٹ، گالی گلوج، رشوت......وہ ان سب چیزوں کو قانون اور پولیس یا رعاب، کا ایک حصہ مانتا تھا۔ اس کا کہنا

تھا۔ سالے، آتنک وادی۔ سمجھانے پر نہیں سمجھیں تو ہم کیا کریں۔ ان کا برا حشر کر کے دیکھو۔ تب دیکھو کیسے باپ کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ چھوڑا اس لیے دیتا ہوں کہ سالوں پر رحم آتا ہے۔ پیسہ اس لیے لیتا ہوں کہ سالوں کو چھوڑتے ہوئے گھرنا ہوتی ہے...... سالوں نے دیش کو چوپٹ کر رکھا ہے۔"

پھنک چند یوں تو اپنی بیوی پر ہر بات میں بھاری پڑتا تھا مگر رات میں، سونے کا لمحہ واحد لمحہ ہوتا جب اس کے پسینے نکل آتے تھے۔ یوں جیل کی کال کوٹھریوں میں بڑی بڑی مار سے قیدیوں کی موت نکلتے دیکھ کر اس کے ماتھے پر پسینے نہیں چوتے تھے مگر ادھر کچھ برسوں سے وہ خود کو جسمانی کمزوری کا شکار محسوس کر رہا تھا۔ گو کہ اس معاملے میں اس نے ساتھی سب انسپکٹر رتن لال اور دیگر معقول لوگوں سے مشورہ لینے، اور صلاح قبول کرنے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہ کی۔ مگر رات کا مسئلہ دیوار پر رینگتی چھپکلی کی طرح اس کے وجود میں سرسراہٹ سی مچادیتا۔ اندھیرے میں بتی گل ہوتے ہی جب کپڑوں کی سرسراہٹ اور سانسوں کی زیر و بم اس کے کانوں میں پڑتی تو پھنک چند کی دھڑکنیں تیز تیز چلنی شروع ہو جاتیں۔ دھرم پتنی کی حرکات سکنات پر رات کے اندھیرے میں اس کی آنکھیں جیسے کان بن جاتیں...... دھڑکتے دل کے ساتھ وہ کمزور لمحے کے داؤں پیچ میں خود کو اتنا شکست خوردہ محسوس کرتا کہ اس کی آواز تک بند ہو جاتی اور سارا پولسیا رعوب ہوا جاتا...... وہ کسی کیڑے جیسا خوف کھاتا اور بچے جیسا گھبراتا۔ دھرم پتنی جب اپنے ادھیڑ پن کی بجھ رہی آگ کو سنبھالتے ہوئے اس کے سامنے کسی تنگی کمان کی طرح تن جاتی تو اس کی سانس غبارے کی طرح پھول رہی ہوتی...... یہ وہ لمحہ ہوتا جب اس کی پتنی اپنے پھولے ابھرے پیٹ اور زچگی کے عمل سے گزرنے والی متعدد لکیروں پر ہاتھ پھراتے ہوئے لیمپ جلالیتی۔ کیچوے کی طرح

پھدک کر، اپنے ڈھکے سینے کو روشنی میں جگا کر، پھٹک کی پھول رہی سانسوں میں اپنی سانسیں رکھ دیتی...... نسوں میں ہیجان دوڑ جاتا، اور برداشت نہیں ہوتا تو بے حیا لفظوں کی اگنی میں بھی کود پڑتی۔

"یہ کیا ہو جاتا ہے۔ نامرد تو نہیں ہو گئے!"

پھٹک چیختے چیختے ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے رہ جاتا ــــــــــ

"ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے۔ یا کوئی اور بات ہے ــــــــــ؟"

پھٹک کو، ہونٹوں کا لعاب سوکھتا محسوس ہوتا۔ 'اور بات مطلب؟'

"پولیس والے ہو۔ تم پولیس والوں کا ایمان دھرم کیا۔ روج ہی گلچھڑے اڑا کر آتے ہو گے؟"

پھٹک کو اس جملے پر اپنی مردانگی دوبارہ ملتی ہوئی محسوس ہوتی۔ پھولی ہوئی سانس کے زیر و بم میں کمی آتی۔ مسکراتا، جھڑکتا...... تو تمہیں کیا۔؟

"وہ بھی تو جاتا ہے۔ تمہارا دوست، رتن لال۔ کوٹھے پر......؟"

"سب جاتے ہیں۔ ایک رتن لال ہی کیوں؟"

"اچھی نوکری ہے۔ ایک پتنی سے دل نہیں بھرتا۔"

"کسی کا نہیں بھرتا۔ سب کرتے ہیں ایسا۔ اب زیادہ بک بک مت کر۔ سو جا۔ ورنہ اتنی زور کا تھپڑ دوں گا کہ زندگی بھر کو چندلی ہو جائے گی۔"

اس بار بیوی کچھ نہیں بولتی۔ گنجے ہو جانے کے ڈر سے یا پھٹک سے مار کھانے کے خوف سے دبک کر، بھیگی بلّی بن کر اپنے پگھلتے ساون کو سنبھالے سو جاتی۔ پھٹک دیر تک جاگتا رہا۔ ٹانگوں، اور ٹانگوں کے درمیانی حصے میں اس کے ہاتھ دیر تک رینگتے رہے۔ چھپکلی کی کٹی، بے حس و حرکت ہو گئی دم کی طرح اب وہاں کوئی حرکت نہیں تھی۔ پھٹک کو ایسے کئی قصے معلوم تھے، جو اس کے دوست احباب پولیس والوں کی نوکری سے

متعلق سناتے آئے تھے۔ جیسے یہ، کہ آخری وقت میں یہ سالے نامرد ہو جاتے ہیں۔ سب بھگوان کراتا ہے۔ پولیس والوں کا آخری وقت بہت دکھ میں بیتتا ہے۔ اور ثبوت کے طور پر آس پاس کی کتنی ہی مثالیں گنا دی جاتیں۔ گو شروع میں پھٹک ان باتوں کو نہیں مانتا تھا مگر اب ادھر چند برسوں سے اپنی جسمانی طاقت کو دیکھتے ہوئے وہ تھوڑا تھوڑا ڈرنے ضرور لگا تھا۔

پھٹک چند پولیس کے ہر کرم کو جائز مانتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ پولیس جو بھی کرتی ہے۔ ٹھیک ہی کرتی ہے۔ اور اسے سب کچھ کرنے کا ادھیکار بھی ہے۔ پھٹک چند کی جیب ہمیشہ پھولی رہتی تھی اور وہ اپنی پھولی جیب سے بڑے بڑے افسران کو بھی خوش رکھتا تھا۔ اسی لیے اس کی پہنچ بڑے بڑے افسران تک تھی۔ یہاں تک کہ بھوانی سنگھ، سپرنٹنڈنٹ آف پولیس بھی اس سے کچھ زیادہ ہی خوش رہتے تھے۔ خوش رہنے کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ پھٹک ان کے چھوٹے بڑے گھریلو کام بھی خوش دلی سے قبول کر لیا کرتا تھا اور ان کے لیے چھوٹے موٹے پیسوں کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ بھوانی سنگھ اپنی سخت گیری کے لیے محکمے میں مشہور تھے اور پولیس کی ناک سمجھے جاتے تھے ان کے چنگل میں آکر بڑا سے بڑا بد معاش بھی پانی مانگتا تھا۔ ملزموں کو ٹارچر کرنے۔ سچ اگلوانے اور اقبالیہ بیان حاصل کرنے میں بھوانی سنگھ کا جواب نہیں تھا۔ ملزم کی آدھی ہوا تو ان کی لمبی تگڑی شخصیت اور چہرے پر چھائے جلال کو دیکھتے ہی نکل جاتی......ہاں، کتنے ہی موقعوں پر یہ ناک کٹتے کٹتے بھی بچی تھی۔ اور بھوانی سنگھ کی مردانگی نے اس ناک کو دوبارہ بحال کیا تھا۔ کبھی کبھی کسی ملزم کو پکڑنے میں پھٹک چند سے بھول چوک ہو جاتی تو بھوانی سنگھ اسے تعزیرات، دفعہ، قانونی ہتھکنڈے اور وردی کی طاقت کے بارے میں چھوٹی چھوٹی باریکیاں سمجھایا کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھٹک قانونی امور کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی ہوشیار ہو گیا۔ اب جب سے ناڈا کا معاملہ شروع ہوا تھا، پھٹک کے لیے

اور آسانی ہو گئی تھی۔ وہ بلا روک ٹوک کسی پر بھی کوئی دفعہ آزمالیتا اور حراست میں لے لیتا۔ یا حراست کی دھمکی دے کر چھوٹی موٹی رقمیں اینٹھ لیتا۔ آرمس ایکٹ اور دسویں ایکٹ کی وضاحت و وکالت وہ اس طرح کرتا کہ حراست میں لیا گیا آدمی گھبرا جاتا اور اس سے جو بھی بن پڑتا، پھٹک کو دے کر اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا۔

پہلی پہلی بار جب ٹاڈا کی ہوا چلی تو اسے پتہ بھی نہیں تھا کہ ٹاڈا ہے کیا بلا۔ لیکن اسے اتنا ضرور معلوم چل گیا تھا کہ ٹاڈا آجانے کی وجہ سے اس کی حیثیت پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہو گئی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا صوبہ ان بیس صوبوں میں سے ایک ہے جہاں ٹاڈا کی ناؤ تیر سکتی ہے۔ اور پھٹک تو اس ناؤ کو بہانے بلکہ اڑانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

شروع شروع میں جب ٹاڈا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تو وہ بھوانی بابو سے ملا۔

''پھٹک تو بہت بھولا بھالا ہے، بھوانی بابو ہنسے......اب ایسے سمجھ لو جو گیند تیرے ہاتھ میں تھی وہ اب تیری جیب میں آگئی ہے۔''

''ہاں، آگئی ہے سر۔ مگر میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا۔''

بھوانی سنگھ نے ٹھہاکا لگایا۔ ''گدھے کے بچے......رہے گا زندگی بھر سب انسپکٹر کا سب انسپکٹر۔ کچھ کام کر کے دکھا۔ یہی موقع ہے۔ اوپر سے بھی حکم آیا ہے۔ ٹاڈا کے تحت زیادہ سے زیادہ لوگوں کو حراست میں لینا ہے۔''

پھٹک کے چہرے پر چمک لہرائی۔ ذرا کھل کر بتایئے سر۔

''اب ایسے سمجھو کہ قانون تمہارے ہاتھ میں ہے۔ کوئی آدمی تمہاری مرضی کے خلاف کام کرے تو تم ٹاڈا میں اسے حوالات میں بند کرا سکتے ہو۔ کوئی تمہارا 'ٹھینگا' بھی نہیں بگاڑ سکتا۔''

''وہ کیسے سر؟''

''ٹاڈا کی خصوصی عدالت میں ملزم سے لیے گئے اقبالیہ بیان کو ہی بطور ثبوت تسلیم کیا جائے گا۔''

''پھٹنک کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ مطلب، اس کا کیا مطلب ہوا سر؟''

بھوانی پھر بے مطلب ہنسے۔ ''اپنی من مانی اور آسان ڈھنگ سے کر سکتے ہو پھٹنک۔ کسی کو بھی میرے جیسے سینئر پولیس افسر کے سامنے لے آؤ۔ ٹھکائی کر دو۔ پٹائی کر دو۔ سادہ کاغذ پر انگوٹھا لگوا دو۔ گواہ کی پہچان بھی ٹاڈا کے معاملے میں پوشیدہ رہے گی۔ یہ دونوں ہی شقیں ہمارے لئے خطرناک اوزار ہیں۔ کیوں پھٹنک؟''

اس کے بعد بھوانی بابو نے اٹھ کر دو پیگ تیار کیے۔ ایک اپنے لیے، ایک پھٹنک کے لیے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے پھٹنک کے پاس آ کر ٹھہرے۔۔۔ لو پیو۔

'نہیں سر'

''پیو''۔۔۔ بھوانی سنگھ اس بار گرج کر بولے۔ ''پیو اس لیے پیو کہ تم چغد آدمی ہو۔ ابھی کمائی کا وقت ہے اور تم ہو کہ ٹاڈا کے بارے میں سوال پوچھ رہے ہو۔ جاؤ جا کر دوسرے تھانوں میں دیکھو۔''

''جی سر''

''اور سنو۔ آتنک واد سے نپٹنے کے لیے ہی پولیس پرشاسن کو قانون کا یہ ہتھیار دیا گیا ہے۔ اس کا استعمال کرو۔ دھر پکڑ کرو۔ گرفتاری کرو۔ تھانہ بھرو۔ اور سنو۔ ۷ ار تاریخ کو رتھ یاترا اکلائیں چک سے گزرنے والی ہے۔ زیادہ خطرہ کچھی ٹولہ امام باڑہ سے ہے۔ سمجھ رہے ہو نا...... ہر حالت میں...... پیو...... شرماؤ مت...... کتے کی برادری میں سب چلتا ہے۔ کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا......

کچھی ٹولہ کا امام باڑہ...... سانولے چہرے والی صبیحہ اور وہ رشید حرامزادہ......

پل میں پھٹنک کے چہرے پر تیزی سے کتنی ہی پرچھائیاں گزر گئیں۔ چڑیا کی طرح

پھدک پھدک کر چلنے والی صبیحہ یاد آگئی۔ان دنوں کے ہر ایک لمحے پر جس کی دسترس تھی۔ جس کے چہرے کے نقوش ہر وقت آنکھوں میں تیرتے رہتے تھے۔اور پھنک کبھی کبھی یہ بھی سوچتا تھا کہ وہ رشید کی طرح مسلمان کیوں نہیں ہے۔کاپیوں پر اس کا نام لکھنا،اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھنٹوں امام باڑہ کے پاس، چائے کی دکان پر بیٹھے رہنا،امام باڑہ میں ہلچل محرم کے دنوں میں شروع ہوتی تھی۔ کچھی ٹولہ کا امام باڑہ دراصل مسلمانوں کا محلّہ تھااور اس محلے کے تعزیہ کی بہت دھوم تھی۔رشید اور صبیحہ اسی محلے کے تھے اور کالج کے دنوں میں پھنک کے ساتھی تھے۔ہاں وہ بات تو پھنک کو اس دن پتہ چلی جب......

ڈماڈم......ڈماڈم......ڈماڈم......تا......تا......نہ......نہ

امام باڑے پر ہلچل تھی۔ نیاز فاتحہ ہو رہا تھا۔ایک طرف محلے کے چھوکڑے، بچے ہَر ......رے رے اور یا علی، حسن حسین چیختے چلاتے آپس میں لکڑی بھالا کھیل رہے تھے۔ کچھ بڑے جوان لڑکے انہیں ہٹاتے ہوئے گھیرا بنا رہے تھے۔امام باڑہ کچھی ٹولہ کا خلیفہ گلے میں موٹا سا پھولوں کا ہار ڈالے اپنی حد درجہ مصروفیت دکھاتا ہوا ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ نگاڑہ بج رہا تھا......ڈھول ڈرم پیٹے جا رہے تھے۔ سروں پر دوپٹہ ڈالے عورتیں لڑکیاں ایک طرف بھیڑ کی صورت، ہنستی مسکراتی اس جم غفیر کو تک رہی تھیں۔امام باڑہ کے ایک طرف لئی گوند اور رنگ برنگی چمکیاں لیے محلے کے لڑکے جالیاں جھالریں بناتے اور اسے تعزیہ میں سجانے کی تیاری کر رہے تھے۔ نگاڑے کی آواز پر گھیرے میں کھڑے لڑکوں نے ڈنڈا بھانجنا شروع کر دیا تھا۔

ڈماڈم......ڈماڈم......ڈماڈم......تا......تا......نہ......نہ......

لیکن پھنک تو کچھ اور ہی دیکھ رہا تھا۔ نیاز والی رکابی لیے صبیحہ ،امام باڑے کے ایک طرف جانماز بچھائے، سر پر رومال رکھ کر فاتحہ کرتے ہوئے رشید کو کچھ زیادہ ہی

انہماک سے دیکھ رہی تھی ـــــ چلتے...... چلتے زمین ٹھہر گئی، آسمان خاموش ہو گیا......
نگاڑے رک گئے......وقت کی ہلچل میں سکوت چھا گیا۔

پھنک کے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہا تھا......

صبیحہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی......فاتحہ کر دیجئے۔

رشید نے نظر اٹھائی۔ مسکرا کر صبیحہ کو دیکھا اور رکابی کا کپڑا اٹھا کر پھونک دیا۔

محرم کا نگاڑہ بج رہا تھا......ڈماڈم......ڈماڈم......تا......تا......نہ......نہ......

وہ رات آنکھوں میں گزر گئی۔ شدید بے چینی میں کروٹیں بدلتے ہوئے۔ صبح ہوتے ہی وہ ہنومان جی کے مندر نکل گیا۔ پرارتھنا کیا، تلک لگایا، پرساد کھایا۔ من میں اندھڑ چل رہے تھے۔ دو چار دن ایک دوسرے کو، آنکھوں آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گزر گئے......ایک دن کالج میں گوشۂ تنہائی میں اس نے صبیحہ کا راستہ روک لیا۔ اس کے الفاظ سانسوں کی ہلچل میں کھو گئے تھے ـــــ صبیحہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ویسی ہی، جیسے محرم کے دن نیاز والی رکابی لیے اس کے ہونٹوں پر تھی۔

'کیا ہے؟'

ادھر ادھر کی بات کے بعد اس نے دھڑاک سے پوچھ لیا۔ 'مجھ سے شادی کرو گی؟'

'نہیں۔' مسکراہٹ میں شرارت سمٹ آئی تھی۔

'کیوں؟'

''کیونکہ ابا نہیں چاہیں گے۔ تم ہندو ہو۔'' وہ خطرناک مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہی تھی اور وہ مسکراہٹ کی دھار سے کٹا جا رہا تھا۔

'بس اتنی سی بات پر۔'

'ہاں۔ ابا بہت سخت ہیں ہمارے ـــــ وہ تو لڑکیوں کی پڑھائی کے بھی خلاف تھے۔ لیکن تم مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو؟'

وہی مسکراہٹ اور محرم کے نگاڑہ کی آواز......ڈماڈم......ڈماڈم......تا......نہ...نہ

پھنک کو لگا، وہ بے جان ہو گیا ہے......اس کی حیثیت اس کچرے جیسی ہے جسے سمندر کی لہروں نے ساحل پر اچھال دیا ہے۔ وہ اس کے چہرے کو تکے جا رہا تھا جو بے حد ملائم، خوشنما اور تازگی لیے ہوا تھا۔

'اگر مان لو میں مسلمان ہوتا تو......؟

'تب تم اپنے ابا سے میرے یہاں رشتہ بھجواتے۔'

'رشتہ بھجواتا۔۔۔تب؟'

'تب۔ تب میں ہاں کر دیتی۔'

صبیحہ چڑیے کی طرح پھدکی۔ پھر ٹھہری نہیں۔ حیا جیسی کوئی سرخی اس کے چہرے پر دمک آئی تھی۔ اس کے بعد وہ رکی نہیں، قلانچیں بھرتی تیزی سے دوڑی...... پھر ٹھہری۔ شرمائی۔ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اور پھنک اب اس کے دل میں۔ اس جگہ پر جہاں دھڑکن کے گیت گونجتے تھے، محرم کے نگاڑے بج رہے تھے......ڈما......ڈم......

'تب میں ہاں کر دیتی......' ساری رات صبیحہ کا یہ جملہ اس کے کانوں میں بجتا رہا۔ اس کا شرمانا، رکنا، پلٹ کر دیکھنا اور اپنی اداؤں کی سنہری دوڑ میں اسے کس لینا۔ ساری رات وہ انوکھے خمار میں ڈوبا رہا۔ جیسے وہ دن......وہ لمحہ......وہ رات...... سب کچھ اس کی زندگی کی کتاب میں کسی روشن روزن سے داخل ہو گیا تھا۔

دوسرے دن کالج میں پتہ چلا، رشید اور اس کے یار دوست اسے چاروں طرف پوچھتے چل رہے تھے۔ وہ اس کے محلے بھی گئے تھے۔ گھر جا کر بھی اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ اسے پتہ چلا، کل رشید کے کسی دوست نے اسے صبیحہ کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ رشید اسے کالج کینٹین میں مل گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، رشید اور اس کے

ساتھیوں نے چائے کے گلاس ہوا میں اچھالے اور آناً فاناً ان کے ہاتھوں میں ہاکی کی اسٹک ناچنے لگی۔ معاملہ سمجھتے ہی اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ پھر اسے کچھ پتہ نہیں۔ کچھ خبر نہیں۔

وقت گزرا۔ اندر کہیں محرم کے نگاڑہ کی آواز بجی رہ گئی تھی......ڈماڈم......ڈماڈم ......تا......نہ......

جیسے جیسے رتھ یاترا پہنچنے کا دن قریب آرہا تھا، پھنک کی ذمہ داریاں بڑھتی جارہی تھیں۔ شہر میں تناؤ بڑھ گیا تھا۔ خاص کر مسلم اکثریتی علاقوں میں۔ تناؤ سے بچنے کے لیے جلوس نکالنے، سبھائیں کرنے، مجمع اکٹھا کرنے اور مذہبی عبادت گاہوں سے ہونے والی تقریروں پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔ پھنک کو خبر ملی تھی، امام باڑہ کے پاس ایک جتھا یاترا کو روکنے اور بھنگ کرنے کی سازش رچ رہا ہے۔ اور اس جتھے کی نمائندگی کرنے والوں میں جو چند ناموں کی فہرست اس کے پاس تھی......اس میں ایک نام تھا ......رشید انصاری۔

ذہن کی نازک سطح پر پھر محرم کا نگاڑہ بج اٹھا......ڈماڈم......ڈم......تا......نہ......

پھر پھنک نے دیر نہیں کی۔ کسی ذمہ دار افسر کی طرح اس نے امام باڑہ کے پاس جیپ روکی۔۔۔۔ چاروں طرف ناکہ بندی کی گئی۔ اریسٹنگ ہوئی۔ کمانی چائے والے اور تھوتھا کباب والے کی دکان سے چار پانچ ملا ٹائپ لوگوں کو پولیس نے دھر دبوچا۔ ان میں مؤذن بھی تھے، امام بھی۔ ان سب کو ٹاڈا کے تحت حراست میں لے لیا گیا۔

امام باڑہ میں سناٹا چھا گیا۔

پھنک نے رشید انصاری کے بارے میں پتہ کیا۔ ایک چائے والے نے آگے گلی میں ایک مکان کی طرف اشارہ کردیا۔ گلی اتنی پتلی تھی کہ جیپ کے اندر جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

پھنک نے سپاہیوں کو باہر ہی روکا۔ پھر وہ خود ہی مکان کی طرف بڑھ گیا۔ یہ ایک منزلہ ٹوٹا پھوٹا سا مکان تھا۔ مکان کی سفیدی جھڑ چکی تھی۔ پلاسٹر بھی ادھڑ چکا تھا۔

دروازے والی سیڑھی ٹوٹی ہوئی تھی اور اس جگہ موٹی موٹی چار پانچ اینٹیں رکھ کر سیڑھی کی جگہ بنائی گئی تھی۔ جس وقت پھٹک گلی میں داخل ہوا، آس پاس کی کھڑکیاں دروازے کھل گئے۔ آنکھیں خوفزدہ تھیں اور پولیس کے قدم کو رشید کے مکان کی طرف بڑھتا دیکھ رہی تھیں......

پھٹک اینٹے والی سیڑھی پر ہمت کر کے چڑھا۔ پھر دروازہ پیٹنا شروع کیا۔

اندر سے آواز آئی "......کون"

'پولیس۔، پھٹک نے جواب دیا۔

فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک معمر بوڑھا آدمی تھا۔ اس نے میلی سی بنیان اور چار خانے کی لنگی پہن رکھی تھی۔ سر پر ایک گندی میلی سی ٹوپی چپکی تھی۔ پھٹک کی وردی کو دیکھتے ہی وہ آدمی سہم گیا۔

'رشید کہاں ہے؟'

'جی......نا معلوم......'

'آپ کون ہیں اس کے؟'

'سسر ہیں جی'

'گھر میں اور کون ہے؟'

'میری بیٹی یعنی رسید کی اہلیہ ......ایک میری اہلیہ۔ ایک رسید کی لڑکی، بوڑھے کے چہرہ کا رنگ فق تھا۔

'لڑکی کی عمر؟'

'سولہ سال کی ہوگی جی۔ لیکن سرکار، آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں۔ رسید نے کوئی جرم تو نہیں کیا سرکار،

پھٹک گلے کو کھکھار کر بلند آواز میں بولا۔ رسید آجائے تو کہنا کہ تھانہ میں ملے۔ کہہ دینا کہ انسپکٹر صاحب نے یاد کیا ہے۔ ضرور سے کہہ دینا،

اس دن شہر میں پولیس کی پکڑ دھکڑ چلتی رہی۔ قریب ۳۰۰ آدمیوں کو پولیس نے

ٹاڈا کے تحت حراست میں لے لیا۔

اس دن رشید انصاری تھانے میں حاضر نہیں ہوا۔

دوسرا دن، رتھ یاترا گزرنے کا دن تھا۔ صورتحال انتہائی نازک ہو چکی تھی۔ پولیس کی ڈیوٹی بانٹی جا چکی تھی۔ پولیس کی دھڑ پکڑ جاری تھی۔ امام باڑہ کے پاس سے ابھی بھی اچھی رپورٹ نہیں آئی تھی۔

رتھ یاترا ٹھیک بارہ بجے پہنچ گئی۔ یاترا میں شامل لوگوں کو دونوں طرف سے رُکچھا کوچ، لیس پولیس نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ آواز کا شور اتنا تھا کہ کان کو کان سنائی نہیں دے رہا تھا۔ جے شری رام کے نعروں سے آسمان گونج رہا تھا۔ ایک بجے کے آس پاس اس یاترا کو امام باڑہ سے گزرنا تھا۔ جس وقت پھنک آدمیوں کے جم غفیر سے گزرتا ہوا امام باڑہ کے پاس آیا، وہیں بھیڑ میں۔ اچانک، وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ باڑے میں اسی جگہ، جہاں محرم کے روز نیاز فاتحہ ہو جانے کے انتظار میں کھڑی صبیحہ کو دیکھا تھا۔ اسی جگہ، چبوترے کے اسی مقام پر بجلی کی طرح وہ چہرہ کوندا۔ دبلا پتلا، لانبا، گھٹنے سے نیچے تک کا کرتا۔ پائجامہ اور ہوائی چپل۔ آنکھیں ذرا اندر کو دھنس گئی تھیں۔ گالوں کی ہڈیاں باہر نکل آئی تھیں۔ چہرے پر ہلکی سی جھری کا جال بچھ چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود پھنک نے پہنچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی۔۔۔۔

نگاڑہ بجا...... ڈم...... ڈما...... ڈم......

یاترا دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھوں کی بھیڑ اُمڈ آئی تھی۔ آس پاس۔ کھڑکیوں، دروازے، چھتوں پر آدمیوں کے سیلاب کو دیکھا جا سکتا تھا۔ پھنک جیسے سب کچھ بھول چکا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اس آدمی کی طرف بڑھ رہا تھا...... کانوں میں برسوں پہلے گم ہوئی نگاڑے کی آواز گونج رہی تھی...... ڈم ...... ڈما...... ڈم...... تا...... نہ...... برسوں پہلے کی اس آواز میں رتھ یاترا میں شامل ہجوم کی آواز مل گئی تھی...... جئے...... ڈماڈم...... شری...... ڈم...... تا...... نہ......

اچانک چبوترے پر کھڑے کسی آدمی نے زور سے نعرہ لگایا۔یا علی
اچانک بھگدڑ رمچ گئی......پولیس نے فائرنگ کی...... آنسو گیس چھوڑے......اور نازک ماحول سے نبٹنے کی تیاریوں میں جٹ گئی......

رتھ یاترا گزر گئی۔ لیکن طوفان نہیں تھما۔اس دن کچھی ٹولہ امام باڑہ سے چن چن کر، گھروں سے مردوں کو نکالا گیا اور وین میں بھر بھر کر تھانے پہنچایا گیا۔
پولیس کے آدمی جس وقت رشید کے مکان کے دروازے پر پہنچے،ان میں سب سے آگے پھٹک تھا۔ پھٹک نے دروازہ کی کنڈی زور زور سے ہلائی۔ دروازہ کھولنے والی ایک عورت تھی۔ آنچل ہٹا اور اس کا دہشت زدہ چہرہ باہر آگیا۔ پھٹک چونک کر دو قدم پیچھے ہٹا۔
محرم کا نگاڑہ ایک بار پھر بج اٹھا۔وہی امام باڑہ کے چبوترہ پر نیاز کرانے کی اپنی باری کا انتظار کرتی ہوئی۔۔۔ عورت تھر تھر کانپ رہی تھی۔ پھٹک کی سانسوں میں طوفان آگیا۔ ہونٹوں کا لعاب سوکھ گیا۔ پھر اس نے خود کو بحال کیا۔ پولس یار عاب میں واپس آگیا۔
'رسید کہاں ہے؟'
'جی۔وہ تو گھر پر نا ہیں،۔۔ عورت تھر تھر کانپ رہی تھی۔'
تم صبیحہ ہو......!
وقت جیسے ٹھہر گیا تھا،ہونٹ لرز رہے تھے......
پھٹک کی آواز نرم پڑی۔ عورت نے نظر اٹھا کر دیکھا...... پھر تھم کر رہ گئی......
"پھٹک...... میں پھٹک ہوں...... پھٹک چند......،وردی میں وہ اپنی افسری کی گانٹھ باندھ رہا تھا...... پہچانا؟
عورت کے بدن کی تھر تھراہٹ اب تک بند نہیں ہوئی تھی۔ اچانک پشت سے

اس کے باپ کا چہرہ ابھرا۔ اس نے عورت کو جھٹکے سے پیچھے کھینچا......"اندر جا۔ باہر زنانیوں کا کیا کام......"

پھٹک پھر اسی پولسیار عاب، میں واپس آ گیا۔ اس کے بدن سے تیز ہوا کا جھونکا ٹکرایا۔ سب کچھ بھول کر اس نے سپاہیوں کو آواز لگائی۔ لے لو سب کو حراست میں۔

پولیس کے سپاہی شاید اسی انتظار میں تھے۔ وہ دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ اندر چارپائی پر رشید کی جوان لڑکی زبیدہ سو رہی تھی......سپاہیوں کی ہوسناک آنکھوں نے اسے گھورا۔ لڑکی نے خوفزدہ ہو کر چیخ ماری۔۔۔ایک سپاہی نے انتہائی بدتمیزی سے اس کے سینے پر چکوٹی بھری۔ پھٹک نے تن تنا کر اس کا ہاتھ روک لیا......شاید وہ تذبذب کی حالت میں تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا...... مگر جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ جس وقت پولیس وین تھانے کو کوچ کر رہی تھی، وین سے رونے دہاڑنے کی آواز گونج رہی تھی۔ اس سے بے نیاز پھٹک اس عورت کو گھور رہا تھا، جس میں اس کے سپنے کی، پہلی بارش کی پھواریں کھوئی ہوئی تھیں......

ٹاڈا قانون کے تحت جیل ریکارڈ میں نام درج کراتے وقت صبیحہ کی بیٹی کو لے کر پریشانی ہو گئی۔ وہ ۱۵ سال کی نابالغ لڑکی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ بھوانی سنگھ نے یہ گتھی بھی سلجھا دی۔ جیل ریکارڈ میں کی عمر ۱۸ سال درج کی گئی، اور اس پر بھی ٹاڈا کا مقدمہ بنا دیا گیا۔

پھٹک کے بدن میں ٹھنڈی لہر دوڑ گئی...... لیکن سر......لڑکی تو ابھی نابالغ ہے......

بھوانی ہنسے۔ "ملزم کے لیے عمر کی کوئی سیما اس قانون میں طے نہیں۔ دودھ پیتے بچے سے لے کر ۹۸ سال تک کے بوڑھے کو اس کی زد میں لیا جا سکتا ہے......ہم نے تو بس اس پر ذرا سی مہربانی کی ہے......"

پھٹک کو حیرانی تھی...... 'لیکن جرم کیا لکھا جائے گا۔'

'رشید آتنک وادی ہے۔ اس نے بھیڑ میں بھگدڑ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تم سچ مچ چغد ہو۔ پھٹک چند۔ جب ہم ہی قانون ہیں تو پھر ثبوت کی ضرورت کیا ہے۔ جو

چاہیں، دفعہ ٹھوک دیں گے۔ رشید آتنک وادی ہے تو اس کو ٹھکانہ دینے والے بھی آتنک وادی ہوئے۔ اب رشید کی ماں کو لو۔ آتنک وادی کے شریر میں جو خون دوڑ رہا ہے وہ ماں کا ہے۔ کیوں، تو ماں بھی آتنک وادی ہوئی نا۔؟"

'لیکن سر۔ وہ بڑھیا تو رشید کی ساس ہے۔ رشید کی ماں تو ہے ہی نہیں'

'پھر وہی مورکھ جیسی باتیں۔ ارے بھگدڑ پھیلانے اور گڑبڑی پیدا کرنے میں یہ سب تھے۔ ٹاڈا کی تیس دھاراؤں میں سے کوئی بھی لگادیں گے۔ آتنک وادی گتی ودھیوں میں لپت ہونا ایک دھارا ہوئی۔ بھیڑ یا بھگدڑ سے ایک آدمی کے ہلاک ہونے کی خبر ملی۔ اس طرح رشید پر مرتیو دنڈ اور کم سے کم اس کو پانچ سال کی سزا سنائی جاسکتی ہے۔ اس کے گھر ہتھیار رکھوادو اور اس پر آرمس ایکٹ کی دھارا لگوادو۔'

'لیکن سر، رشید تو ابھی فرار ہے۔'

'دھارا ۸ کے مطابق بھگوڑے شخص کی سمپتی کی قرقی کی جاسکتی ہے، اس میں آگے یہ بھی جوڑا گیا ہے کہ جو شخص مفرور ہے اس کے خلاف مقدمہ کی سنوائی اس کی غیر موجودگی میں بھی ہوسکتی ہے۔ اور جرم ثابت ہو جانے پر اس کی غیر موجودگی میں بھی اسے سزا سنائی جاسکتی ہے۔'

پھنک کے دماغ میں مسلسل نگاڑے بج رہے تھے......اس کے بعد اس نے کچھ نہیں پوچھا......اسے لگا—کسی بلیک ہول میں پھنس گیا ہے اور دھیرے دھیرے ہوا میں تحلیل ہوتا جارہا ہے......اسے لگا، آنکھوں سے پاؤں تک پورے بدن میں اندھیرا پسر گیا ہے......اسے پہلی بار لگا، اس سے کچھ غلط ہو گیا ہے۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی......

اسی شام وہ لاک اپ میں رشید کے پریوار والوں سے ملنے گیا۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے صبیحہ کی طرف دیکھا...... آج اس کی آنکھوں میں محرم کے نگاڑے خاموش تھے......زبیدہ اسے دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹی جیسے سامنے والا آدمی

اس کی عزت لوٹنے پر آمادہ ہو......اس کی سانس پھول رہی تھی......وہ تو یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ بہت جلد ڈزاگنٹڈ کورٹ میں ان پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ اس بیچ رشید کا ملنا بہت ضروری ہے۔ وہ انہیں بتانے آیا تھا کہ تیر کمان سے چھوٹ چکا ہے...... تمہارے خلاف خفیہ گواہ بھوانی سنگھ نے پیدا کر لیے ہیں اور انہیں دکھانے یا بتانے کی ضرورت عدالت کو نہیں ہے......یعنی جو غلطی ہو چکی ہے اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار ہو جانے کا وقت آگیا ہے......اس قانون میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ بڑے بڑے ہیرو لوگ بھی زیرو ہو جاتے ہیں......

اچانک رونے کی آواز ابھری......لاک اپ میں کسی کی ہچکیاں گونج گئیں۔ پھٹک نے گھوم کر دیکھا۔

یہ صبیحہ تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے...... برسوں پہلے کا ایک منظر پھٹک کی آنکھوں میں دوڑ گیا اگر میں مسلمان ہوتا تو......پھر تم اپنا رشتہ بھجواتے......"

"اور مان لو میں نے اپنا رشتہ بھی بجھوا دیا تو......، تو میں ہاں کر دیتی......ہاں کر......"

پھٹک اندر تک ہل کر رہ گیا۔ پیٹ کے نیچے والے حصے میں ذرا سی ہلچل ہوئی......اس نے ناخن سے وہ حصہ کھجلایا......رات آسمان پر چھا رہی تھی۔ بیرکوں سے قیدیوں کے چیخنے چلانے اور رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔

اسی شام رشید نے حوالات میں خود آکر اپنی گرفتاری دے دی......وہ بہت زیادہ ڈرا ہوا تھا......اب باقی تھا تو بس اقبالیہ بیان کی رسم اور اس کے بعد ان سب کی قسمت پر قانون کی مہر لگ جانی تھی......

رات کے ٹھیک بارہ بجے بھوانی سنگھ کی کار باہر رکی اور پھٹک چونک کر اٹینشن کی مدرا میں آگیا۔

وہ رات اقبالیہ بیان لینے کی رات تھی......

یا تناگرھ یا اذیت گھر کی دیواروں میں خوف حلول کر گیا تھا۔ جیسے سناٹے میں دور

سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی پڑتی ہے، ویسے ہی دور سے بھوانی سنگھ کے بوٹوں کی ٹاپ ابھری۔

پھٹک نے ٹھنڈی سانس بھر کر یاتنا گرہ کی کالی ہو رہی کوٹھری کو دیکھا۔ دیواروں پر جابجا مکڑے کے جالے لٹک رہے تھے۔ کالی ہو رہی دیوار کا پلستر جھڑ چکا تھا۔ کمرے میں ایک کرسی تھی۔ پھٹک کے پاس ہی کانسٹبل رتنا کر کھڑا تھا۔

باہر کتے بھونک رہے تھے۔

بھوانی سنگھ اس سے پہلے بھی کتنے ہی اقبالیہ بیان لے چکے تھے اور پھٹک ان سب کا چشم دید گواہ رہا تھا۔ پھٹک جسے ساری دنیا ہی غلط نظر آتی تھی اور جو ہر چیز کو غلط انداز سے دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا، آج پہلی بار خود کو الجھنوں کا شکار محسوس کر رہا تھا۔ اس نے تھوک نگلا۔ پھر رشید کی طرف مڑا۔

'تم جانتے ہو۔ تم لوگوں کو یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟'

ہاں۔ رشید کی آنکھوں میں موت ناچ رہی تھی۔

'اقبالیہ بیان کے لیے۔ اس کا مطلب جانتے ہو......"

رشید نے سانس درست کی۔" پھٹک۔ میں جانتا ہوں تم یہ سب کیوں کر رہے ہو۔ کالج کی لڑائی کو تو عرصہ بیت گیا۔"

'اب اس جرح کا وقت نہیں ہے۔ دیر ہو چکی ہے۔'

رشید کی کمزور آواز ابھری۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ نہ میرے خاندان والوں نے آخر تم ہم لوگوں کو کیوں پھنسوانا چاہتے ہو...... دھیرے دھیرے اس کی آواز میں تلخی آتی جا رہی تھی...... "چن چن کر امام باڑہ سے مسلمانوں کو جیپ میں بھر بھر کر لے گئے تم لوگ۔ رتھ یاترا نکالنا گناہ نہیں تھا۔ گناہ تھا بھیڑ میں کسی کا یاعلی بول دینا...... تمہاری حکومت ہے اس لیے جو مرضی چاہے کر سکتے ہو۔ اتنی جیلیں نہیں ہیں تمہارے پاس۔ کتنے مسلمانوں کو بھرو گے۔'

"ان سوالوں کے لیے ابھی وقت نہیں ہے رشید۔" پھٹک الجھتی سانسوں کو

درست کرتے ہوئے چلایا۔

''اقبالیہ بیان کا مطلب جانتے ہو......؟''

تبھی دروازہ بھڑاک کے ساتھ کھلا۔ پھٹک نے اڑی رنگت کے ساتھ دیکھا۔ دو بوٹ یا تناگرہ کے دروازہ پر آکر ٹھہر گئے۔ بھوانی سنگھ کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ ہاتھ میں شراب کا ایک گلاس تھا۔ آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔ بدن پر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کی وردی تھی، جس پر ستارے چمک رہے تھے۔ ہاتھ میں ایک پلین پیپر تھا۔

زبیدہ نے ہلکی سی چیخ ماری اور اماں صبیحہ سے لپٹ گئی۔ علیم نے اپنی بوڑھی بیوی کی طرف دیکھا۔

بھوانی سنگھ ایک قدم آگے بڑھے۔ گلاس سے ایک گھونٹ لیا۔ پھر آگے بڑھ کر رشید کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ مارا۔

'سالے، سور کی اولاد۔ یہاں سائن کر۔'

رشید کی آنکھوں کے آگے جیسے پوری دنیا گھوم گئی۔

'سائن کر یہاں۔'

رشید نے پلٹ کر دیکھا۔ نہیں کروں گا۔ تم ڈرا رہے ہو مجھے۔ آخر چاہتے کیا ہو تم لوگ؟

بھوانی نے زور کا ٹھہاکا لگایا۔ باقی شراب ایک سانس میں پی گئے۔ پھر لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھے۔ کاغذ کانسٹبل رتناکر کی طرف بڑھایا۔ پھر رشید کی طرف تیزی سے گھومے۔ اس بار ان کا دایاں بوٹ والا پیر تیزی سے گھوما۔ بوٹ رشید کی جانگھوں سے ٹکرایا۔ وہ تیز چیخ کے ساتھ زمین پر لوٹنے لگا...... گلے سے بھیانک چیخ گونج اٹھی......

رشید پھر چیخا۔ 'کچھ بھی کرلو۔ مگر سائن نہیں کروں گا میں......'

بھوانی غصے میں آگے بڑھے۔ وزنی بوٹ کی نوک اس کے سینے پر رکھی۔ پھر انگلی کے اشارہ سے زبیدہ کو اٹھنے کے لیے کہا۔

پھنک نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے سارے بدن میں سہرن پھیل گئی۔ اسے لگا رات ہو گئی ہے...... چنی کام دھام سے فارغ ہو کر اس کے کمرے میں آئی ہے......

کانسٹبل رتناکر کو اشارہ کیا۔ 'اس کے کپڑے کھولو!'

بھوانی نے کانسٹبل رتناکر نے ایسے جیبھ نکالی جیسے قانون اور قانون کے اصولوں کا پالن کرنا اس کا اولین فرض ہو۔

رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ آسمانوں پر کہیں بادلوں کا ایک بڑا سا ٹکڑا ئی لاش کی مانند دکھائی دے رہا تھا...... بڑے ٹکڑے کو گھیرے کچھ چوکور تاریک ٹکڑے بھی تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چوکور ٹکڑے ان سوگواروں میں شامل ہوں جو لاش کندھوں پر اٹھائے آسمان کی نگریا میں بڑھتے جا رہے ہوں...... اکا دکا جو ستارے آسمان پر نظر آرہے تھے وہ چپ تھے......اور بدلیوں میں چھپنے کے منتظر تھے......

ہوا ایک بیک تیز ہو گئی۔

بھوانی سنگھ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اندر دبا ہوا غصہ رہ رہ کر چاول کی بھاپ کی طرح کھنکھنا رہا تھا...... 'سالے پتہ نہیں قانون کو کیا سمجھتے ہیں آتنک وادی...... دیس کو کھلونا سمجھ رکھا ہے۔ جب مرضی آئی دنگے کروا دیئے۔ اب یہ ہندواستھان......اور ایک رتھ یاترا نہیں نکل سکتی۔ سالے پاکستان بنوا کر بھی کھس ہ نہیں ہوئے۔ یہاں بھی اپنی کریں گے......انہیں تو بس تھوڑی سی جگہ دے کر دیکھو...... سالے چار ملا جمع ہو جائیں تو دوسرا اسلامستان بنا لیں گے...... سالے جاہل کی اولاد......سارا کٹرواد نہیں بھلا دیا تو...... کیوں رے رتناکر بھڑوے سالے۔ آج تیری مردانگی کو کیا ہو گیا ہے...... دیکھا کیا ہے سالا...... جوان لڑکی ہے، تروتازہ ہے......ارے دیکھتا کیا ہے سالا

بھڑوا......"

آگے بڑھ کر اس نے رتناکر کو ایک ہاتھ دیا...... یہ سب سالے آتنک وادی ہیں...... لوٹ رہے ہیں دیس کو اور تو ان پر رحم کھا رہا ہے۔ ان پر......، وہ علیم الدین، اس کی اہلیہ، صبیحہ، زبیدہ اور گھبرائے سے رشید کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

'یس سر' ...... رتناکر مار کھا کر کسی بھوکے شیر کی طرح زبیدہ پر جھپٹا۔

'شاباش!'

بھوانی نے قہقہہ لگایا۔ ایک لمحے کو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ آج یہ کیسی زبان وہ استعمال کر رہا ہے...... پھر اس نے اس خیال کو جھٹکا۔ پولیس کو وہ کتنا ہی بڑا افسر کیوں نہ ہو، اسی زبان کو ماڈل بنانا چاہیے۔ اسی زبان سے پولیس کی کھوئی ہوئی ناک بنی رہ سکتی ہے۔

بھوانی سنگھ کو ملزموں کا امتحان (بھلا) کرنے میں مزہ ملتا تھا۔ ان کی پتنی جوانی میں ہی مر گئی تھی۔ ایک لڑکا تھا جو پڑھ کر ولایت چلا گیا۔ وہیں کی ایک میم سے شادی کر لی اور وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ بھوانی سنگھ لمبے تگڑے آدمی تھی۔ دوبارہ شادی نہیں کی۔ اور پولیس کی نوکری میں شادی نہ کرنے کا غم بھی نہیں ہوا۔ وہ ایسے سوداگر تھے کہ جس مال پر ہاتھ رکھ دیں، وہ مال ان کا ہوا۔ اور وہ شروع سے ہی اس پولسیا رعاب کا استعمال کرتے رہے تھے۔

زبیدہ چلائی۔ اس کے چلانے سے حوالات کی دیواریں دہل گئیں۔ شلوار کا ناڑا ٹوٹ کر گرا تھا۔ اس کا دودھیا سڈول پاؤں جیسے اچانک انگاروں کی بارش کرنے لگا تھا۔ بھوانی سنگھ کی آنکھوں میں نشہ چھا گیا۔ 'سالے ہر کام نیچے سے شروع کرتا ہے۔ ٹھہر جا......، رشید نے مدافعت کی کوشش کی۔ بوڑھے علیم الدین نے آنکھیں پھیر لیں۔ بھوانی کانسٹبل رتناکر پر چیخے۔ ان سالوں پر چابک مارو اور جو ہو رہا ہے اسے دیکھنے پر مجبور کرو؟

بوڑھا علیم الدین روتا ہوا بھوانی کے پیروں پر گرا......"صاحب یہ ظلم مت کرو......نادان بچی ہے۔ ابھی پوری عمر پڑی ہے......ابھی تو کچھ بھی دیکھا نہیں ہے اس نے......'

"تو؟ ہم دکھلائیں گے ابھی دکھائیں گے۔ اسی وقت۔ کیوں پھٹک چند؟"
بھوانی کو کافی دیر بعد پھٹک کا خیال آیا، جو گیٹ پر، دوسری طرف منہ کئے کھڑا تھا......

'ارے پھٹک چند......سالے کی حال ہے، ابھی بھی تیرے پینٹ کا حال ٹھیک نہیں ہوا۔، بھوانی مزے لے کر ہنسے۔

کانسٹبل رتناکر نے چابک سنبھال لیا۔ چمڑے کا چابک۔ چابک ہوا میں لہرایا۔ ملی جلی کئی چیخ ایک ساتھ فضا میں بلند ہوئی...... بھوانی کے ہاتھ آگے بڑھے۔ جسم کیا تھا...... منجھے ہوئے کمہار کے چابک دست ہاتھوں کا کرشمہ......تراشے ہوئے عضو...... دودھیا صندلی بدن......مخروطی انگلیاںٹ پھولے پھولے ہونٹوں سے ٹپکتا شہد......آنکھوں کی وحشت میں ہرنی سے بلی...... جیسے گورے انگ انگ میں شراب ہی شراب بھر دی گئی ہو......

زبیدہ اب چیخ بھول گئی تھی......وہ جیسے شدید ٹھنڈ سے کانپ رہی تھی...... جسم پر کپڑے کا ایک تار تک نہیں رہ گیا تھا......ہاتھ میں وہ قوت نہیں تھی کہ جسم اور جسم کے ابھاروں کو ڈھانپ سکتی...... سینے کی حیرت ناک گداز گولائیاں اور دودھیا نورانی چمک نے بھوانی کے علاوہ کانسٹبل رتناکر کے دماغ کی نسوں کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا......
رشید نے پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا۔ یااللہ کہہ کر رونے کی کوشش کی، مگر آنسو تو کب کا آنکھوں سے پیچھا چھڑا چکے تھے......یہ اس کی بیٹی ہے......وہی زبیدہ...... جو کتنی بار اس کی بانہوں میں ابا کہہ کر سمائی تھی......رشید بلیاں لیتا تھا......پاگل۔ کیوں

اتنا پیار کرتی ہے۔ ایک دن تو سسرال چھوڑ کر چلی جائے گی...... میں تو نہ جاؤں گی۔ یہیں رہوں گی۔ تمہارے پاس۔ وہ جھوٹ موٹ روتے ہوئے اس کے بدن سے کسی چھوٹے بچے کی طرح چمٹ جاتی۔

ایسے موقعوں پر آنکھوں کو دیکھنے کی تاب کہاں رہ جاتی ہے۔ آنکھیں دیکھ تو رہی ہوتی ہیں مگر دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھ رہی ہوتی ہیں......ایسے پتھرا جاتی ہیں کہ اندر ہی اندر موت ہو گئی ہو آنکھوں کی۔ ایسے سو جاتی ہیں کہ تاریکی کے سوا کچھ بھی بجھائی دینے کی حد سے باہر نکل آتی ہیں......

پھنک کو لگا، کوئی چیونٹی سی سرسرا رہی ہے بدن میں ـــــ نہیں پیٹ کے نیچے والے حصے میں......کچھ جنبش ہوئی ہے...... نہیں......وہ کمرے میں ہے......رات کا تھکا ہارا...... پتنی نے اندھیرا کر دیا ہے بتی بجھا دی ہے......اور اب وہ دن بھر کی میلی کچیلی ساڑی پھینک کر نائیٹی بدل رہی ہے......اندر جیسے کچھ جھنجھنا رہا تھا......ٹوٹ رہا تھا......

رتنا کر کے چابک پھر برسے اور اس نے پینٹ کے اندر اپنی ہتھیلیوں کو مضبوطی سے جانگھوں پر بھینچ لیا......

بھوانی کے ہاتھ اپنے پینٹ کی زپ تک آئے اور زبیدہ کے ننگے تن نے ایک بھیانک چیخ کے سامنے خود کو دو مضبوط حیوانی بازوؤں میں سمٹا ہوا محسوس کیا......رشید پوری قوت سے گالی دیتا ہوا مارنے کو جھپٹا تو رتنا کر کے چابک نے اسے دوبارہ زمین دکھا دی۔ وہ بھرائی سی تیز تیز سسکیاں لے رہا تھا۔ ایسی سسکیاں جو بڑھ جائیں تو جسم سے روح کا رشتہ منقطع کر دیتی ہیں......

آسمان پر بادلوں کا بڑا سا گھنیرا ٹکڑا جو کسی لاش کی مانند دکھائی دے رہا تھا، اب آسمان سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اب وہاں سرمئی، سرخی مائل بدلیاں چھا گئی تھیں۔ اور پان کی پیک کی طرح بدلیوں میں لال لال چکتے اچھل پڑے تھے......

بھوانی نے لمبی لمبی سانس درست کی۔ ایک طرف نڈھال سی زبیدہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ، دیوار کے سہارے گھٹی گھٹی سانسیں چھوڑ رہی تھی...... کمرے میں

وہ سب تو تھے جنہیں چھتنار درخت کہتے ہیں......اور جن کے سہارے اسے زندگی کی طویل و عریض کھائیاں عبور کرنی تھیں......ماں باپ......نانا نانی......اور ان سب کے سامنے اسے......اس نے خوف اور ہیبت سے پھر ایک تیز چیخ ماری......اندر دبی سسکیوں نے ندی کی باندھ کو توڑ دیا تھا اور وہ کسی ٹوٹی پھوٹی گڑیا کی طرح اپنا عریاں بدن سنبھالے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی......

صبیحہ نے موت جیسی آنکھوں سے زبیدہ کو دیکھا...... کچھ بول نہیں سکی...... آواز اٹک کر رہ گئی

''آتنک وادیوں سے اقبالیہ بیان لکھوانا بھی کتنا مشکل کام ہوتا ہے......یہ سب بھی کرنا پڑتا ہے ــــــ یہ ملیچھ۔''

بھوانی نے للچائی آنکھوں سے تاک رہے رتناکر کو دیکھا...... تو کیا سوچتا ہے۔ میری مت ماری گئی تھی جواتی سی لڑکی سے۔ مگر یہ سالا کمبخت حرام کا جنا ایسے، بیان پر دستخط نہیں کرے گا۔ اور تو ایسے للچائی آنکھوں سے کیا دیکھ رہا ہے......وہ تیرا شکار ہے......وہ......اس نے صبیحہ کی طرف اشارہ کیا۔

صبیحہ دو قدم خوف سے پیچھے ہٹی۔ پھر دیوار سے ٹکرا گئی۔

پھٹک کے اندر محرم کے نگاڑے ایک بار پھر سے چیخے......دھم......دھڑم...... ڈماڈم......اس کی پتنی نے نائیٹی پہن لی ہے......بستر پر لیٹ گئی ہے۔ اور اب اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا ہے۔ پھٹک نے زیر ناف اپنے ہاتھوں کو جنبش دی ہے...... کٹی ہوئی چھپکلی ایک دم شانت ہے ــــ سویا ہوا بے حس کیڑا۔ یہ کیڑا ہاتھ کی جنبش کے باوجود مردہ سا ہے۔ سویا ہوا۔

کانسٹبل رتناکر نے بانہہ کی آستین چڑھائی۔ پھر بندر کی طرح اچھلا۔ اگلے ہی لمحے اس نے صبیحہ کو ایسے دبوچ لیا جیسے کوئی چڑیا باز کے پنجوں میں آگئی ہو......اچانک چر...... ر......ر......کی آواز ہوئی۔ صبیحہ کے بلاؤز کا ایک بڑا حصہ رتناکر کے ہاتھ میں تھا۔

بوڑھے علیم الدین نے اپنا سر دیوار سے ٹکرایا۔ گڑگڑانے والے انداز میں بولا:

''میں ہاتھ جوڑتا ہوں تمہارے...... بند کرو...... بند کرو یہ سب،''

'بند کروں۔ مگر کیوں بھائی؟، بھوانی کرسی سے اچھلا۔ علیم الدین کی گردن تھامی اور اسے تیزی سے دیوار کی طرف دھکا دیا۔ ٹھیک اسی وقت پشت سے رشید نے پوری طاقت لگا کر اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن حملہ کرنے میں زور سے زیادہ فرط جذبات کو دخل تھا۔ بدن کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ بھوانی نے ایک زور کی ٹھوکر اس کی زپ والی جگہ پر ماری۔ رشید ٹانگوں کے بیچ ہاتھ پھنسا کر بری طرح چیخا۔ اس کا پورا جسم جھنجھنا اٹھا تھا۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ اپنا پیر پکڑ کر، بلبلا کر، زمین پر لوٹنے لگا۔

بھوانی نے پینٹ کی گرد جھاڑی ''...... بند کر دوں...... بند کر دوں...... آخر کیوں بھائی۔ اس لیے کہ تم اپنی من مانی کر سکو۔ کان کھول کر سن لو، اب تک جتنی من مانیاں تم لوگوں نے کی ہیں، ہم نے اس کی رائی برابر بھی زیادتی نہیں کی۔ آتنک وادی سالے...... دیس کو لوٹنے چلے ہیں......''

اس نے اوندھی پڑی زبیدہ کو دیکھا۔ جس کا بدن دیوار سے اڑا ہوا تھا اور جو تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سولہ سال کا معصوم بدن حوالات کے اندر کی گرمی سے مرجھائے ہوئے پھول کی طرح لگ رہا تھا...... اس سے پہلے، جسم سے جو دودھیا چاندنی کی دھار پھوٹ رہی تھی، اب وہ چاندنی بجھی بجھی لگ رہی تھی......

'نہیں مزہ نہیں آیا۔ ان آتنک وادیوں کو تو ایسا مزہ چکھانا چاہیے کہ آنے والی پیڑھیاں یاد رکھیں، رشید کے حملے سے بوکھلائے بھوانی کا چہرہ گرم پانی کی طرح کھول رہا تھا۔ اس نے زور سے آواز لگائی۔ پھٹک چند!

''یس سر''

''رتنا کر''

''یس سر''

رتنا کر کی زپ کھل گئی تھی۔ اور وہ کسی دور سے دوڑتے آرہے مسافر کی طرح

تھکا معلوم دے رہا تھا۔ اور سانس ہنپنی کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

صبیحہ کی ساڑی کھلی پڑی تھی۔ بلاؤز ایک طرف پھیکا ہوا تھا۔ اور وہ ادھ مری سی ننگے جسم کے ساتھ حوالات کی میلی ہو رہی چھت کو گھور رہی تھی......

'رتنا کر۔ پھٹک چند......، بھوانی پھر زور سے چلایا۔

'یس سر' ......دونوں اٹینشن ہو گئے۔

''ان تینوں کو ننگا کر دو۔ چلو جلدی کرو''۔ اس نے علیم الدین، اس کی اہلیہ اور رشید کی طرف اشارہ کیا۔

مدافعت میں اٹھے ہاتھ، اور ماحول کی بھٹی میں جھلس گئے جسم میں اب طاقت ہی کہاں رہ گئی تھی۔۔۔۔ کپڑے اتر گئے۔ آنکھوں میں موت سے زیادہ بے شرمی کا خوف تھا......

ہوا تیز ہو گئی تھی۔ حوالات کا مضبوط دروازہ تیز ہوا سے ڈولا۔ بھوانی کے قہقہے میں دروازہ ہلنے کی آواز دب گئی۔

پھٹک کے ہاتھ بوڑھی عورت کے بدن سے کپڑا اتارتے ہوئے لگاتار کانپ رہے تھے۔ انگلیاں لرز رہی تھیں...... مگر ڈر، عادت اور آفیسر کے حکم سے بندھے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا...... بس وہی حرکت کرتی سی پرچھائیاں......اس کی پتنی کا بدن نائیٹی میں سرسراتا ہے......بستر ذرا سا کسمسایا ہے......پتنی کے سرسراتے ہوئے ہاتھ اس کے کندھے تک آکر ٹھہر گئے ہیں......

بھوانی نے رشید کے فق چہرے کو دیکھ کر ایک گندی سی گالی بکی اور چیخ کر کہا......

''چل سالے ...... بٹی سے زنا کر...... زنا سمجھتا ہے......سالے یہ تیری ہی زبان کا لفظ ہے......پاکستان میں تو کوڑے پڑتے ہیں اس پر......، پھر اس نے رتنا کر کو اشارہ کیا۔ سالا دیر کرے تو چابک سے چمڑی چھیل دینا۔'

رشید کانپتا ہوا پاؤں پر گر پڑا۔ لاؤ میں سائن کر دیتا ہوں......جہاں چاہتے ہو...... جتنے کاغذ پر۔ جہاں جہاں اسٹیمپ لگوانا چاہتے ہو...... سب لے آؤ...... مگر اس

وقت بخش دو۔ مجھے ......زندگی بھر کے لیے جیل میں ٹھونس دو۔ میرے خاندان والوں پر بھی رحم مت کرو...... سب کو جیل میں ڈال دو۔ سزا دو...... عمر قید دے دو...... پھانسی دے دو......اس سے بھی کوئی بڑی سزا ہو تو...... مگر یہ سب......،

وہ لرز رہا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

''میں مر چکا ہوں۔ یہ زندگی نہیں ہے۔ موت سے بدتر زندگی مر چکا ہوں۔ جو کچھ دیکھ لیا ہے، اس سے آگے دیکھنے سننے اور جینے کو باقی ہی کیا رہ جاتا ہے۔ انسانیت کے واسطے...... یہ بچی ہے میری۔ سمجھو صاحب...... آپ کی بھی بچی ہو گی......،

نہیں ہے۔ میری کوئی بچی نہیں ہے،۔ بھوانی زور سے گرجے۔ رتناکر کے چابک نے برس برس کر رشید کو بیٹی کے پاس پہنچادیا۔ وہاں دیوار کے پاس، ننگی زبیدہ کا سر بیہوشی کے عالم میں دیوار سے ٹک گیا تھا۔

'چل رے بوڑھے۔ تو بھی اٹھ۔ بڑی دیر سے دیوار میں سر مار رہا تھا، بھوانی گرج کر بولے۔ ''چل...... چل اپنی بہو کے ساتھ شروع ہو جا۔ سنتے ہیں سالے مسلمان کا کٹا ہوا جانور اصلی رنگ تو بڑھاپے میں دکھاتا ہے۔ اپنی بوڑھی عورت سے تجھے بھلا کیا ملتا ہو گا۔ چل شروع ہو جا۔ پھٹک چند......، بھوانی پھٹک چند سے مخاطب ہوئے......ذرا بوڑھے کو سمجھا۔ بتا کہ یہ سب قانون کے دائرے میں آتا ہے۔ چل لگا اسے ایک ڈنڈا کہ سالے آتنک وادی کا مزاج ٹھکانے آجائے......''

آسمان پر چھائی سرخی مائل بدلیوں کی رنگت ایسے ہو گئی تھی جیسے آنسو گر رہے ہوں...... فطرت کی نقاشی بھی عجیب ہے...... کبھی جب بھرپور گھٹا اور بدلیاں چھائی ہوں تو آسمان کو دیکھئے۔ انوکھی اور زندہ تصویریں کہ رافیل اور لیونا ڈونچی کے شاہکار بھی شرما جائیں۔ اب چاروں آسمان پر خون پھیلا تھا۔ اور اس کے آنسو بدلیوں کے خفیف ٹکڑوں کے بیچ لٹکے ہوئے تھے۔

پھٹک چند کے قدموں میں جنبش ہوئی......اچانک وہ بھوانی سنگھ کی طرف مڑا اور گھٹی ہوئی آواز میں اپنا فیصلہ سنادیا۔

"نہیں سرکار...... مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔"

"کیوں؟ بھوانی طیش میں مڑے۔ کیوں تیری کڑی ہے۔ تیری بیوی ہے...... سالے پولیس میں نہیں رہنا ہے تو سنیاس کیوں نہیں لے لیتا......"

"لیکن سر......، وہ اٹک اٹک کر بول رہا تھا...... یہ...... یہ قانون کے دائرے میں نہیں آتا یہ قانون کے دائرے سے باہر ہے......،

اس کا چہرہ سپاٹ ہو رہا تھا۔ اور برف کی طرح ٹھنڈا۔

"قانون۔ بھوانی سنگھ ہونٹ بھینچ کر مڑے۔ بڑا قانون والا ہو گیا ہے آج پھٹک چند......اس سے پہلے ایسے کتنے اقبالیہ بیان لے چکا ہے تو۔ میرے سامنے...... میں گواہ ہوں۔،

اس نے سر جھکالیا۔

"قانون سکھاتا ہے تو۔ بھوانی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھیلا......اتنی سی وردی اور قانون سکھاتا ہے تو......بتاتا ہوں تجھے۔ آزادی کے دنگوں میں یہی لوگ تھے۔ کٹی ہوئی ریلیں آتی تھیں ہندو شرنارتھیوں کی۔ مردوں کے تو سر اتار لیتے تھے یہ سالے اور ہندو لڑکیوں کو یہ ملا داڑھی والے اپنے ناڑے کے اندر بند کر لیتے تھے......،

"اس وقت یہی کچھ سب کے ساتھ ہو رہا تھا سر......، پھٹک، کی آواز لڑکھڑا گئی مگر وہ بول نہ سکا———— بھوانی کے دھکا دینے سے اس کے جسم کا توازن بگڑ گیا۔ وہ رتناکر کی طرف لڑھک پڑا۔ اچانک سنبھلا۔ اور دوسرے ہی لمحے سرعت کے ساتھ گھوما اور ہوا سے ہلتے دروازے سے باہر نکل گیا۔

پھٹک چند۔ بھوانی زور لگا کر چیخے پھر بدبدائے...... سالا نامرد کا بچہ

آسمان پر بدلیوں کا کھیل چلتا رہا۔ کتنے آنسو ٹپکے اور بادلوں کے کتنے ٹکڑے چکور ہو کر کندھے پر لاش اٹھائے سوگواروں میں بدل گئے۔ کس نے یہ منظر دیکھا...... ہوا

تیز چلتی رہی...... آسمان کے منظر بدلتے رہے......بدلیاں گپ چپ نیلے آسمان اور خفیف اندھیرے میں چھپنے نکلنے کا کھیل کھیلتی رہیں۔

انجام (۱) :اس کے بعد پھنگ چند کی کوئی خبر نہیں آئی۔ وہ کہاں گیا...... کہاں مر کھپ گیا......اور اسی لیے مجھے آپ کے سامنے ٹپکنا پڑ رہا ہے......وہ میرا کردار تھا،اس لیے مجھے پتہ ہے...... کہ وہ اتنا بہادر بھی نہیں ہو سکتا کہ خود کشی کر لے، کسی کو مار دے یا فرار ہو جائے...... مجھے پتہ ہے،وہ ایسا کوئی بھی ہمت بھرا کام کرنے کے لائق نہیں ہے...... پھر بھی۔ وہ اس منظر کا چشم دید گواہ رہا ہے،جو ٹارچر روم کی اندھیری کوٹھری میں کھیلا جاتا رہا اور (شاید) منظر کی تاب نہ لا کر وہاں سے فرار ہو گیا۔

ہاں،ایک بار ایسا بھی ہوا۔ (یہ میرا بھرم نہیں ہے)...... کہ رات کے اندھیرے میں وہ اچانک میرے کمرے میں نظر آیا...... میرے لکھنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا۔ میں نے صاف پہچان لیا......وہ پھنگ چند ہی تھا۔ وہ کافی کمزور لگ رہا تھا۔ مگر چہرے سے نہیں......اس نے بتایا،اس نے جو بتایا،وہ میرے لیے حیرت زدہ کرنے والا تھا۔اس نے بتایا...... وہ شمسان میں رہ رہا ہے ان دنوں...... جہاں مردے رہتے ہیں یا مردے جلائے جاتے ہیں......وہ وہیں چھپا بیٹھا ہے۔ اسے روشنی سے......اجالے سے ڈر لگتا ہے......اور وہ اپنی کھوئی ہوئی مضبوطی کو پانے کے لیے بدن میں کانٹے اگانے کا عمل کر رہا ہے۔

مجھے اس سے ناراضگی تھی۔اس لیے میں غصے سے اس کی طرف بڑھا۔اور سچ کہتا ہوں،وہ اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔پھر یہ ہوا کہ غصے کے عالم میں،اس کی جگہ، میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اچانک ہی اٹھ کھڑا ہوا......احساس ہوا کہ کرسی کی سیٹ پر ڈھیر سارے کانٹے اگے ہوئے تھے......

انجام (۲) :اگر آپ کو اس کہانی کا یہ انجام پسند نہیں ہے، تو اس کہانی کا ایک انجام یہ بھی ہو سکتا ہے۔

پھنگ چند گھر آ گیا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی...... جیب میں قانون سے ملی

ہوئی ایک چھوٹی سی پستول اس کی کپکپاہٹ کے ساتھ کانپ رہی تھی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا...... ذہن پر بجلیاں گرج رہی تھیں...... گھر میں قدم رکھتے ہی اس نے دیکھا...... اس کی جوان لڑکی بستر پر سوئی پڑی ہے۔ ایک لمحے کو زبیدہ کا چہرہ اس کی آنکھوں میں ناچ گیا...... آسمان سے جیسے کوئی بجلی گری اور اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں سما گئی۔

کانپتے ہاتھوں سے اس کی انگلیاں جیب کے اندر رکھے پستول کو ٹٹولتی رہیں۔ ایسا کرتے ہوئے ٹانگوں کے پاس ہلکی سی حرکت ہوئی۔ ایسا لگا، جیسے کٹی ہوئی مردہ چھپکلی اچانک تڑپ گئی ہو۔ بے حس سوئے کیڑے میں ہلکی سی پھڑ پھڑاہٹ سما گئی ہو...... پھر وہ اپنی چھٹپٹاتی، ٹوٹتی سانسوں کو یکجا کرتے ہوئے زور سے چیخا۔ جیسے ہی چیخ سن کر بدحواس سی اس کی بیوی اس کے سامنے آئی، اس نے گولی چلادی۔ بیوی چیخ مار کر زمین پر گر پڑی۔ اس نے دوسری گولی کمرے میں سوئی ہوئی بیٹی کی طرف داغی۔ پھر رکا نہیں۔ اپنی کنپٹی پر پستول کی ناک رکھ کر آنکھ موندلی......

باہر ہوا سرسرا رہی تھی...... آسمان پر بدلیوں کا کھیل ابھی بھی چل رہا تھا......

○○

شمع، نیا سفر ۱۹۹۳ء

سب سے اچھے انسان

(۱)

وہ دن موسم سرما کے سرد ترین دنوں میں سے ایک تھا......

نیلے آسمان پر بادلوں کے جھنڈ چھوٹے چھوٹے برف کے بے شمار ٹکڑوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ سورج کبھی کبھار ان برفیلے ٹکڑوں کو پگھلا کر جھانکنے کی کوشش کرتا، اور فوراً ہی ان ٹکڑوں کے پیچھے روپوش ہو جاتا۔

بوڑھے کی پشت اس پتھر کی جانب تھی جس پر لکھا تھا۔ ۲۵۰ میل۔

جہاں وہ کھڑا تھا وہاں سے پل کی اٹھان شروع ہوئی تھی۔ یہ ایک لوہے کا پل تھا جو اس پار پھیلی ہوئی دھند کی وجہ سے، آسمان سے ملا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

"کیا مصیبت ہے......"

بوڑھا زیر لب بڑبڑایا۔ اپنی جیب ٹٹولی۔ دائیں ہاتھ میں پکڑے پنجرے کو میل والے پتھر پر رکھا۔ پھر اپنے بوسیدہ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کوٹ کی آستین تک سرد تھی۔ ہاتھ پیر برف ہو رہے تھے۔ مگر بوڑھے کے چہرے پر ٹھنڈک کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔ اس نے جو پینٹ پہن رکھی تھی، اس پر کافی گرد بھی تھی۔ ٹخنے کے پاس کا حصہ ذرا سا پھٹا ہوا تھا۔ شرٹ کے اوپر کے دو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے، جس پر اس نے ایک

چیتھڑے آسمانی رنگ کے کوٹ کو جگہ دے رکھی تھی۔ سر پر فیلٹ ہیٹ جیسی کوئی شی چپکی تھی۔ اس دھند اور کہاسے میں پل کے کنارے کھڑا بوڑھا اتنا پراسرار تو دکھ ہی رہا تھا، کہ آدمی ایک بار اسے دیکھ کر گھبرا جائے۔

دریا کا پانی جما ہوا تھا۔ بوڑھے نے پینٹ کی جیب سے ماچس ڈھونڈ نکالی، پھر آرام سے بیڑی پینے لگا۔

"کیا مصیبت ہے...... آگے راستے کا پتہ نہیں۔ کوئی ہے بھی نہیں جس سے کچھ پوچھا جا سکے۔"

بڑبڑاتے ہوئے وہ پنجرے کی طرف جھکا، جس پر مٹھو میاں ٹھنڈ سے اکڑے کانپ رہے تھے۔

"اخاہ...... تو آپ کو ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ کیوں مٹھو میاں...... ہیٹ چلے گا۔ ہیٹ اوڑھیں گے آپ؟"

اس نے سر سے ہیٹ اتار کر پنجرے پر ڈھانپ دیا۔ اور مطمئن ہو کر بیڑی کا کش کھینچنے لگا۔

"ایک غیر مہذب دن......اور ایک ناشائستہ شروعات......"

وہ پھر بڑبڑایا اور آدھی بیڑی دریا کی سمت اچھال دی۔

"کچھ بھی اچھا نہیں۔ مگر، تم گھبراؤ مت مٹھو میاں...... جو لوگ اپنی حفاظت کرنا نہیں جانتے وہ مر جاتے ہیں۔ تم نے دیکھا نہ...... عائشہ مر گئی۔ ایلیا مر گئی۔ مگر تم زندہ ہو......اور میں زندہ ہوں...... ہے نا بڑی بات......"

اس کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔ "تم اپنی حفاظت کرنا نہیں جانتے۔ مگر میں تھا تمہارے ساتھ ......اور مجھے دیکھو تو مٹھو میاں مجھ بوڑھے کو۔ ستر سے اوپر کا ہو رہا ہوں مگر زندہ ہوں۔ تو مٹھو میاں...... زیادہ اکڑو مت۔ ٹھنڈ کے موسم میں ٹھنڈ سبھی کو لگتی ہے......"

اس نے یخ بستہ میل کے پتھر کو ہاتھوں سے چھوا، پھر بولا...... گھبرانا مت۔ ابھی

بہت آگے چلنا ہے مٹھو میاں......

(۲)

جعفر آباد پہلے ایک دیہی قصبہ تھا، جس نے آہستہ آہستہ ترقی کی اور زمانے کی رفتار کا ساتھ دیتے ہوئے اب شہر کی صورت اختیار کرلی تھی۔ پکی سڑکیں بن گئی تھیں۔ایک چھوٹا سا سرکاری اسپتال کھل گیا تھا۔ایک اسکول بھی تھا۔وہ بوڑھا جسے اب ہم تاجور کے نام سے جانیں گے، جعفر آباد کا سب سے آسودہ حال کاشتکار مانا جاتا ہے۔

تاجور میں ضد بھی ہے اور خبط بھی۔ کسی کی سننا نہیں اور اپنی منوانا عادت ہے۔اس عمر میں بھی اس کی آنکھوں پر چشمہ نہیں چڑھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور گول ہیں۔ تاجور کے یہاں ضروریات کی عام چیزوں کے علاوہ وہ سب کچھ مل جائے گا جو جعفر آباد میں کہیں نہیں ملے گا۔

جہاں سے ناگنی اپنے پھن پر دریا کی موجوں کا بار اٹھاتی ہے، وہیں اس کا عالیشان گھر ہے۔اتنا عالیشان گھر جعفر آباد میں اور کسی کا نہیں۔

ابھی حال ہی کی بات ہے۔ تاجور نے سنا۔ پڑوسی اللہ دین مچھلیاں پکڑنے گیا تھا، لوٹا تو ایک سنہری چڑیا لے آیا۔ چڑیا کے پر سے روشنی پھوٹتی تھی۔ سارے قصبے میں چڑیا کا ذکر پھیلنے لگا۔ تاجور پہلے تو یہ تذکرے سن سن کر پریشان ہوتا رہا، پھر ایک رات گھپ اندھیرے میں وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

رات کے اندھیرے میں کواڑ چڑچڑانے کی آواز ہوئی۔

ایلیا نے اماں عائشہ کو جگایا۔ "ابا تو اندھیرے منہ نکل گئے"۔

"یہیں آس پاس کام سے گئے ہوں گے"۔

اماں مطمئن تھیں۔ ایلیا اماں سے سٹ کر بیٹھ گئی۔ تنے ہوئے جسم میں عمر کی سولہ بہاریں داخل ہوگئی تھیں۔ عائشہ نے ایلیا کے ملائم ہاتھوں کو اپنے کھردرے ہاتھوں میں لیا اور اپنی دھندلی، گڈھے میں دھنسی آنکھیں، اس کی روشن آنکھوں کی

کشتیوں میں اتار کر پھسپھسائی۔

"سچ بتانا، کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہو گئی۔"

"ابا کی ضد تو تم جانتی ہو اماں۔ وہی سنہری چڑیا۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے"۔

"سٹھیا گئے ہیں۔ چلو باہر نکل کر دیکھتی ہوں"۔

باہر رات بہہ رہی تھی اور اندھیرا زمین پر گر رہا تھا۔ ماں بیٹی باہر آئیں۔ پتوں اور مینڈک کی سرسراہٹ کی آواز تو سنائی دی مگر کہیں دور تک کسی آدم زاد کے قدموں کی چاپ نہیں تھی۔

"چل سو جا۔ صبح دیکھا جائے گا......"

ماں بیٹی دونوں ہی بوڑھے کی فطرت سے واقف تھیں۔ تین دن تک بوڑھا تاجور نہیں آیا۔ چوتھے دن، زمین پر آدھا سورج اترنے تک، جب وہ واپس لوٹا تو ہاتھوں میں ایک پنجرا تھا۔ اور پنجرے میں گانے والا ایک طوطا بند تھا۔ تاجور انتہائی مطمئن اور مسرور تھا۔

"نہانے کا بندوبست کرو"۔ اس نے آتے ہی ایلیا کو آواز لگائی۔

پھر غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ داستان سنانے بیٹھ گیا کہ ان دنوں وہ کہاں کہاں گیا۔ ان چار دنوں میں اس کی داڑھی بڑھ گئی تھی۔ بال کثیف ہو رہے تھے۔ ہونٹوں پر خشکی کی پرت جمی تھی۔ مگر چہرے پر آسودگی تھی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی اور گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے عائشہ سے کہا۔

"میری اچھی بیوی، دنیا کی سب سے بھلی عورت۔ بھلا تمہارا شوہر کیسے گوارا کرتا کہ جو چیز دوسروں کے پاس ہے، تم اس سے محروم رہو"۔

عائشہ نے بات کاٹی "اپنی کہو، میں خوش ہوں......اپنے میاں سے بڑھ کر مجھے کوئی شئے عزیز نہیں"

"مگر مجھے چاہیے۔ وہ سب جو میرے پاس ہو، اور کسی کے پاس نہ ہو۔ کیوں ایلیا......"

پھر وہ طوطے کی طرف مڑا...... ''اوہ اللہ کے بندے۔ نبی جی روزی بھیجو...... ذرا اپنی سریلی آواز میں گا کر سنا تو سہی......''

ایلیا کی آنکھوں میں حیرانی سمٹ آئی۔ عائشہ کا دل گنگنا اٹھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مٹھو میاں نے اپنی سرخ چونچ کو حرکت دی۔ اور بہت ہی سریلا گانا اس کے ہونٹوں سے پھوٹ پڑا۔

''او نبی جی روزی بھیجو......

یہاں سب سے اچھے لوگ رہتے ہیں......

سب سے اچھے لوگ سب سے محبت کرتے ہیں......

سب سے اچھے لوگ جنگ سے نفرت کرتے ہیں......

سب سے اچھے لوگ چاہتے ہیں کہ کرۂ ارض کا ایک بھی ٹکڑا کم نہ ہو۔ نہ بم سے نہ دھماکوں سے

سب سے اچھے لوگ چاہتے ہیں کہ ایک ایک آدمی زندہ رہے

کیوں کہ ایک بھی آدمی کم ہوتا ہے

تو سب سے اچھے لوگوں کی برادری میں کمی آجاتی ہے......

او...... نبی جی روزی بھیجو......

یہاں......

یہاں سب سے اچھے لوگ رہتے ہیں''

بوڑھے تاجور نے زور سے مسہری پر ہاتھ مارا۔ ''یہاں سب سے اچھے لوگ رہتے ہیں......''

''مگر طوطا، یہ سب......'' ایلیا کو حیرت تھی۔

''مزے کی بات یہی ہے۔ مگر تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے اس طوطے کو کیسے حاصل کیا؟''

اس نے رازدارانہ طور پر بتانا شروع کیا۔ ان چار دنوں میں میں کہاں کہاں نہیں

بھٹکا۔ شمالی حصے میں جہاں ٹھنڈک زیادہ رہتی ہے، وہاں چلا گیا۔ وہاں کے بارے میں سنا تھا کہ ندیاں جم جاتی ہیں۔ اور اکتوبر سے جنوری کے درمیان کچھ انوکھی چڑیائیں سائبریا سے وہاں جمع ہوتی ہیں۔ بس میں وہیں چلا گیا۔ وہاں مجھے انتانادوس کے بارے میں معلوم ہوا"۔

"انتاناداوس۔ یہ کیانام ہوا"۔

"ہاں جس دن میں پہنچا۔ اسی دن یہ آدمی مرا۔ شاید فرانس کا رہنے والا تھااور اپنی رشتہ داری کسی انتولے فرانس سے بتاتا تھا"۔

"پھر کیاہوا"۔

ایلیااور قریب سمٹ آئی۔ اس کا کسا ہوا جمپر پھڑ پھڑایااور پشت کی چولی کا ہک ذرا سا کھل گیا۔

"ٹھیک سے بیٹھو پاگل لڑکی"۔

بوڑھے کی آنکھوں میں دنیا کی تمام جھیلوں کی چمک، آبشاروں کی تیزی، سمندری لہروں کی گرج، ہلچل اور زندگی اتر آئی تھی۔ انتاناداوس۔ وہ اتنی دور دراز سے چڑیوں کے تعاقب میں آیا۔ اس نے سرما کی انتہائی سرد راتوں میں جب قصبے اور آس پاس کے لوگ لحاف، کمبل اور رضائیوں میں دبکے ہوتے ہیں، جنگل جنگل بھٹکنے کی ہمت کی اور وہ اس انوکھے طوطے کو لے آیا۔ اس اثناء میں اس نے وہاں رہنے والے باشندوں کی بولی بھی سیکھ لی تھی۔ سو اس نے اس گانے والے طوطے کو بھی اپنی انوکھی شاعری سکھانی شروع کی۔ کہتے ہیں یہ طوطا اس سے بھی زیادہ اچھی اور پیاری پیاری شاعری کر سکتا ہے۔

عائشہ اس تمہید سے اکتا گئی۔ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی...... "مگر تم نے اسے کیسے حاصل کیااور اسے خریدا کیسے......؟"

"مزے کی بات"۔ اس نے پھر مسہری پر ایک بڑا سا مکا اچھالا۔ "انتاناداوس کا ایک مفلس اور پھکڑ نوکر تھا۔ ادھر اس کی لاش پڑی تھی اور ادھر اس بندے نے اس نادرونایاب طوطے کی بولی لگانی شروع کی...... "قیمت لگایئے صاحب...... دو روپے......

چار روپے...... ہاں آپ پیچھے کیوں کھڑے ہیں بڑے میاں...... آپ تو اس قصبے کے نہیں لگتے...... گھبرائیے نہیں۔ وہ دیکھیے۔ میرے مالک وہاں آرام کر رہے ہیں۔ میرے ہر دلعزیز مالک انتہائی اللہ والے، پارسا اور نیک اور سب کے دکھوں میں شریک رہتے تھے۔ اور جو کچھ کماتے، سب میں بانٹ دیتے تھے...... اب دیکھیے...... یہ ان کی سخاوت، اور نیکی کا ہی نتیجہ ہے کہ بس جو لباس میرے بدن پر ہے اور جو یہ گھر ہے دو کمروں والا ٹوٹا پھوٹا سا، اس کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں، مالک آرام کر رہے ہیں۔ اب یہ ان کا چہیتا طوطا کس کام کا۔ آگیا جایئے اور بولی لگایئے...... چار روپے......

میں اس کی بولی سے متاثر ہو کر آگے بڑھا اور بولی لگائی۔ دو سو روپے۔

مجمع میں اچانک خاموشی چھا گئی۔ دو سو روپے۔ انتانادوس کے فرمانبردار ملازم کے ہونٹوں کا لعاب اچانک خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی آواز اندر ہی اندر پھنس گئی۔ دو سو روپے۔ کیوں صاحب...... میں نے صحیح سنا ہے نا؟"

"ہاں بالکل صحیح"............ میں جوش میں سب سے آگے آگیا اور بولی بڑھائی۔ پانچ سو روپے۔

انتانادوس کے نوکر نے کچھ فکر سے، کچھ اندیشے سے اور کچھ غیر مطمئن انداز میں مجھے دیکھا۔ "تو صاحب آپ دل سے لگا رہے ہیں نا بولی...... اتنے پیسے آپ کی جیب میں تو ہیں نا...... اب لباس سے کیا ہوتا ہے...... اور صاحب ایسا لگتا ہے...... آپ جیسے دور دراز سے چلتے ہوئے بس اسی نادر و نایاب طوطے کے لیے آئے ہوں۔ پتا نہیں کتنا لمبا سفر طے کیا ہوگا۔ اور سفر میں کیسی کیسی دشواریاں آئی ہوں گی...... تو آگے کسی کو بولی بڑھانی ہے۔ اور آپ جناب...... معاف کیجئے گا...... آپ سے پھر پوچھ رہا ہوں...... اتنے پیسے تو ہیں نا آپ کے پاس...... محترم، معاف کیجئے یہاں ایسے آسودہ حال لوگ نہیں رہتے۔ اس لیے...... بس اسی لیے پوچھ رہا ہوں......"

"ہاں ہیں کیوں نہیں۔ بہت ہیں...... لو یہ دیکھو"۔ میں نے جیب سے ہاتھ نکالا اور پانچ سو کے پھڑ پھڑاتے ہوئے نوٹ اس کے سامنے پھیلا دیئے۔ دیکھو اور گن لو"۔

محترم......اب آپ...... مجھے میری نظر میں شرمندہ کر رہے ہیں ......ہے ......

ہے......وہ اب اپنی آواز بھول گیا تھا اور اس کی آنکھیں...... حریص آنکھیں پانچ سو کے نوٹوں کو گھور رہی تھیں......میں نے چپ چاپ پنجرا اٹھایا، نبی جی روزی بھیجو کا گیت سنا اور چلا آیا—— کیوں، ہے نا مزیدار قصہ ؟"

تاجور نے ایک زور کا ٹھہاکا لگایا، جیسے اس نے کوئی بڑا قلعہ فتح کر لیا ہو۔ پھر وہ اپنے کمرے جانے کے لیے مڑا۔ بوڑھے کے جانے کے بعد عائشہ اور ایلیا دونوں اس پنجرے پر جھک گئیں۔

ایلیا نے پیار سے پچکارا...... "میرے اچھے طوطے۔ کیا تمہیں کوئی دوسرا گیت بھی آتا ہے"۔

"کیوں نہیں......"

"تو پھر سناؤ نا ہم کتنے بے تاب ہو رہے ہیں۔"

طوطے نے فوراً اپنے ٹھور کو حرکت دی اور سریلی آواز میں شروع ہو گیا......

"تم بہت اچھے ماہی گیر ہو......

اور تم صرف پیار بھری لوریاں اور محبت بھری کہانیاں ہی جانتے ہو

اور دیکھو تم اس شکرے کا قصہ کبھی مت سننا جس نے ایک معصوم، بہت معصوم چڑیا کو لہو لہان کر دیا تھا......

اور دیکھو...... جنگ کی باتیں بھی مت سننا کیوں کہ یہ تمہیں نفرت کرنے والا،

دلوں کے بیچ بارود بھرنے والا بناتی ہیں

اور تمہارے معصوم بچوں کو دہشت زدہ کر جاتی ہیں

اور سنو، اپنی حفاظت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں

اس لیے کہ تم انسان ہو

اور سب سے پہلے تمہیں زندہ رہنے کا حق ہے......"

"واہ......واہ" تاجور اندر کمرے میں جاتے جاتے خوشی سے جھوم گیا...... کیوں

ایلیا؟ ذرا سوچو تو کیا مزیدار بات کہی ہے...... اور گانٹھ میں باندھ لو...... کوئی آدمی الگ الگ جزیرہ نہیں ہے...... ہر آدمی کائنات کا ایک ٹکڑا ہے...... مٹی کا ایک ڈھیلا بھی بہہ جائے تو زمین کم ہو جاتی ہے...... ایک بھی آدمی مرتا ہے تو......

اس کی آواز بوجھل ہو گئی تھی...... ایلیا نے محسوس کیا، اس کا دادا اپنے جوان بیٹے یعنی اس کے باپ کو یاد کر کے دکھی ہو گیا ہے...... جو ایک طوفانی رات، دریا میں مچھلیاں پکڑنے گیا تھا۔ پھر واپس نہیں لوٹا۔

''واہ بہت خوب''

بوڑھے تاجور نے اپنے آپ کو بحال کیا۔ ''اور ایلیا، جان لو۔ اب مجھے کوئی غم نہیں ہے...... تم مجھے چھوڑ کر سسرال چلی جاؤ تو کیا ہو گا۔ مزے میں ہم اور طوطے میاں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہیں گے......''

اس نے پھر ایک ٹھہاکا لگایا۔ ایلیا نے صاف محسوس کیا...... اس ٹھہاکے میں کلیجے پر پڑے ہوئے وزنی پتھر کا بھار زیادہ تھا۔ اس لیے ٹھہاکا زیادہ بلند ہوتے ہوتے رہ گیا تھا............

(۳)

طوطے کی شہرت قصبے میں دور تک پھیلی۔ دور دراز سے لوگ اسے دیکھنے کے لیے آئے مگر تاجور نے طوطا دکھانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اس کی ملکیت ہے وہ کسی کو نہیں دکھائے گا......''

ترقی ہوتی ہے...... تو ترقی کی طوفانی ہوا اپنے ساتھ ڈھیر سارے بارود کی کنکر اور پتھر بھی بہا کر لے آتی ہے...... ملک میں ہونے والے دنگوں سے جعفر آباد اب تک محفوظ تھا۔ ہاں باہر سے ہوائیں آتی تھیں...... خبریں آتی تھیں...... کبھی کبھی کوئی دندناتی ہوئی جیپ بھی آتی تھی...... نیتا منسٹر وغیرہ آتے تھے۔ کبھی کبھی وہ گاؤں یا آس پاس کی زمینوں کا بھی معائنہ کرتے دیکھے جاتے۔ ایک بار ایسے ہی نیتا جی کو ٹھہرانے کی

بات اٹھی تھی۔ قصبے میں کوئی گیسٹ ہاؤس تو تھا نہیں، نہ ہی پاس پڑوس کا کوئی گھر ایسا تھا جہاں تھکے ہوئے نیتا جی چار پانچ گھنٹے کاٹ سکتے۔

"ہاں۔ میرے گھر میں کسی بات کی تکلیف نہیں ہو گی"۔

کاشتکار تاجور نے فخر سے اپنا ڈرائنگ روم دکھایا۔ کشادہ اور سجا ہوا۔ پرانے طرز کے صوفے تھے...... دیواروں پر پینٹنگس آویزاں تھیں۔

نیتا جی ٹھاٹھ سے وہاں چار پانچ گھنٹے رہے۔ اور تاجور کو فخر ہو تا رہا کہ جو دوسروں کے پاس نہیں ہے، وہ اس کے پاس ہے۔

فضا خراب ہوئی تو تاجور کو اپنے ہتھیاروں کی فکر ہوئی۔ ابا کے زمانے تک دو۔ دو بندوقیں اس کے پاس تھیں۔ مگر یہ بندوق کس کام کی۔ اس نے سوچا۔ گولیاں اور بارود انسان کا بھلا کب کر سکتی ہیں...... انتانادوس ٹھیک کہتا تھا...... کمال کا شخص تھا۔

ایک رات اچانک ہلچل مچ گئی۔ باہر سے طرح طرح کی افواہیں آ رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو گٹ بن گئے۔ رات میں گولی چلی۔ دھماکہ ہوا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو گئے۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا، دھماکے سے کسی کی جان نہیں گئی، بلکہ یہ دھماکہ گاؤں والوں کو باخبر کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ تاکہ وہ ابھی سے اپنی حفاظت اور آنے والے بد قسمت لمحوں کے لیے، خود کو تیار کر سکیں۔

بوڑھا تاجور گھپ اندھیرے میں طوطے کے پاس آیا۔ اس کی سانس تیز چل رہی تھی......

"تم اپنے رب سے محبت کرتے ہو......" وہ پوچھ رہا تھا......

پھر خود ہی بولا۔ "میں کرتا ہوں...... میں کبھی کبھی رب سے خوف کھاتا ہوں......"

ٹھیک اسی وقت باہر سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔ کچھ لوگ دوڑتے ہوئے اس کے گھر کے پاس سے نکل گئے۔

وہ آنکھیں بند کیے زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔ "میں نے خدا سے محبت کرتا تھا...... اس لیے اس کے بندوں سے بھی محبت کرتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ امن رہے۔ سب طرف

خوشحالی رہے...... پہلے میں بھی سب سے ملتا تھا...... آج کی طرح گوشہ نشیں نہیں تھا۔ میرا باپ بھی ایسا ہی تھا...... سخی اور نرم دل انسان۔ دوسروں کے دکھ پر پسیج جانے والا...... لیکن اسے کیا ملا، اچانک طاعون پھیل گیا۔ انسان کو انسان سے کٹتے ہوئے پہلی بار دیکھا ـــــ میرے باپ کو بھی طاعون ہو گیا۔ تیز بخار۔ منہ سے خون آنے لگا۔ لوگ اس سے ڈرنے لگے، خوف کھانے لگے...... میرے دروازے سے گزرتے ہوئے بھی لوگ ڈرتے تھے...... زندگی بھر جن جن کے لیے وہ خود کو مٹاتا رہا، جس جس کی مدد کی......، آخر وقت میں وہ ان کا چہرہ تک دیکھنے کو ترس گیا۔ کوئی نہیں آیا۔ وہ مر گیا...... اور اچھوتوں کی طرح میں اسے قبرستان کے سناٹے میں دفن کر آیا...... مگر......"

اس نے آنسو پونچھے...... طوطے میاں...... نبی جی روزی ...... بھیجو...... تمہارا گیت...... ارے ذرا پھر سے گاؤ...... وہی...... یہاں سب سے اچھے لوگ رہتے ہیں...... سب سے اچھے لوگ سب سے محبت کرتے ہیں۔ میاں طوطے، اس عقیدہ پر تو زندگیاں قربان کی جاسکتی ہیں......

ذرا سناٹا ہوا تو دبے پاؤں دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا۔ دو دن سے فضا خراب ہوتے ہی شیو مندر کے پاس ایک پولیس چوکی بیٹھ گئی تھی۔ چاروں طرف کا علاقہ سنسنان اور ویران دکھ رہا تھا۔

خدا کی مخلوقات میں انسان کو سب سے بہتر مخلوق ہونے کا درجہ حاصل ہے، مگر اس 'شاندار مخلوق' نے اپنے کارناموں سے سب سے زیادہ بدتر مخلوق ہونے کا ثبوت بہم پہنچادیا ہے۔ بوڑھا تاجور اس دن سچ مچ اداس تھا۔ رات، بھیانک رات شہتیروں پر سو گئی تھی۔ اور اندر کمرے میں مسلسل خوف کی بارش ہو رہی تھی۔ جہاں بوڑھا تاجور بیٹھا تھا، وہیں اس کے طوطے کا پنجرا تھا......

"انساناد وس! کیوں طوطے میاں، تمہیں یاد ہے تمہارا مالک"۔

طوطا پھر سے گانے لگا...... "یہاں سب سے اچھے لوگ رہتے ہیں......

سب سے اچھے لوگ سب سے محبت کرتے ہیں......

سب سے اچھے لوگ جنگ سے نفرت کرتے ہیں......"

اس نے آہ بھری۔ سچ ہے طوطے میاں......وہ انستاناد وس، دور دراز سے آیا ہوا اجنبی آئندہ نسلوں کے لیے بہت کچھ چھوڑ گیا ہے......

آدھی رات کو جیسے پھر سے قیامت ٹوٹ پڑی۔ شور شرابے میں عائشہ اور ایلیا دونوں جاگ گئے طوطے کو دیکھا۔ وہ خوف سے پروں کو سمیٹ رہا تھا۔ تبھی گولی چلی اور باہر کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ اور پھر بہت سے قدموں کی چاپ بھاگتی ہوئی سنائی پڑی۔

اس کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔

وہ اٹھا تو عائشہ نے پلٹ کر خفگی بھری آنکھوں سے اسے گھورا......

"کہاں جاتے ہو؟"

"وہاں دروازے پر۔ کیا تم نے وہ آواز نہیں سنی جیسے بندوق کی پیٹی یا انسانی جسم گرا ہو۔ سنی؟"

"ہاں سنی۔ مگر؟"

"انسان۔ انستاناد وس بھی یہی کہتا تھا اور میرے والد بھی۔ انسان خدا کی ہر دلعزیز مخلوق ہے اور دوسروں سے زیادہ اسے زندہ رہنے کا حق ہے"۔

"وہی انسان۔ جس کی وجہ سے یہ قیامت ٹوٹ پڑی ہے......"

"ممکن ہے یہ خونریزی انسانی ارتقاء کا کوئی عمل ہو۔ ایسا ہر دور میں ہوا ہے مگر وہ اشرف المخلوقات ہے اور اسے زندہ رہنے کا حق حاصل ہے......"

کہتے کہتے وہ ٹھہرا نہیں۔ دروازہ کھولا، اندھیرے میں جھانکا اور ایک دم سے ٹھٹھک گیا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ باہر دروازے پر سچ مچ کوئی پڑا تھا۔ اور اس کی دبی دبی

کراہ نکل رہی تھی۔

"کون ہے" اس نے بلند آواز میں کہا۔

اندھیرے میں جو کوئی بھی گرا پڑا تھا، یہ دبی سسکیاں اسی کے ہونٹوں سے نکل رہی تھیں۔ اس نے دیکھا۔ یہ ایک انسانی جسم تھا۔ کہیں دور کتے بھونک رہے تھے۔ دروازوں کے پٹ بند تھے، کھڑکیوں کے شیشے چڑھے تھے۔ اس پاس کوئی نہیں تھا مگر یہ اشرف مخلوق......

"بٹی ایلیا"۔ اس نے آواز لگائی...... ذرا ادھر کو آنا۔"

یہ کوئی نوجوان تھا۔ عمر تیس کے قریب ہوگی۔ ایلیا اور وہ، دونوں اسے گھسیٹتے ہوئے اندر لے آئے ــــــ اجنبی کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اس نے نبض پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں یہ زندہ ہے اور ہم اسے بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں"۔

ٹھیک اسی وقت طوطے نے اپنے سریلے ٹھور کھولے......

"تم بہت اچھے ماہی گیر ہو......

اور تم صرف پیار بھری لوریاں، اور محبت بھری کہانیاں ہی جانتے ہو......"

نوجوان پھر درد سے کراہا۔ روشنی میں اس نے دیکھا۔ نوجوان کے کندھے کے پاس ڈھیر سا خون جمع تھا۔ اس نے غور سے دیکھا اور بڑبڑایا...... آہ گولی...... بدقسمت بچہ...... پھر وہ ایلیا سے مخاطب ہوا......

"بٹی یہ آزمائش کا وقت ہے۔ دیر مت کر...... جا...... ذرا انگیٹھی پر چاقو گرم کرلے۔ خوب لال کر لینا...... جا ذرا جلدی کرنا بیٹے......"

اسے سب کچھ یاد تھا...... ایک بار اس کا باپ بندوق کی صفائی کر رہا تھا اور بندوق چل گئی تھی۔ گولی باپ کے بازوؤں کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ باپ میں بلا کر جوانمردی تھی۔ اس نے ایسے ہی چاقو گرم کرلیا اور درد کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بوڑھی ماں سے گولی نکلوائی تھی۔

ایلیا چاقو گرم کر کے لے آئی۔ پھر وہ اپنے کام میں جٹ گیا۔ نوجوان کی آنکھیں درد سے پھیل رہی تھیں۔ جسم کے عضو کھنچ رہے تھے، دانت آپس میں بھنچ رہے تھے...... یارب...... اس نے بلا کی ہمت سے کام لیا۔ انسانی بدن...... جو ذرا سی کھرونچ پر دکھ اٹھتا ہے...... ذرا سا کٹ پھٹ جانے پر بلبلا اٹھتا ہے، گرم سرخ چاقو کی دھار کندھے کے پار گزر گئی۔ نوجوان ذبح کیے جانے والے جانور کی طرح چلایا، چھٹپٹایا...... پھر بے ہوش ہو گیا۔ اس نے گولی نکالی۔ عائشہ نے لیپ کا سامان تیار کیا۔ ایک گھنٹے کے بعد نوجوان کو ہوش آیا۔ درد اب اس کا چہرہ بن گیا تھا۔ تکلیف اس کے پور پور سے دکھائی پڑ رہی تھی۔ وہ دانت کٹکٹاتے ہوئے بھی احسان مند تھا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی۔ بوڑھے نے نوجوان کے کندھوں کو چھوا۔

"سو جاؤ۔ صبح ہونے پر باتیں کریں گے۔"

جاتے جاتے وہ ٹھہرا...... اس نے دیکھا...... ایلیا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ننھی ننھی بوندیں تھیں۔ اسے اچھا لگا۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ پھر بولا۔ "ایلیا، تم پسند کرو تو نوجوان کے پاس رہ جاؤ۔ ممکن ہے رات کے وقت اسے تمہاری ضرورت محسوس ہو"۔

(۴)

پو پھٹنے سے پہلے ہی اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ نوجوان سے پہلے اس نے محلے والوں کو خبر دینا ضروری سمجھا۔ وہ باہر نکل آیا۔ سورج نکلنے میں ابھی دیر تھی۔ ہلکا ہلکا اجالا پھیل چکا تھا۔ آسمان چڑیوں کی چہچہاہٹ سے خالی تھا۔ خدا را، ایسے ماحول میں چڑیاں بھی کہاں چلی جاتی ہیں...... شاید انہیں بھی بارود اور دھماکوں سے ڈر لگتا ہے۔ وہ باہر آیا تو کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ پولیس کے دو ایک آدمی بھی تھے۔ اسے دیکھ کر کچھ لوگوں نے منہ بنایا۔ کچھ لوگوں نے بادل ناخواستہ اسے سلام کیا۔ وہ بڑھتا رہا۔ پولیس والے باتیں کر رہے تھے۔

"تو جو آدمی تھا۔ وہ کہاں گیا"۔

"وہ یہیں تھا۔ یہیں گرا تھا"۔

"پھر کیا۔ اسے زمین نگل گئی"۔

اسے خوف محسوس ہوا۔ ظاہر تھا، اجنبی کی باتیں چل رہی تھیں۔ اسے معلوم پڑا کہ کل خوف کے ماحول کی وجہ سے، جو چوکی بیٹھی تھی، اس کا افسر بیماری کا بہانہ بنا کر چلا گیا تھا، جو کانسٹبل تھا وہ خوف سے چوکی میں دبکا رہا۔ محلے والوں کا خیال تھا کہ مشتبہ آدمی انتہائی خطرناک تھا اور باہر کی آگ اس محلے میں بھی لگانا چاہتا تھا۔

"انتہائی خطرناک آدمی۔ مشتبہ......"

اس نے گردن کو جھٹک دیا۔

ممکن ہے، کچھ لوگوں کو اس پر بھی شک رہا ہو۔ مگر کچھ اس کے اثر رسوخ، کچھ اس کے خبطی ہونے کی وجہ سے، کسی نے بھی اس سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ کچھ دیر بعد وہ گھر واپس آ گیا۔ لیکن دماغ میں اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ اگر وہ آدمی ان کی نظر میں مشکوک ہے تو وہ اس کے گھر بھی آ سکتے ہیں...... جو ہاتھ رات کی تاریکی میں نوجوان پر گولی چلا سکتے ہیں وہ دن کے اجالے میں اسے ختم بھی تو کر سکتے ہیں—— انسان...... سب مخلوق میں اشرف ہے......"

کمرے میں بتی اب تک جل رہی تھی۔ ایلیا میز پر سر رکھے سو گئی تھی۔ اور اس کا ایک ہاتھ انجانے میں نوجوان کے سینے کے پاس چلا گیا تھا۔ وہ بے خبری کی نیند سو رہی تھی۔ اس نے جوتے بجائے۔ اپنے ہونے کا احساس کرایا۔ نوجوان نے آنکھیں کھول دیں۔ ایلیا بھی چونک پڑی اور جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا۔

اس نے نوجوان کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا......

نوجوان کے ہونٹوں پر درد کے باوجود مسکراہٹ تھی۔ وہ ایلیا کو بڑی میٹھی اور ممنون نگاہوں سے دیکھ رہا تھا......

ایلیا نے سر جھکا لیا۔ اس نے غور سے پہلی بار اپنی پوتی کو دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی، پتہ بھی نہ چلا، جوان عمر کی کونپلیں کب کیسے ایلیا کے بدن سے پھوٹ پڑی تھیں......

"کیسے ہو"۔

"اب اچھا ہوں...... "نوجوان کے ہونٹوں پر صحت مند مسکراہٹ تھی۔

"لوگ تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ انہوں نے دیکھ لیا تو وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔۔۔۔۔" اس نے دوٹوک کہا۔

نوجوان نے پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ شکریے کے الفاظ منہ سے نکالنے چاہے، اس نے روک دیا۔

"موت ہر انسان کے لیے ہے۔ تمہارے لیے بھی۔ میرے لیے بھی۔ ایک وقت آتا ہے اور ہم مر جاتے ہیں۔ تم بھی مر جاتے۔۔۔۔۔ نہیں میرے عزیز...... یوں ممنون نگاہوں سے مجھے مت دیکھو۔ میں مسیحا نہیں ہوں۔ نہ بننا چاہتا ہوں۔ ہاں میرے باپ نے بہت پہلے یہ کوشش ضرور کی تھی۔ مگر اسے کیا ملا۔ اس کی موت پر ایک چیونٹی تک ملنے نہیں آئی۔ مگر میں جانتا ہوں، میرے باپ کے مرنے سے اس براعظم میں ایک آدمی کم ہوا ہے...... ایک اچھا آدمی۔ تم بھی شکل سے اچھے آدمی لگتے ہو۔ جب کہ صرف آدمی ہونا ہی اپنے آپ میں بہت اہم ہے۔ اور ہر آدمی کو زندہ رہنے کا حق ہے......"

نوجوان نے اس کی بات بہت دھیان سے سنی۔ پھر اٹھنے کی کوشش کی۔

"نہیں لیٹے رہو"۔ اس نے حکم دیا۔ فوراً ہی اس کا لہجہ کٹھور ہو گیا۔ "لیکن تمہیں جلد ہی یہاں سے جانا ہوگا۔ اس لیے کہ تمہیں وہ لوگ تلاش کر رہے ہیں۔۔۔۔۔"

نوجوان نے پہلی بار لب کھولے۔ "کیا آپ کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں کہ میں کون ہوں۔ جب کہ آپ کے مطابق ان کی نظر میں، میں مشتبہ ہوں۔ اور وہ مجھے قتل کرنے کا سوچ رہے ہیں...... ظاہر ہے، ایسا آدمی خطرناک ہوا"۔

"تمہارے ساتھ تمہارا کرم ہے۔ یہ بھی میرے باپ نے سکھایا تھا۔ تم مجھے مار دو گے، تب بھی اپنے کرم کے ساتھ جتنی آسودگی اور زندگی تمہیں میسر ہے، جیو گے ہی۔ ہاں ایک آدمی۔ اسی براعظم سے ایک آدمی کم ہو جائے گا......" اس نے گردن کو

جھٹکا دیا "اور میں جانتا ہوں۔ میں اچھا بھی ہوں اور نیک بھی......"

"شکریہ...... بہت بہت شکریہ...... تو سنیے۔ میں کوئی چور اچکا، بدمعاش نہیں ہو......" نوجوان اس بار واقعی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "درد ہے مگر آپ کے لیپ نے فائدہ پہنچایا ہے۔"

"اتفاق سے۔ بد قسمتی کہہ لیجئے"۔ ٹھیک اسی وقت ایلیا آئی۔ اس نے بات جاری رکھی...... "خوش قسمتی بھی ہو سکتی ہے...... میں گھر جانے کو نکلا تھا...... پولیس نے بتایا تھا کہ ادھر دنگے بھڑک اٹھے ہیں...... ادھر سے نکل جاؤں۔ چاروں طرف لوگ ایک دوسرے کو مار کاٹ رہے تھے میں نے سمت بدل دی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اور میں سمت گڑبڑا گیا۔ تبھی آپ کے گاؤں پر نظر پڑی۔ یہاں بھی ماحول گرم تھا۔ کچھ لوگوں نے میری گاڑی پر حملہ کیا۔ میں بھاگ نکلا۔ صرف اتنا دیکھ سکا...... میری گاڑی پر اینٹیں اور پتھر برس رہے تھے...... کچھ لوگ میرے پیچھے دوڑ رہے تھے مگر میں سرپٹ بھاگ رہا تھا......"

نوجوان نے اس کی طرف دیکھا...... ایک پل کو موت میرے سامنے تھی...... اور مجھے خیال آیا، لوگ ایک مختصر سی زندگی کے لیے اتنی زیبائش و آرائش کیوں کرتے ہیں...... میں مر جاؤں گا تو اس موت میں بھی تکلیف ہو گی۔ مگر موت کی ہر جھپکی ایک ہی طرح کی ہوتی ہے یعنی موت پتہ بھی نہیں چلنے دیتی اور سانس سے رشتہ ختم کر دیتی ہے......"

بوڑھے نے گردن ہلائی۔ انسان سب سے افضل ہے...... پھر اس نے دیکھا...... ایلیا مخمور نگاہوں سے نوجوان کو دیکھ رہی تھی۔

بوڑھا پھر مسکرایا اور نوجوان کی طرف گھوما۔ "اچھا ایک بات سنو اچھے انسان۔ تم اچھے انسان بنے رہ سکتے ہو...... اور تمہیں اس کے لیے کوشش بھی کرتے رہنا چاہیے۔"

پھر وہ گھوما اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

نوجوان کے گم ہونے کی خبر عام ہو چکی تھی۔ یہ سب کے لیے حیرت کی بات تھی کہ نوجوان جسے گولی لگی اور جسے سب نے گرتے ہوئے زمین پر دیکھا، وہ کہاں چلا گیا۔ آس پاس کہیں خون کے دھبے بھی نہیں تھے، جو اس کا سراغ لگانے میں مدد کر سکتے......

وہ باہر نکلا تو لوگ اب بھی جھنڈ میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں فضل بھی تھا۔ کرتا پائجامہ پہنے اور سر پر ٹوپی چڑھائے۔ فضل اکثر کسی نہ کسی کام سے اس کے پاس آیا کرتا تھا۔ یہ واحد لڑکا تھا جو کسی نہ کسی بہانے اس کے گھر آجاتا تھا۔ اس کی خواہش رہتی تھی کہ وہ گھڑی بھر کے لیے ایلیا کو دیکھ لے۔ بس اتنے سے اسے سکون مل جاتا اور وہ واپس لوٹ جاتا۔

فضل اس کے پاس آکر ٹھہر گیا۔

بوڑھے کو دھچکا سا لگا۔ "خیریت تو ہے میاں؟"

"نہیں چاچا، ان کی نظر اب ہمارے گاؤں پر ہے۔ آپ نے سنا ہوگا۔ ایک مشتبہ آدمی......لوگوں کا شک ہے کہ وہ آپ کے گھر میں چھپا ہے"۔

"میرے گھر میں"؟ بوڑھے تاجور کے چہرے پر معصومیت کا نور تھا۔ "وہ آجاتا تو شاید میں پناہ دے بھی دیتا......اور میاں فضل...... بتاؤ تو سہی، ہم یہ کیسے مان لیتے ہیں کہ فلاں دشمن ہے یا غلط آدمی ہے...... یا گنہگار ہے، سب خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں......اور اسکی مخلوق...... انسان سب سے افضل ہے...... ہمیں انسان بنے رہنا چاہیے اور اس کے لیے لگاتار سیکھتے رہنے کے عمل سے گزرنا چاہیے۔ ارے ہاں، تم بہت دنوں سے آئے نہیں...... فصل تو اچھی ہوئی نا......؟"

وہ واپس لوٹا تو اس نے دیکھا، ایلیا کسمائی ہوئی حالت میں نوجوان کے بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کا ہاتھ نوجوان کے ہاتھ میں تھا۔ آہٹ ہوتے ہی ایلیا نے ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ یکلخت اٹھ کھڑی ہوئی اور حیا کے بوجھ سے پھر ٹھہری نہیں۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا

نوجوان کے پاس آیا۔ نوجوان کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

پھر اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"تمہیں آج رات یہ گھر چھوڑ دینا ہوگا۔ تمہاری عافیت کے لیے یہ بہت ضروری ہے......"

اس کے رکتے ہی، اس کے کانوں میں ہچکی کی آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایلیا تھی...... جو شاید ان کی گفتگو سننے کے لیے ٹھر گئی تھی۔

وہ ایلیا کے پاس آکر ٹھہرا۔ بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ سینے سے لگایا۔ "میری جان ایلیا...... مختصر سی زندگی...... گوشت کا ننھا سا ڈھیر اور اتنی افتاد۔ باہر لوگ اسے جان سے مارنے کے لیے تلاش کر رہے ہیں اور تو اس کی جان کے لیے رو رہی ہے...... دنیا سچ مچ بہت خوبصورت ہے...... اور دنیا انسانوں کے لیے ہی بنی ہے۔ کہ اس کی خوبصورتی کو دیکھ سکیں۔ محسوس کر سکیں مگر افسوس۔

(۶)

اس رات اندھیرے میں نوجوان چلا گیا۔

اور ایلیا دیر تک روتی رہی۔ اس میں ایلیا میں دو نسل کا فاصلہ تھا۔ تاہم اس نے ایلیا کو تسلی دی۔ سینے سے لگایا...... سارا قصور انسانی جسم کا ہے ایلیا...... یہی جسم انسان کو انسان سے جوڑتا ہے...... یہ جسم عورت کا ہے تو ایک دوسرے انسان کا جسم کمہار کے چاک کی طرح ڈھال لیتا ہے...... یہ جسم ہے جو دوسروں کے لیے کشش کا سامان ہے ...... کچھ اس کشش کو ختم کرنا چاہتے ہیں...... تو خوش قسمت ہے کہ اس کشش کو زندہ اور بیدار دیکھنا چاہتی ہے......

دوسرے دن پھر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اجنبی کی موجودگی کا شک اب تک باقی تھا۔ ہمت اور حوصلہ جٹا کر قصبے والے اس کے گھر آدھمکے۔ آنے والوں میں فضل بھی شامل تھا۔ سارے گھر کی تلاشی لی گئی پھر سب اپنا منہ لے کر واپس لوٹ گئے۔

دن گزرتے گئے۔ اس واقعے کو گزرے ایک ماہ ہو گیا۔ فضا تھوڑی سی سازگار ہوئی۔ رونق بحال ہوئی۔ وہی دلاویز صبح...... وہی معطر شام وہی بھینی بھینی رات...... وہی نیلا آسمان اور وہی دنیا...... جسے دیکھنے سمجھنے کے اعتبار سے انسان کو اشرف کہا گیا ہے۔

مگر اچانک ایک روز موسم خزاں کا ایک جھونکا آیا۔ بوڑھا وجود سن سے رہ گیا۔ اس دن صبح صبح اس نے دیکھا...... طوطے کے سر میں اداسی کی گرد جمی تھی۔ آواز وہی تھی گیت وہی تھا...... سب سے اچھے لوگ...... سب سے محبت کرتے ہیں...... اس نے سنا۔ اس نے آسمان دیکھا۔ آسمان پر بادلوں کی چھب ایسی ہو رہی تھی جسے افق پر سرخیاں پھیل گئی ہوں۔ اس نے طوطے کو سنا جیسے درد کی پھوار پڑ رہی ہو......

پھر اس نے وہی دبی دبی ہچکیاں سنیں جیسے ٹھیک آج سے کچھ ماہ قبل سنی تھیں۔ جب اس نے نوجوان کو یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ سنایا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا ایلیا کے پاس آیا۔

ایلیا منہ ڈھانپ کر رو پڑی۔

وہ درد سے چھٹپٹایا...... آہ انسان...... کیا اس اچھے انسان سے کوئی چوک ہو گئی بیٹی"۔

ایلیا نے اقرار میں گردن ہلائی۔

"آہ...... نادان لڑکی۔" وہ درد سے تڑپ گیا۔ "تجھے کب پتہ چلا؟"

ایلیا کی ہچکیاں کچھ اور تیز ہو گئیں۔

"گھبرا مت...... یہ جسم...... سارا قصور بس اس جسم کا ہے۔ کوئی پتہ ٹھکانا......؟

اسے دوبارہ دھکا پہنچا۔ نوجوان کا پتہ ٹھکانا تو کسی نے لیا ہی نہیں۔ نہ اس نے ایلیا کو پتہ بتایا...... "ہاں جب ہم انسانی رسم ورواج کی پیروی کیے بغیر ایک جسم سے دوسرا جسم ڈھالتے ہیں تو آفت آتی ہے بیٹی...... مگر گھبرا مت...... ہم انسان ہیں...... اشرف المخلوقات......"

ایلیا رو رہی تھی۔ ایسے رو رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو ...... "نہیں ...... ہم سب

سے اچھے انسان نہیں ہیں ...... ہم کمینے اور ذلیل ہیں...... ہم بیمار ہیں اور انتہائی خود غرض"۔

کچھ دن گزرے۔ فضا پھر گرد آلود ہوئی۔

اسحاق میاں جعفر آباد کے مکھیا تھے۔ سیاست کے اکھاڑے کے پہلوان۔ مگر تاجور سے خار کھائے رہتے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ کب کا تاجور کو اس قصبہ سے نکال چکے ہوتے۔ مگر تاجور ایک بے ضرر بوڑھا۔ اب انہیں اس بوڑھے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ہتھیاروں کے لیے۔

"ہتھیار چاہئیں اور بہت سے ــــــ بغیر ہتھیار کے دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے......"

اس وقت اسحاق کے گھر کے باہر کچے آنگن میں محلے کے کافی لوگ جمع تھے۔

سدی بھائی نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ "حفاظت کے لیے ہتھیار ضروری ہیں مگر ہتھیار ہمارے پاس نہیں ہیں"۔

اسحاق بھائی نے کہا۔ "حفاظت کے لیے سب سے ضرور چیز ہتھیار ہیں۔ اور سوچنا ہے ہتھیار کہاں سے آئیں گے"۔

"کچھ اسلحے تو ہمارے پاس ہیں اور کچھ آپ لوگوں سے مل جائیں گے"۔

سدی بھائی نے اطلاع دی۔ "کچھ ہتھیار اس خبطی بوڑھے کے پاس بھی ہیں"۔

آخر میں فیصلہ ہو گیا۔ بوڑھے تاجور سے زبردستی ہتھیار لیے جائیں گے ــــــ آخر جعفر آباد کے امن کا سوال ہے۔

(۷)

اچھا انسان۔ بوڑھا اپنی بات پر قائم تھا۔ بھول انسان سے نہیں ہو گی تو کیا فرشتوں سے ہو گی......اسے تسلی تھی۔ مگر ماحول......اسے پتہ تھا، زلزلے کا جھٹکا ایک بار آئے تو بار بار جھٹکوں کے راستے کھول دیتا ہے۔

اس کی ضد اس کے ساتھ تھی...... وہی سب سے مختلف نظر آنے کی ضد۔ چھوٹی چھوٹی بہت سی چیزیں۔ مگر یہاں تو بساط ہی غلط بچھ گئی تھی...... جو چیز اس سے مانگی جا رہی تھی، وہ بہت سے گھروں میں تھی...... اور وہ دروازہ پر کھڑے لوگوں کی باتیں سن رہا تھا......

"اسلحہ چاہئیں۔ ہمیں پتہ چلا ہے آپ کے پاس کافی اسلحے موجود ہیں"۔

"آڑے وقت ہمارے کام نہیں آئیں گے تو پھر کب آئیں گے"۔

"تاجور صاحب" اسحاق میاں نے شفاف کرتے پائجامے میں، اپنی سیاست کو ہوا دی۔ "کتنے برس گزر گئے۔ آپ ہم سے الگ رہے۔ ہم میں رہ کر بھی آپ ہم سے کٹ گئے تھے۔ رشتہ داری میں آنا نہ جانا۔ نہ سکھ میں نہ دکھ میں۔ یہی تو ایک موقع آیا ہے دل کو دل سے جوڑنے کا۔ انکار مت کیجئے گا"۔

"اسلحے۔" بوڑھا تاجور بہت معصوم لگ رہا تھا...... "اسلحے میرے پاس اب کہاں ہیں۔ وہ خاندانی اسلحے تو کب کے ضائع ہو گئے"۔

دلوں کو جوڑنے والے قدم واپس لوٹ گئے۔ جس راستے سے پلٹے وہاں خلیج کی لکیر چھوڑ گئے۔ بوڑھا مطمئن تھا...... مگر دماغ پر تھاپ پڑتی رہی۔ اسلحے...... اسلحے کیوں چاہئیں...... اسلحوں کا زوال کیوں نہیں آتا۔ اسلحے ختم کیوں نہیں ہو جاتے۔ مختصر سی زندگی اور خوبصورت سی کائنات اور سب سے اشرف مخلوق...... اسے اپنے اسلحے ختم کر دینے چاہئیں۔

وہ ابا والے کمرے میں آیا جہاں وہ بہت کم جایا کرتا تھا...... یوں بھی تین افراد پر مشتمل اس خاندان کو زیادہ کمروں کی ضرورت ہی کہاں پیش آتی تھی۔ اس نے دیکھا۔ دیوار پر گرد میں ڈوبی بندوق لٹک رہی تھی۔ کچھ اسلحے پرانے صندوق میں بند تھے۔ صندوق میں اب تک گولیوں کی پیٹی موجود تھی۔ بندوق پر کافی گرد پڑ چکی تھی......

"آہ...... نازک سا جسم اور یہی گولیاں ہم اس جسم میں اتار دیتے ہیں۔ جسے بچانے کے لیے ماں کتنی ریاضت کرتی ہے۔ اور بڑا ہونے پر ہم لگاتار اسے بچائے رکھنے کی

کوشش کرتے رہتے ہیں"۔

زلزلے کے چھوٹے چھوٹے جھٹکے تو آتے رہے لیکن اس رات اچانک عمارتوں کو منہدم کرنے والا زلزلہ آگیا۔ جس وقت چیخ پکار سے آسمان گونج اٹھا، اس وقت اس کا طوطا اپنی سریلی آواز میں گا رہا تھا......

"ہم کتنی بے پناہ اور مسرت زندگی گزارتے ہیں۔
پھر ہم بیمار ہو جاتے ہیں......
پھر ہم اپنی فصلوں کو روند دیتے ہیں
پھر بھی ہم فاتح کہلاتے ہیں
اس لیے کہ ہم انسان ہوتے ہیں
اور فاتح کہلانے کا حق انسان کو ہی ہے"۔

بوڑھے کا ہاتھ پنجرے پر سخت ہوا۔ آہ اناتادوس...... شاید وہ بے رحم وقت آگیا......"

اس نے پنجرا مضبوطی سے تھاما۔ صندوق سے پرانی بندوق نکالی۔ پیٹ سے چمڑے کی پیٹی باندھی۔ اس نے دیکھا دروازے پر عائشہ اور ایلیا کھڑی تھیں۔ چہرہ زرد۔ رنگت اڑی ہوئی۔

ٹھیک اسی لمحے دروازہ پر تھاپ پڑی اور آواز ہوئی۔

"توڑدو"

اس نے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ بندوق کا وزن زیادہ تھا۔ ہاتھوں میں پنجرا تھاما۔ ایک ہاتھ بڑھا کر سنکنی کھولی۔ دروازہ کھل گیا۔ دروازے پر آنکھیں چڑھائے فضل اور اسحاق سمیت کئی لوگ کھڑے تھے۔

"دشمن آرہے ہیں۔ خبر ملی ہے۔ کیا اب بھی آپ ہمیں اسلحہ نہیں دیں گے؟"

فضل نے اشارہ کیا۔ "وہ رہا اسلحہ کندھے پر"۔

اس نے پنجرا سنبھالا اور بندوق ان کی طرف تان دی۔
"خبردار، کوئی آگے نہ بڑھے"۔
اسحاق نے پلٹ کر قصبہ والوں کی طرف دیکھا۔ "دشمن...... دشمن تو اپنے گھر میں ہیں۔"
مگر بوڑھا جانتا تھا کہ ہتھیار تو محض اس نے اپنی حفاظت، اپنے بچاؤ کے لیے اٹھایا ہے۔ جو چیز اس کی دی ہوئی نہیں ہے، اسے لینے کا حق ہی اسے کیا ہے۔
پھر تو غضب ہو گیا۔ اسحاق نے زور سے آواز لگائی۔
"اس سے پہلے کے دشمن حملہ آور ہو۔ اس کے گھر پر ٹوٹ پڑو"۔
بوڑھے کا ہاتھ لبلبی پر کانپ کر رہ گیا۔ لوگ گھر کے اندر دوڑ پڑے۔ اس کے سارے بدن میں تیز کپکپاہٹ دوڑ گئی۔ اس نے بندوق مضبوطی سے سنبھال لی۔ گرتے گرتے اس نے ایک آدمی کے سر پر بندوق کے کنڈے سے وار کیا۔ اس کے سنبھلنے تک اس نے پھر پنجرا تھام لیا۔ بدقسمت پرندہ...... بھلا یہ اپنی حفاظت کیسے کر پائے گا۔
"ایلیا۔ عائشہ۔ اپنی حفاظت خود کرو۔ بچو ان لوگوں سے"۔
وہ گلا پھاڑ کر چلانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر منہ سے آواز نہیں نکل سکی۔ ہاں بدلے میں ایک گھگھیائی ہوئی آواز سنائی پڑی۔ وہ اس آواز کو بخوبی پہچانتا تھا۔
اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو پیروں کی ہمت جواب دے گئی۔
اس نے بے زبان ہوتی آنکھوں سے دیکھا۔ فضل خوف سے سہمی ہوئی ایلیا کی طرف بڑھ رہا تھا۔
اس کے ہاتھ کی گرفت لبلبی پر سخت ہو گئی...... آنکھیں بند کیں اور اس نے گولی چلا دی۔ ایک...... دو...... تین......

(۸)

کافی کہاسا تھا۔ ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ آگے ہاتھ کو ہاتھ

نہیں سجھائی دیتا تھا۔ بوڑھے نے پنجرا اٹھایا۔ دیکھنے کی کوشش کی، کہ آگے بڑھ سکتا ہے یا نہیں...... پھر محسوس کیا...... تاحد نظر اندھیرا ہے...... مگر آنکھوں کی بساط تک وہ چل سکتا ہے۔ اور جیسے جیسے وہ چلتا ہے، ویسے ویسے روشنی کی ایک موہوم سی کرن اس کے ساتھ چلتی ہے......

اس نے طوطے سے کہا...... "دھند بہت ہے۔ تاہم ہمیں آگے چلنے کی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔"

OO

ایوان اردو ، دسمبر ۱۹۹۵ء

سپنے بیچنے والا مسیتا

اور اس کا ایک دن کا جھونپڑا

(۱)

بڑے شہروں میں جھگی جھونپڑیوں کی نگرانی کے لیے الگ سے ایک محکمہ ہوتا ہے۔ میں اس محکمے سے جڑا ہوں۔ چونکہ یہاں محکمے کی تفصیل بتانا ضروری نہیں، اس لیے اس سے قطع نظر اصل بات پر آتا ہوں۔ ادھر جھگی جھونپڑیوں میں آگ لگنے کے واقعات کچھ زیادہ ہو رہے تھے اور اک اک بار میں ہزار ہزار جھونپڑیاں جل کر راکھ ہو جاتیں۔ خاص کر گرمی کے موسم میں تو شہر میں پتہ نہیں کتنے ہی مقامات پر اس طرح کے حادثے ہو جاتے۔ جب کبھی ایسی جگہوں پر میرا جانا ہوتا، ان جھگی والوں کی زندگی کے کتنے ہی روشن پہلو بھی میرے سامنے کھل جاتے۔ جھگیاں جلتیں، دوبارہ بستیں یا وارننگ دے کر بلڈوزر چلا کر اجاڑ دی جاتیں۔ بے حیا پودوں کی طرح یہ مخلوق پھر کسی بنجر جگہ کو اپنا آشیانہ بنا لیتی۔ اب تو بہت سی جھگیوں میں باضابطہ لالٹین اور دیے کی جگہ لائٹ کا انتظام بھی تھا۔ انکوائری کی غرض سے کم یوں سمجھئے ان جھونپڑیوں میں رہنے والی قوم سے میری زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ کیسے رہتے ہیں۔ بغیر کسی خوف کے

کس طرح جھونپڑی کی لکڑی یا پھوس کا خیال کیے بغیر آرام سے چولہا سلگا کر کھانا بناتے ہیں۔ عورتیں مزے سے لیپ پوت کر مٹی کی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنادیتی ہیں۔ جیسے یہ ان کی خریدی گئی زمین ہو۔ پلنگ پر بیٹھے ہوئے مرد جلتی ہوئی بیڑی یا ماچس، بغیر کچھ سوچے کہیں بھی پھینک سکتے ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کی معمولی چنگاری آگ نہ پکڑ لے اور طوفان نہ کھڑا ہو جائے۔

ایسی ہی ایک چھوٹی سی انکوائری میں، میں گیا ہوا تھا۔ اس جگہ پر کم و بیش پانچ چھ سو چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں جھونپڑی میں رہنے والے مردوں سے باتیں کرتا۔ کسی کی جھونپڑی میں جھانک کر دیکھتا۔ تجسّس کی باریک سے باریک باتوں میں بھی میری دلچسپی حد سے زیادہ تھی۔ تبھی ایک انوکھی بات ہوئی۔ ایک جھونپڑی سے ایک بوڑھا نکلا۔ عمر ۸۰ برس کے آس پاس۔ گنجا سر، چوڑا چہرہ، آنکھیں چندھی مگر بلا کی گہری اور زمانے کے اتار چڑھاؤ کو ظاہر کرنے والی۔ دائیں گال پر بڑا سامسّہ۔ میانہ سے تھوڑا سا قد اونچا۔ ایک پھٹا سا تہبند اور گندا سا کرتا پہنے، پاؤں میں ایک ٹوٹی ہوئی چپل، کمر سے تھوڑا جھکا ہوا۔ بوڑھے کی نظر اچانک میری طرف اٹھی۔ لنگڑاتا ہوا وہ ایک طرف بڑھا اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ اچانک میرے ذہن میں برسوں پرانا ایک نام کوندا...... مسیتا......

میں تیزی سے بوڑھے کی طرف لپکا۔

''تم مسیتا ہو نا......؟''

بدلے میں بوڑھے کے منھ سے عجب سی گھڑگھڑانے کی آواز نکلی۔ اس کے دونوں ہاتھ فرط جوش سے پھڑپھڑا اٹھے۔ گھڑگھڑانے کی آواز سے میں نے سمجھا کہ بوڑھے نے حامی بھر لی ہے۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گیا اور اپنی چندھیائی آنکھوں سے غور سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ لیکن اتنے برسوں بعد اسے میری آنکھوں میں پڑھنے کے لیے ملتا بھی تو کیا ملتا۔ اس سے قطع نظر میری آنکھوں میں ایک چھوٹا سا گاؤں رینگ گیا...... اوماپور...... اس وقت میں بچہ تھا اور مسیتا عمر کے ادھیڑپن کی ناؤ کھے رہا

تھا۔ اب میں ادھیڑ ہونے کو آیا ہوں اور مسیتا اپنی عمر کی آخری منزل طے کر رہا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے زندگی میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس طرح اچانک اس شہر میں مسیتا سے ان جھگی جھونپڑیوں میں میری ملاقات ہو سکتی ہے۔

(۲)

اس وقت مسیتا کو لے کر گاؤں میں کتنی کتنی اور کیسی کیسی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو وہ مجھے لوک کتھاؤں کا ہیرو معلوم ہوتا ہے۔ بچپن کے سنے سنائے قصے ایک دم سے اسے دیکھتے ہوئے میری آنکھوں میں زندہ ہو گئے تھے۔

''مسیتا۔ جا۔ جا۔ تیری لاجو کی ڈولی گئی......

''لاجو تیرے لیے پوکھر میں جھن جھنا لے کر گئی ہے مسیتے......

''مسیتے! تجھے پنگھٹ پہ بلایا ہے لاجو نے۔''

گاؤں کی عورتیں چھیڑتیں اور مسیتا فوراً سچ پر ایمان لا کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ اس وقت وہ کمسن تھا۔ دائیں پیر میں ہلکا سا لنگ تھا۔ آنکھیں غضب کی چمک دار واقع ہوئی تھیں۔ اس وقت اس کے بال بڑے بڑے اور جھبرے تھے۔ مسکراتا تو دونوں گال پھاڑ کر اور بتیسی نکال کر۔ دونوں ہاتھوں کو جھٹک کر وہ تیز دوڑ لگاتا۔ عورتیں خوب ہنستیں اور اسے بھاگتا دیکھ کر گاتیں۔

''راجہ جی کی چھوکری پہ نیت ہے پھسلی
لنگڑے مسیتا کی قسمت ہے لنگڑی''

راجہ جی کوئی راجہ جی نہیں تھے۔ لیکن گاؤں کے سب سے بڑے آدمی تھے۔ ان کی ایک ہی لڑکی تھی لاجو......راجہ جی کے پاس گاؤں کے کتنے ہی غریب کسانوں کی زمین پٹے پر پڑی تھی۔ راجہ جی تھے بھی طبیعت کے سخت آدمی اور کہاں لاجو نازو نخرے میں پلی ہوئی لڑکی۔ ہمیشہ نیا چمچماتا اور ایسا لباس پہنتی جو گاؤں والوں نے کبھی نہ دیکھا ہو۔

تتلیوں کی طرح اڑتی پھرتی اور مسیتا تھا کہ لاجو پر عاشق۔ جی جان سے صدقے۔ لاجو کا ایک بڑا بھائی بھی تھا۔ جو مسیتا کے قصے سن سن کر اس کا دشمن بن گیا تھا۔

مسیتا کا باپ مشکیزہ سے پانی پلانے کا دھندہ کرتا تھا۔ یہ اس کا خاندانی پیشہ تھا۔ اس وقت وہاں پر نل اور کنویں نہیں ہوتے تھے۔ صرف ایک بڑی سی چرخی والا کنواں راجہ جی کے احاطے میں تھا۔ مسیتا کا باپ مشکیزہ میں پانی لا لا کر گھر گھر پہنچاتا اور اسی سے اپنی روزی کماتا۔ پتہ نہیں کب کیسے کہاں مسیتا نے لاجو کو دیکھ لیا۔ اب وہ جہاں جہاں جاتی، مسیتا پیچھے پیچھے جاتا۔ دور دور سے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا۔ لاجو کی سہیلیاں جب کبھی اسے مسیتا کے بارے میں بتاتیں تب بھی لاجو چپ ہی رہتی۔ اتنے بڑے گھر کی لڑکی اور کہاں مسیتا جیسا ان پڑھ، گنوار، جاہل اور اس پر سے پیر میں ہلکا سا لنگ۔ دائیں گال پر بڑا سا مسہ۔ وہ شکل سے بھی بے وقوف معلوم ہوتا۔ لیکن لاجو نے کبھی مسیتا کی موجودگی کا برا نہیں مانا نہ ہی سہیلیوں کو کبھی ٹوکا ـــــ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ پوکھر پر لاجو اور اس کی سہیلیاں بیٹھی ہیں اور مسیتا اچانک کہیں سے نکل کر آجاتا اور انہیں دیکھ کر کھیس نپوڑنے لگتا۔ سہلیاں تو غصہ ہو جاتیں مگر لاجو ہنس پڑتی اور مسیتا خوش ہو جاتا۔

"کھوں کھوں......"

اس وقت تک اس کی آواز صاف نہیں تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں کو پیٹ پیٹ کر خوشی کا اظہار کرتا۔ اگر بہت خوش ہوتا تو منہ سے عجیب سی چیخ نکالتا ہوا، نیم لنگڑاتا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا۔

اس زمانے میں مسیتا کی عاشقی کے قصے دبی دبی زبان میں سر نکالنے لگے تھے۔ لاجو کا بھائی کافی غصے میں تھا۔ مسیتا کے باپ کی تھوڑی سی زمین راجہ جی کے یہاں پٹے پر پڑی تھی۔ مسیتا اور لاجو کے قصے کی بھنک جب راجہ جی کو ملی تو وہ اپنی بڑی سی دونالی بندوق لے کر مسیتا کے باپ کے، کچی مٹی والے مکان میں شیر کی طرح دہاڑتے پہنچے۔ بندوق سیدھی کی۔

"کہاں ہے مسیتا؟"

لنگڑے مسیتا کا باپ بفاتی کانپتا ہوا باہر نکلا۔

"مائی باپ، غلطی ہو گئی۔ انجان لڑکا ہے، دماغ سے بھی ہلکا ہے۔"

راجہ جی کی گرج تیز ہوئی۔ سارے گاؤں میں قصے نکل رہے ہیں۔ اسے یہاں سے دفعان کر۔"

"معاف کر دو راجہ جی۔"

بفاتی راجہ جی کے پیروں پر گر پڑا۔ "آپ کا خدمت گار نوکر جو ٹھہرا۔ معاف کر دیجئے۔"

راجہ جی غصے میں کانپتے رہے۔ "آگے ایسا ہوا تو نتیجہ تم ہی بھگتو گے۔ لیکن اتنا جان لو کہ تمہارے پٹے کی زمین کا کاغذ میں نے پھاڑ دیا۔۔۔"

اس واقعے کے دو تین دنوں تک مسیتا گھر سے باہر نہیں نکلا۔ تین چار روز بعد نظر آیا تو اس کا سارا بدن سوجا ہوا تھا۔ آنکھیں پھول گئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ بفاتی نے اسے کافی پیٹا ہے۔

"مسیتے...... مسیتے......"

وہ اپنے خاص انداز میں دونوں ہاتھوں کو لہراتا لنگڑاتا نکلا تو گاؤں کی عورتیں خود کو روک نہ سکیں۔ وہ سر نیچا کئے ہلکے ہلکے لنگڑاتا ایک طرف بڑھتا رہا۔ عورتوں کی دل لگی جاری رہی۔ مسیتے ادھر جا۔ تیری لاجو کی ڈولی گئی ہے۔ مسیتے وہ تیرے لیے جھن جھنا لے کر گئی ہے۔ جھن جھنے سے کھیلے گا مسیتے۔"

مسیتے سنتا رہا۔ اچانک پلٹا۔ زمین سے ایک بڑا پتھر اٹھایا اور اندھا دھند آواز کی طرف اچھال دیا۔ جدھر اچھالا ادھر سے ایک تیز چیخ اٹھی۔ مسیتا تیزی سے بھاگا لنگڑاتا ہوا گھر آیا۔ اماں نے دروازہ بند کرنے کی آواز سنی تو دھک سے رہ گئیں۔

تب تک دروازے پر محلے والوں کی کتنی ہی تھاپ پڑ چکی تھی۔

"چل، باہر آ مسیتے۔"

"کمبخت پتھر مار کر بھاگ آیا۔"

اماں نے مسیتے کو دھکیلا۔ دروازہ کھولا۔ اللہ رسولؐ کا واسطہ دیا۔ مسیتے کے ہلکے دماغ کو کوسا، لیکن وہ مانے نہیں۔ مسیتے نے جو پتھر اچھالا وہ گاؤں کی ایک عورت بھاگوتی کو لگا۔ بھاگوتی کے سر سے کافی خون نکلا اور مسیتے کی کافی دھنائی ہو گئی۔ مسیتا پھر کئی دنوں تک قید میں بند رہا۔

ادھر ایک عجیب بات ہوئی۔ لاجو نکلتی لیکن چپ چاپ پریشان۔ نظریں ادھر ادھر بھٹکتی رہتیں۔ پوکھر میں بھی ادھر ادھر تلاش کرتی رہتیں۔ اتنا تو طے تھا کہ لاجو اس سے عشق نہیں کرتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی جنون کی حد تک عشق کرنے والوں کے لیے من میں احترام کا ایک جذبہ آجاتا ہے۔ شاید لاجو اسی کا شکار ہوئی تھی۔

سہیلیاں بتاتیں ـــــ مسیتے کو مار پڑی ہے۔

"تیرا باپ بندوق لے کر پہنچا۔"

"مسیتے کے باپ کی پٹے والی زمین کا کاغذ پھاڑ دیا۔"

مسیتے نے بھاگوتی کا سر پھاڑ دیا۔

لاجو خوش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ "وہ اسے چڑا رہی تھی۔ ٹھیک کیا مسیتے نے۔"

پھر یہ بات بھی اڑی کہ لاجو بھی دماغ کی ہلکی ہے۔ بھلا ایسے گنوار اور لنگڑے لڑکے کی عاشقی کو کون شہ دے گا۔ سہیلیوں نے بھی اب مسیتے کے تذکرے بند کر دیئے۔ لیکن مسیتا کا لاجو کے تعاقب میں جانا بند نہیں ہوا۔ جیسے ہی تھوڑا وقت گزرا اس کا دھندا جاری تھا۔ بفاتی نے کئی بار چاہا کہ وہ بھی اب اس کے خاندانی پیشے کو اپنا لے۔ لیکن مسیتا کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ اس کا دل تو بس ایک ہی کام میں لگتا تھا۔ لاجو گھر سے نکلی ہے یا نہیں۔ نکلی تو کہاں گئی ہو گی۔ وہ سارے گاؤں میں دھما چوکڑی مچاتا رہتا۔ اس کا کوئی دوست یار بھی نہیں تھا۔ ہاں بہت خوش ہوتا تو چڑیوں کے جھنڈ ہاتھوں سے اڑاتا۔ آموں کی بوروں پر پتھر مارتا۔ کوئل اور دوسری

چڑیوں کی آوازوں کی نقل اتارتا اور وہی انداز......

کھوں...... کھوں.. اس وقت تک وہ ٹھیک طریقے سے بول نہیں پاتا تھا۔ احساس ظاہر کرنے کے لیے اس کے پاس آنکھیں تھیں یا کھوں...... کھوں...... تھا۔

(۳)

ان ہی دنوں گاؤں میں ہیضے کی وبا پھیل گئی۔ ہیضے کا مطلب ان دنوں خدائی عذاب تھا۔ گاؤں گاؤں صاف ہو جاتے۔ مندروں میں بھجن گائے جاتے۔ مسجدوں میں دعائیں کی جاتیں۔ گاؤں میں افراتفری مچ گئی۔ ہیضے کا عذاب کتنے ہی لوگوں پر ٹوٹا۔ مسیتے کا باپ بفاتی بھی اس کی لپیٹ میں آیا۔ پھر ہیضہ مسیتے کی ماں کو بھی لے گیا۔ مسیتا رو پیٹ کر رہ گیا۔ لیکن اب وہ اکیلا تھا۔ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ ایک دن وہ مشکیزہ لے کر، کمر پر باپ کی طرح چمڑے کی پیٹی باندھ کر نکلا بھی، لیکن واپس لوٹ آیا۔ کوس بھر سے پانی لانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ لیکن کیا کھاتا کیا پیتا۔ کبھی اس دروازے کبھی اس دروازے۔ ماں باپ کے اٹھ جانے کا غم تازہ تازہ تھا۔ اس لیے لوگ بھی رحم کھا کر پیٹ بھرنے کو کچھ نہ کچھ دے دیتے۔ ساتھ ہی ساتھ دس صلوٰتیں بھی سناتے کہ کام دھام کر کے دس پیسے جٹانا سیکھ لے۔ ہیضے کا عذاب ابھی جاری تھا۔ پھر سننے میں آیا کہ راجہ جی کی لاجو بٹیا بھی اس کی لپیٹ میں آ گئی۔ سب کی طرح یہ بات مسیتے نے بھی سن لی۔ پھر کھوں کھوں کرتے، روتے چیختے، اس نے سارے گاؤں والوں کو جمع کر لیا۔ اتنے پر بھی بس نہیں ہوا تو وہ لاجو کو دیکھنے کا پکا ارادہ کر کے اس کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

عجیب تماشا تھا۔ لوگ اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ ایک دلچسپ کھیل جیسے لوگوں کے ہاتھ آ گیا تھا۔ راجہ جی کے پکے گھر کے باہر ہی گھگھیائی آواز میں کھوں۔۔ کھوں۔۔ کر رہا تھا۔ آواز سن کر راجہ جی اپنی دونالی بندوق لے کر غصے میں نکل آئے۔ لوگوں نے سمجھایا بجھایا۔ یہاں تک کہ سینے کو پیٹا بھی۔ بڑے صاحب تو جیسے مرنے مارنے پر اتر آئے تھے، لیکن مسیتا اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ لیکن کسی

نے لاجو کو دیکھنے نہیں دیا۔ ہاں تب ایک دلچسپ بات ہوئی۔ ہنگامے اور شور شرابے کی آواز سن کر بہت کمزور اور دبلی پتلی ہو گئی لاجو بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ راجہ جی ایک طرف تھم سے گئے۔ بیٹی کی جان جیسے مسیتا کو دیکھنے کے لیے ہی ٹھہری ہوئی تھی۔ ادھر مسیتا نے لاجو کے کھوکھلے، ہڈی چمڑا ہو رہے ڈھانچے کو دیکھا۔ پھر بے تحاشا بھاگتا ہوا نہ جانے کہاں نکل گیا۔

اس دن لاجو مر گئی۔۔۔ اس زمانے میں لوگ یہ مانتے تھے کہ ہیضے سے مرنے والے کو جلانا نہیں دفنا دینا چاہیے۔ زیادہ تر لوگ یہی کر رہے تھے سو راجہ جی نے بھی صلاح و مشورہ کر کے لاجو کو دفنانے کا انتظام کر لیا۔ روتی آنکھوں سے لاجو دفنا دی گئی۔ سارے گاؤں والوں کی آنکھیں نم تھیں۔ لیکن اس کے دوسرے ہی روز ایک انوکھا واقعہ ہوا۔ جہاں لاجو دفنائی گئی تھی، وہ گڈھا خالی تھا۔ ساری مٹی باہر تھی۔ اور لاجو کی لاش بھی کسی نے غائب کر دی تھی۔ اس واقعے نے جیسے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ اب سب کی نگاہ مسیتے کی طرف تھی۔ مسیتے کا گھر خالی تھا۔ پھر تو مسیتے کی کھوج شروع ہوئی۔ راجہ جی اور لاجو کا بھائی کافی غصہ میں تھے۔ انہیں سمجھا بجھا کر گاؤں والوں نے گھر بیٹھے رہنے دیا۔ اور مسیتے کی تلاش میں لگ گئے۔

آخر مسیتا مل گیا۔ گاؤں کے ہی ایک ملبے نما ڈھائے ہوئے مکان میں۔۔۔ جس وقت مسیتا کی تلاش میں چند لوگ وہاں پہنچے تو یہ منظر دیکھ کر ڈر گئے۔ مسیتا چپ چپ، لاجو کی لاش پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ کفن پھٹا ہوا ایک طرف پڑا تھا۔ ماحول میں سڑے ہوئے جسم کی بدبو پھیل گئی تھی۔ زمین پر ایک چادر بچھی تھی۔ اس پر لاجو کی لاش پڑی تھی۔ دیکھنے والے ششدر رہ گئے۔ لوگ مسیتے کو مارنے کے ارادے سے آئے تھے۔ لیکن یہ کیا۔ یہ کیسی محبت تھی۔ ایسی محبت تو نہ کتابوں میں دیکھی نہ سنی۔ الٹے پاؤں وہ لوگ واپس ہوئے ـــــ راجہ جی تک بات پہنچی۔ راجہ جی بھی دنگ۔ گاؤں والوں نے اس بار بھی باپ بیٹے کو سمجھا بجھا کر شانت کر دیا۔ دو چار لوگوں نے مسیتا کو بے رحمی سے پکڑا۔ اسے دھکا دیتے ہوئے ایک طرف لے گئے۔ مسیتا جنگلی بھینسے

کی طرح غرارہا تھا۔ بار بار لاجو کے مردہ جسم کی طرف بھاگتا، منھ سے عجب طرح کی گھوں گھوں کی آوازیں نکال رہا تھا۔

لاجو پھر دفنادی گئی۔ جہاں دفنائی گئی، وہاں مسیتے کے جانے پر پابندی لگادی گئی۔ مسیتا پاگل اور مجبور کسی سانڈ کی طرح غراکر آس پاس کے حصے میں دوڑتا اور گھومتا رہتا اور بالآخر ایک دن وہ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ اس کے بعد سالہا سال گزر گئے۔ مسیتے کو کسی نے نہیں دیکھا۔

(۴)

اور سچ پوچھئے تو غلامی کے زمانے کو لانگھ کر جب ایک مدت کے بعد وہ لوٹا تو آزادی کی صبح طلوع ہو چکی تھی۔ اوپر کا حصہ غلامی کے جس سیاہ دور سے منسوب ہے اس کا تذکرہ میں نے جان بوجھ کر ضروری نہیں سمجھا کہ اس غلامانہ زندگی کا تذکرہ تو تواریخ نے بار بار کرادیا ہے اور کون ہے جو غلامی کی بیڑیوں کی اس ملگجی تاریخ سے واقف نہیں۔ اس لیے میں نے جان بوجھ کر سوتنترتا آندولن اور ان سے جڑی باتوں سے اجتناب کیا ہے اور اس تذکرے میں جہاں مسیتا کی ضرورت میں نے محسوس کی، اسے ہی لکھا ہے۔ اس لیے اوپر کی کہانی پڑھتے ہوئے آپ اپنے ذہن میں غلام ہندوستان کی تاریخ کو ضرور ملحوظ رکھیں گے۔

ہاں تو جب مسیتا کی واپسی ہوئی تو وہ کوئی ۴۹۔۱۹۴۸ کا زمانہ ہوگا ـــــــ یعنی آزادی مل چکی تھی اور آزادی کے فوراً بعد ہنگامے، تقسیم کے واقعات نے آزادی کے احساس کو زخمی کر دیا تھا۔ کتنا کچھ بدل گیا تھا اور بدل گیا اومایور بھی...... کچھ مکانات وغیرہ تو کسٹوڈین کے ہوگئے۔ کچھ لوگ اونے پونے بیچ کر پاکستان بھاگ گئے۔ ....

اومایور اب پہلے والا اومایور نہیں تھا، لیکن جو لوگ ابھی پہلے کے باقی تھے، ان کی معرفت مسیتا کی کہانی او جھل نہیں ہوئی تھی۔

اور ایک دن کچھ لوگوں نے دیکھا ـــــ ٹک ٹک کرتا ہوا دور سے ایک یکہ چلا آرہا ہے اور یکہ ماسٹر جی کی پاٹھ شالہ کے پاس جا کر رکا۔ اس میں سے ایک ادھیڑ عمر کا موٹا سا آدمی لنگڑاتا ہوا نکلا۔ جس کا حلیہ آپ کچھ کچھ مہابھارت کے گھٹوت کچ (بھیم کا لڑکا) سے لگا سکتے ہیں۔ دائیں گال پر بڑا سامسہ۔ سر کے بال آدھے اڑے ہوئے۔ پیروں میں لنگ۔ آنکھیں تجربوں سے گہری اور بھیانک۔ جسم موٹے ہونے کی حد تک پھولا ہوا۔ وہ یکہ سے اترا اور یکہ بان سے پیسے پوچھے اور پیسے دے چکنے کے بعد اس نے وہیں کھڑے کھڑے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ تب تک گاؤں کے ہی پرانے ماسٹر روی کانت بابو نے اوما پور آئے ہوئے اس نئے مسافر کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اس وقت اس کے بدن پر ایک تنگ سی بوسیدہ پینٹ اور ڈھیلی ڈھالی شرٹ تھی۔ (پھر گاؤں آنے کے بعد اس نے یہ لباس کبھی نہیں پہنا۔ اس کا پسندیدہ لباس تہبند اور کرتا ہی رہا۔)

روی بابو نے کانپتی آنکھوں اور موٹے شیشے والے چشمے سے اس پر اسرار مسافر کو دیکھا اور زور سے آواز لگائی...... "مسیتے......"

آواز سن کر دو چار لوگ اور بھی چونکے۔

"مسیتے۔"

آپس میں کچھ کانا پھوسی ہوئی۔

مسیتا آگے بڑھا۔ ماسٹر جی نے باہیں پساریں اور مسیتے گلے لگ گیا۔

"کہاں رہا اتنے دنوں؟"

پھر ماسٹر جی کو کچھ یاد آگیا۔ اے۔ ہیں۔ ماسٹر جی نے منھ سے کچھ اشارہ کیا۔ جیسے پوچھ رہے ہوں۔ "بھاگ کر گیا کہاں؟" اب کیا کرے گا۔ اشارہ اس لیے کیا کہ مسیتا پہلے صاف نہیں بول پاتا تھا۔ وہ بولنے کو ہوتا تو آواز گھڑ گھڑا کر رہ جاتی۔

"سہر رہا سہر۔" مسیتا نے قہقہہ لگایا۔ "سب سہر کی برکت۔ پراٹس کی۔ اب دیکھو۔ ہا...... ہہ...... ہہ......"

مسیتا ہنس کر بولا تو ماسٹر جی چونک گئے۔

"آواز ٹھیک ہو گئی تیری؟"

"سب سہر کی مہربانی ہے۔"

"اب یہاں کیا کرے گا؟"

"پہلے اپنا مکان......"

"مکان......" ماسٹر جی نے اسے غور سے دیکھا۔۔۔ "کیسا مکان۔۔۔ وہاں تو بڑے صاحب کی حویلی کھڑی ہے۔"

"بڑے صاحب؟"

"ہاں، وہی راجہ جی کے لڑکے۔"

مسیتا کے دل پر جیسے گھونسا سا لگا۔ آگے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ چہرہ اچانک بدل گیا ـــــ تیز دوڑ لگائی۔ مگر کہاں جاتا۔ سارے راستے انجان۔ جہاں ایک پیپل کا پیڑ تھا۔ وہ بھی کٹ گیا۔ بڑا سا کنواں تھا وہ پاٹ دیا گیا۔ سمھد راموسی کا گھر۔۔۔ وہ تو کوئی دوسرا ہی گھر تھا۔ اور یہ راجہ جی کا مکان۔۔۔ لیکن وقت کے ساتھ اب اس کا بھی نقشہ بدلا تھا۔

مسیتا کی آنکھوں کے سامنے اچانک یادوں کی ریل چھک چھک کر کے گزر گئی۔

اس نے دیکھا لاجو شرمائی شرمائی سی پنگھٹ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ سہیلیاں چھیڑ رہی ہیں۔ لاجو کسی بات پر تالیاں بجا کر ہنس رہی ہے۔ جہاں وہ کھڑا تھا، وہاں بجلی کا بڑا سا پول تھا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے چٹکی لی۔

"مسیتا جا جا، ادھر تیری لاجو کی ڈولی گئی ہے۔"

مسیتا چونکا مگر مڑا نہیں۔

"اب دوسری آواز ابھری۔

"راجہ جی کی چھوکری پہ نیت ہے پھسلی
لنگڑے مسیتا کی قسمت ہے لنگڑی"

اب تیسری آواز تھی...... "جا...... جا...... وہ تیرے لیے جھن جھنا لے کر گئی ہے۔"

پھر ہنسی کی آواز...... مسیتے کو لگا جیسے اچانک برسوں بعد وہ اپنے ہی گاؤں میں ننگا ہوتے ہوتے بچا ہو۔ وہ اچانک پلٹا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ سامنے تین جوان کھڑے تھے۔ جو اچانک اس کے چہرے کے بدلے تیور دیکھ کر سہم گئے۔ پھر جانے کیا سوچ کر وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

راجہ جی کے مکان کے دس قدم آگے ہی اس کے باپ کا مکان تھا، جہاں ایک بڑا سا پختہ عالی شان مکان اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اچانک پرانی یادوں نے حملہ کیا۔ مسیتے کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے آنسو پونچھ ـــــ ڈالے آگے بڑھنا چاہا مگر ٹھہر گیا۔ اب کون اسے پہچانے گا۔ پہچان بھی گیا تو کیا اس کا کچا مکان اسے لوٹا دے گا۔ باپ تو غریبی میں پہلے ہی مکان کا پٹہ چھڑوا آیا تھا۔ اب کیا تھا اس کے پاس کہنے کے لیے ـــــ یا لڑنے کے لیے۔

وہ پیچھے پلٹا۔ اچانک اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ دیکھا تو ماسٹر جی تھے۔ ماسٹر جی مسیتے کی نم آنکھوں کو دیکھ کر برسوں پرانے درد کے تیور کو سمجھ گئے۔ صرف اتنا پوچھ سکے۔

"اب کیا ارادہ ہے مسیتے؟"

"اسی گاؤں میں رہوں گا۔"

"اور کام؟"

"کام سوچوں گا۔ کچھ نہ کچھ تو......"

"اب گاؤں میں کیا کام ملے گا۔ یہاں کے سارے لوگ تو شہر چلے گئے۔ جن کی تجارت ہے۔ وہ بھی شہر ہی میں ہیں۔ رہے گا کہاں؟"

"کہیں بھی۔"

"اسکول میں ہی سو جانا۔"

مسیتا کچھ دن اسکول میں ہی سوتا رہا۔ اس نے ایک بار دبی زبان سے اپنے مکان کے بارے میں ماسٹر جی سے واپسی کی بات کہی۔ ماسٹر جی نے کسی سے اس کا ذکر کر دیا۔

بات بڑے بابو تک پہنچ گئی۔ رات کے وقت بڑے بابو اپنی گاڑی گھڑ گھڑاتے ہوئے اسکول کے احاطے میں پہنچ گئے۔ مسیتا سویا ہوا تھا۔ ہارن کی آواز سن کر چونکا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بڑے صاحب شاہانہ سوٹ ڈٹائے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ غور سے اسے دیکھا۔ حقارت کی نگاہ پھینکی ـــــــ سوال داغا۔

"تم مسیتے ہو؟"

"پہچانا نہیں؟" اس نے غرائی آواز نکالی۔

"سنا ہے ہم جس مکان میں رہتے ہیں۔ اس پر اپنا دخل لکھوانے آئے ہو۔"

"ہاں" اس بار بھی مسیتے کی آواز میں سانپ کی پھنکار شامل تھی۔

"پاگل پن چھوڑ دو۔"

بڑے صاحب طنز میں مسکرائے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی بھی تھی۔ بجی سنوری۔ وہ دھیرے سے بولی۔ "چلو ـــــــ ان جیسوں سے کیا لگنا۔"

"کھوں...... کھوں۔" مسیتے نے اس بار پھر غرائی آواز نکالی۔ بڑے صاحب گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اور ماحول میں گاڑی سے اڑی دھول بس گئی۔

مسیتا کا غصہ اب تک شانت نہیں ہوا تھا۔ آگ کی تیز لپٹیں اندر بھبھک اٹھی تھیں۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور اندھیرے میں بہت دور تک نکل گیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا نیم کا پیڑ تھا۔ جگہ جانی پہچانی سی تھی اور اچانک جیسے مسیتا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بدن لرزنے لگا۔ نہیں، وہ یہاں زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ جس دن سے آیا تھا، اسی دن سے اس جگہ کی تلاش میں تھا۔ لیکن نئے مکانات کی قطار میں یہ جگہ کھو گئی تھی۔ اس جگہ تو اس کی لاجو دفن ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر تک مورتی بنا بصد احترام کھڑا رہا۔ قدم میں لرزش تھی...... لڑکھڑاتا ہوا وہ جھکا رہا۔ وہاں کی مٹی چومی...... اور پھر لنگڑاتا ہوا ابو جھل بو جھل ماسٹر جی کی پاٹھ شالہ لوٹ آیا۔

مسیتا اب اسکول میں جھاڑ پونچھن لگاتا اور کھان پان ماسٹر جی کے ساتھ ہی کرتا۔ ایک ہفتہ تک تو اسی طرح چلتا رہا۔ لیکن مسیتا کو چین نہیں تھا اور اسی لیے مسیتا کے

چہرے پر ہر وقت ایک ختم نہ ہونے والی جھنجھلاہٹ برستی رہتی۔ گاؤں میں اس کے لیے کہیں کوئی کام نہیں تھا۔ اور وہ اتنا گول گپا اور بھدے پن کی حد تک موٹا تھا کہ اس سے کچھ ہونے والا بھی نہیں ــــــ لیکن گاؤں کے لڑکوں میں اب اس کے لیے دلچسپی بڑھ گئی۔ لڑکے اسے گھیرے رہتے ــــــ وہ ان سے خوب باتیں کرتا۔ ادھر ادھر کی باتیں ــــــ لڑکوں کے ذہن میں وہ ساری پرانی کہانیاں زندہ تھیں۔ کبھی کبھی وہ اس کہانی کو ادھیڑنے کی کوشش کرتے تو مسیتا گھڑگھڑاتی ہوئی آواز نکال کر آنکھیں دکھا کر انہیں خاموش کر دیتا۔ پھر لڑکے اسے غور سے دیکھتے کہ یہی وہ مسیتا ہے، گاؤں کی پرانی لوک کتھاؤں جیسی کہانی کا ہیرو۔ لیکن آج کے مسیتا میں وہ صرف اس کہانی کا عکس ہی دیکھ سکتے تھے۔ جلد ہی مسیتا کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ وہ اس طرح پاٹھ شالہ میں جھاڑ وپونچھا لگا کر اور ماسٹر جی کے ساتھ کھان پان کر کے جی نہیں سکتا، لیکن ابھی اس کے سوا دوسرا راستہ بھی کیا تھا۔

لیکن جلد ہی وہ سپنے بیچنے لگا۔ وہ سپنے جو اس نے کبھی دیکھے تھے۔ محسوس کیے تھے اور جو پورے نہ ہو سکے تھے۔ وہی رنگ برنگے سپنے۔ اب وہ یہ سپنے گاؤں کے آوارہ چھوکروں کو دکھانے لگا تھا جو کسی کام دھام کے نہ تھے ــــــ جو دن بھر گاؤں میں دھما چوکڑی مچاتے رہتے۔ مسیتا کو اب ان کے بیچ سپنے بانٹتے ہوئے مزہ آنے لگا تھا۔

ایک دن اس نے گاؤں کے ہی ایک آوارہ چھوکرے رگھوا سے کہا۔ ''کیوں رے...... کچھ کرتا دھرتا کیوں نہیں۔ تیرا باپ تو بوڑھا ہو گیا اور تو اکلوتا لڑکا ہے۔ اتنے بڑے مکان کا کیا ہوگا۔ کبھی سہر دیکھا ہے سہر۔ مکان بیچ دے اور سہر نکل جا۔ سُسرے سہر کی لڑکیوں کی برابری تو یہ گاؤں والیاں کر ہی نہیں سکتیں۔''

رگھوا دیدے پھاڑے اس کی باتیں سنتا۔ پھر جیسے شہر جانے کے نام پر حامی بھر لی۔

اس نے نتھو کے بیٹے کو ہیرو بن جانے کی بات کہی ''تو گبرو جوان لگتا ہے رے۔ بمبئی جا کر قسمت آزما۔ یہاں گاؤں میں کیوں سڑ رہا ہے۔''

لکھیا کی بیٹی رکمی ایک دن ڈرتے ڈرتے اس کے پاس آئی تھی۔ اس کا گاؤں ہی کے

ایک لڑکے سے رومانس چل رہا تھا۔ مسیتا نے دونوں کو بھاگ جانے کا مشورہ دیا کہ یہاں کیا ہے۔ گاؤں میں رہے گی تو شادی نہیں ہونے والی۔

پھر یکے بعد دیگرے گاؤں میں واقعات کی جھڑی لگ گئی۔ لکھیا کی بیٹی اپنے پریمی کے ساتھ بھاگ گئی۔ نتھو کا بیٹا گھر سے پیسے چرا کر بمبئی بھاگ گیا۔ رگھوا نے باپ سے مکان زبردستی اپنے نام لکھوا کر اور بیچ کر شہر چلا گیا۔ واقعات کچھ اتنی تیزی سے چلے کہ ماسٹر جی گھبرا گئے۔ اب اس مسیتے کا بڑا شکار بڑے صاحب کا بڑا لڑکا چھنگا ہونے والا تھا۔ مسیتا نے اسے پھانس لیا تھا۔ اب وہ اسے پٹی پڑھا رہا تھا۔

"گاؤں بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ اتنے پیسے ہیں تم لوگوں کے پاس۔ سہر میں تم لوگ ڈھنگ کی جگہ کیوں نہیں دیکھتے۔"

چھنگا کو یہ بات پسند آئی۔

مسیتا پھر کہتا...... "تمہارا باپ تمہاری زندگی برباد کردے گا۔ تمہارے یہ دن تو عیش کے دن ہیں۔ گاؤں میں رہ کر کیا جانو کہ عیش کیا ہوتا ہے۔ یہاں کا اسکول بھی کوئی پڑھنے کے لائق ہے۔ تو ایسا کر کہ اگر تیرا باپ تجھے پیسے نہیں دیتا تو تو تجوری کی کنجی کی تاک میں رہ ــــــــ پھر پیسے چرا کر بمبئی بھاگ جا۔ اب دیکھ نا وہ نتھو کا چھورا جب ہیرو بن کر آئے گا تو تجھے اچھا لگے گا اور وہ ہیرو ضرور بنے گا۔ ایک دن جب اسے فلم کے پردے پر دیکھے گا تب عقل آئے گی۔ ارے میں کہتا ہوں تو کسی سے کم ہے کیا......؟"

بس یہی بات چھنگا کے دل کو لگ گئی اور سچ مچ ایک دن وہ تجوری سے کافی مال نکال کر بھاگ گیا بمبئی۔ اس دن گاؤں میں کافی واویلا مچا۔ بڑے صاحب کو یہ خبر لگ گئی کہ اس طرح کا سپنا گاؤں کے آوارہ چھوکروں کو مسیتا نے دکھایا۔ وہ تو پہلے سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ اس بار بگڑتے چنگھاڑتے دو چار لٹھیوں کی فوج لے کر پہنچ گئے۔

"مار سالے مسیتا کو۔"

لیکن اب مسیتا پہلے والا مسیتا تو تھا نہیں۔ جو ہار جائے۔ وہ لٹھیوں سے اس طرح بھڑا جیسے کوئی پاگل سانڈ سے بھڑ تا ہے۔ لٹھتیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ انہوں نے پولیس بلانے کی دھمکی دی۔ ماسٹر جی نے بات سنبھالی۔ اب لڑکا بھاگ گیا تو کیا کرو گے بڑے صاحب؟ دو چار روز اسے آوارہ گردی کر لینے دو ـــــ جب دن میں تارے نظر آئیں گے تو خود ہی لوٹ آئے گا۔"

مسیتا کے دل کو جیسے ٹھنڈک مل گئی۔ لیکن ماسٹر جی کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ غصے میں مسیتا سے نکل جانے کو بولے۔

"جا...... نکل جا...... گاؤں کے بھولے بھالے بچوں کو بھڑ کاتا ہے۔"

مسیتا دھیرے سے بولا۔ "آپ مجھے غلط سمجھنے لگے۔"

"پھر صحیح کیا ہے۔"

"سچ سچ بتاؤں ماسٹر جی۔"

مسیتا نے تہبند برابر کی اور ماسٹر جی کی آنکھوں میں دیکھا...... مجھے مکان چاہئے۔ اپنا مکان۔ سچ بتاؤں تو میرے جیسے آدمی کو جس کے پاس کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں، ایک ٹھکانے کے لیے ہی اب جی رہا ہے۔ جس دن سے اپنا مکان چھنا، اس دن سے ایک مکان ہونے کی ضد ہو گئی۔ جھونپڑا ہی ہو، پر اپنا ہو۔ گاؤں سے بھاگ کر گیا تو قلی گیری کی ـــــ ڈھابے میں رہا۔ اسٹیشن پر سویا کبھی مسجد میں پر ـــــ مگر مکان نہیں ہو پایا۔ جس دن مکان کا پٹہ پھڑوا کر ابا کو مکان سے بے دخل ہوتے دیکھا تھا بس اسی دن سے......"

مسیتا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ماسٹر جی سن سے رہ گئے۔ کیا کہتے۔ بچپن تو نکل گیا مسیتا۔ جوانی بھی نکل گئی۔ اب یہ ادھیڑ پن بچا ہے اور بچا ہے تیرا باقی سپنا۔ اس باقی سپنے کو بدن کی ڈھائی عمارت میں کب تک محفوظ رکھے گا۔ جا کوئی اور سپنا پال، کوئی دوسرا ٹھور ٹھکانہ ڈھونڈ۔"

"اب کون سا ٹھور ٹھکانہ ماسٹر جی۔ جب انسان ہار جاتا ہے تو آخر میں اس کے پاس گزرا ہوا زمانہ ہی ہوتا ہے۔ اس گزرے ہوئے زمانے میں وہ اپنا گھر دیکھتا ہے۔ اب کتنی

عمر بچی ہے میری۔ لیکن لگتا ہے وہی پرانا سپنا......

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ طلوع ہوئی۔ ”تم شاید ہنسو ماسٹر جی! لیکن وہی پرانا! سپنا۔ لاجو دوڑتی ہوئی پنگھٹ گئی ہے اور میں پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔“

”اتنی باتیں کہاں سے سیکھیں مسیتے۔“

”سب تجربہ سکھاتا ہے ماسٹر جی۔ سہر میں اتنے دنوں تک رہا۔ باتیں خوب سیکھیں پر نہیں سیکھا تو جینا۔“

”کیوں؟“

”ا [illegible] اپنے دیکھ تو سکتے ہیں سپنے رکھ نہیں سکتے۔“ وہ مسکرایا۔ ”جس وقت گاؤں سے بھاگا تھا اس کے بعد کافی دن تک شہر کی ایک مسجد میں مولوی صاحب کے ساتھ رہا۔ بڑے اچھے آدمی تھے جو بھی کھانے پینے کی چیز آتی، مجھے بھی کھلاتے۔ اور ایک سے ایک باتیں بتاتے۔ سپنوں کا سچ بھی انہیں سے سیکھا۔؟ جو سپنے ہم دیکھتے ہیں وہ تو آپ کچل دیتے ہیں۔ پھر جینا سیکھوں بھی تو کیسے۔ اسی مولوی نے بتایا تھا کہ سب سے سستی چیز تو سپنا ہے۔ جسے ہم آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ہم غریب سپنا بھی تو نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن اب سوچ لیا ہے ماسٹر جی پھکڑ ہوں تو کیا سپنے دیکھوں گا بھی اور دکھاؤں گا بھی۔“

ماسٹر جی ہنسے ـــــ ”میں بھی تو جانوں تیرا سپنا کیا ہے؟“

”سنیں گے۔“ مسیتا ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”جیسے یہ ہے کہ بلڈوزر چلا کر بڑے صاحب کا مکان ڈھا دوں اور وہاں دوبارہ بابو جی والا کچا مکان کھڑا کر دوں۔ جیسے یہ کہ لاجو کی قبر کھود دوں اور وہ جیتی جاگتی نکل آوے۔“

”پاگل۔“ ماسٹر جی ٹھہاکا مار کر ہنسے۔ مکان اور لاجو دو ہی کا ذکر ہے تیرے پاس ـــــ ایسا کر اسکول کے باہر اپنی ایک جھونپڑی کھڑی کر ہی لے۔ اور کسی لاجو کو لے آ۔“

”نہیں ماسٹر جی۔“ مسیتا کی آواز بھرا گئی۔ ”جھونپڑی تو بناؤں گا پر کسی کو بیاہ کر نہیں لاؤں گا۔“

جھونپڑی کی بات شاید مسیتے کے دل میں اتر گئی تھی۔ اس کے دوسرے دن لوگوں نے دیکھا، مسیتا بڑی امنگ سے اپنی چھوٹی سی جھونپڑی تیار کرنے میں لگا ہے۔ پاٹھ شالہ سے وہ کدال لے آیا تھا۔ پیڑ کاٹنا، سینکچے نکالنا، زمین کھودنا، ڈنڈوں کا پھا بنانا، لکڑی کے بھاری کندوں کو گاڑنا۔ جس نے دیکھا اسے حیرت ہوئی۔ مسیتے کے چہرے پر ایسا جوش اس سے پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ انسان کے جب کسی سب سے بڑے سپنے کی تعبیر ملتی ہے تو جیسی آبھا اس وقت اس کے چہرے پر ہو سکتی ہے مسیتا کے چہرے پر ویسی ہی تجلی تھی۔ صبح سے شام تک وہ اپنی جھونپڑی کھڑی کرنے میں لگا رہا۔ بھرپور محنت یہاں تک کہ وہ پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی کام بچ ہی گیا تھا۔ جو اس نے دوسرے دن پورا کیا۔ جھونپڑی کی سجاوٹ میں اس نے موچی کے چپلوں سے اتارے ہوئے چمڑے کے خالی ڈیزائن کا بھی سہارا لیا۔ گاؤں کے لوگوں کے لیے یہ سب انوکھا سا تھا۔ لڑکوں میں بھی یہ منظر دیکھ کر جوش بڑھ گیا۔ مسیتا کام میں لگا رہا اور لڑکے گاتے رہے۔

"دیکھ کتنی تیز ہے اس کی رے کھونپڑی
ڈیڑھ دن میں بن گئی مسیتا کی جھونپڑی۔"

مسیتا ان کا گانا سنتا پھر شان سے مسکراتا ـــــ فخر سے خود تعمیر کردہ جھونپڑی کو دیکھتا۔ اسے لگتا جیسے اس کے سپنے میں جان پڑ گئی ہے۔ اور اس کی کوئی تشنگی سیراب ہوئی ہے۔

لیکن اس کے آٹھ دس دن بعد ہی گاؤں میں ایک نیا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جب بڑے صاحب کو چھنگا کا خط ملا۔ جس میں چھنگا نے ماں اور بابو جی کو انتم پرنام لکھتے ہوئے لکھا تھا کہ اب اس کا پیسہ ختم ہو رہا ہے۔ وہ بمبئی میں اب زیادہ نہیں رہ سکتا۔ یہاں کی زندگی بہت مشکل ہے، اس لیے وہ آتم ہتیا کرنے جا رہا ہے۔ اس خط کو اس کا انتم پرنام

سمجھا جائے۔"

گھر بھر میں رونا پیٹنا مچ گیا۔ گاؤں میں فوراً ہی خبر پھیل گئی۔ بڑے صاحب نے غصے میں دو نالی بندوق کھینچ لی۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا۔ ادھر ماسٹر جی نے ہوا کا رخ بھانپتے ہوئے مسیتا کو پاٹھ شالہ میں چھپا دیا۔

"چھپ جا مسیتے چھپ جا ـــــ ورنہ تیری خیر نہیں۔"

"کیوں؟" مسیتا اڑ گیا۔

"بڑے صاحب پاگل ہو رہے ہیں۔"

"ہوں۔ میری بلا سے۔"

"گاؤں کے سارے لوگ بگڑے ہوئے ہیں۔"

"بگڑیں میری بلا سے۔"

ماسٹر جی غصہ ہوئے۔ "جب ان کی بلا تجھ پر ٹوٹے گی تب معلوم ہوگا۔ پہلے چھپ جا۔"

مسیتا بار بار یہی کہتا رہا۔ "واہ واہ کیوں چھپوں۔ کوئی میں نے مارا ہے۔ کمال ہے کیوں چھپوں۔ وہ بھاگا ہے تو اپنی مرضی سے"

بڑے صاحب کے تیز گرجنے کی آواز آئی۔ ماسٹر جی نے صاف انکار کر دیا کہ انہوں نے مسیتا کو دیکھا ہی نہیں۔ بڑے صاحب نے غصہ میں اس کے ڈھائی گز کے جھونپڑے کو اجاڑ دیا۔ گاؤں میں ایک مجمع سا لگ گیا...... بڑے صاحب دوسرے دن شام کی گاڑی سے کشور کی کھوج میں بمبئی جانے والے تھے۔ لوگ انہیں سمجھا بجھا کر گھر لے گئے۔

کافی دیر ہو گئی تو مسیتا پاٹھ شالہ سے باہر نکلا۔ بدن کڑکڑایا۔ شام کی پرچھائیاں تب تک گاؤں کے آسمان پر تیر چکی تھیں۔ بلا خوف وہ باہر نکلا۔ لنگڑاتا۔ وہی کرتا اور تہبند پہنے۔ اور اچانک اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کا جھونپڑا بڑے صاحب کے غیظ و غضب کی کہانی سنا رہا تھا۔ مسیتا کو لگا جیسے کسی نے اس کا دل نکال لیا ہو۔ اچانک پاٹھ شالہ کے گیٹ سے وہ گھگھیائی سی آواز نکالتا اپنے جھونپڑے کے پاس واپس بھاگا۔ اور

پھر دہاڑیں مار کر روتا ہوا لکڑی کے سینکچوں اور ڈنڈوں کو سینے سے لپٹا لپٹا کر چلانے لگا۔ اس کی چلاہٹ اور گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے کی آواز سن کر پھر مجمع لگ گیا۔

مسیتا جیسے پاگل ہو رہا تھا ـــــــ جیسے کسی نے سچ مچ اس کے محل میں آگ لگا دی ہو۔ وہ بھیڑ لگائے لوگوں کو نفرت و حقارت سے اور کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا، جیسے یہ سب مجرم ہوں۔ مشکل سے جی کو کڑا کر کے ماسٹر جی نے اسے کھینچنا چاہا۔

"مسیتے ہوش میں آ۔"

مستیا جیسے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے ماسٹر جی کو تیز دھکا دیا اور بھیڑ کی طرف ہاتھوں میں پکڑا ہوا ڈنڈا اچھال دیا۔ بھیڑ چھٹی۔ لوگ غصے میں ادھر ادھر ہٹ گئے۔ اور مسیتا گھڑ گھڑائی آواز نکال کر ڈنڈا لے کر بھیڑ پر دوڑ پڑا۔

ماسٹر جی چلائے۔

"ٹھہر مسیتے۔"

مگر مسیتے کو آج ہوش کہاں تھا......

وہ تو جیسے پاگل ہو رہا تھا۔ ماسٹر جی نے ہمت کی۔ دوڑ لگائی۔ مسیتے کو جا پکڑا۔ مسیتا اس بار نرم پڑا۔ کسی چھوٹے بچے کی طرح یا گونگے کی طرح اس نے پھر گھگھیائی آواز نکالی۔ جھونپڑا دکھایا اور اشارہ کیا کہ اس کا سپنا چور چور ہو گیا۔ ماسٹر جی نے اسے سمجھایا ـــــــ دلاسہ دینا چاہا، کھینچ کر پاٹھ شالہ میں لائے۔ مگر کاہے کو......وہ پتھر کا بت بن گیا تھا۔ رہ رہ کر کانپنے لگتا۔ کافی دیر تک وہ سکتہ کے عالم میں رہا۔ پھر اچانک اٹھا۔ قدم باہر کی طرف کھینچے۔ ماسٹر جی چلائے۔ "کہاں چلے؟"

مگر مسیتے نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ جیسے انسان اچانک کوئی مضبوطی بھرا فیصلہ کر لیتا ہے پھر سوچتا نہیں۔ یہی مسیتے نے کیا۔ اس نے قدم باہر نکالا۔ پھر پلٹ کر گاؤں کی صورت نہیں دیکھی۔

اس رات صرف اتنی سی بات ہوئی کہ رات میں، اندھیرے میں کسی وقت مسیتا بڑے صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ڈھنڈے کا وہی بھاری کندہ تھا۔ بڑے

صاحب آدھی رات کو کسی کام سے باہر نکلے تھے۔ مسیتا انہی کی تاک میں چھپا بیٹھا تھا۔ بڑے صاحب جیسے ہی نکلے، مسیتا نے تابڑ توڑ ڈنڈے کا وار ان کے سر پر کیا اور ان کی آخری چیخ نکلنے تک مسیتا وہاں سے بھاگ چکا تھا۔

دن ہوتے ہی پولیس آئی۔ مسیتا کی کھوج ہوئی، لیکن مسیتا نہیں ملا اور اس دن کے بعد کبھی گاؤں یا باہر دیکھا بھی نہیں گیا۔

(۶)

پھر کتنے ہی برس ہوا میں پھڑ پھڑا کر اڑ گئے۔ مسیتا کی اتنی کہانی تو میں جان رہا تھا اس لیے خواہش تھی کہ زندگی کے اس بکھرے طویل سفر میں اس کہانی کے آخری سرے کی تلاش کر سکوں کہ مسیتا کو گھر ملا یا نہیں۔ جینے کو سپنا اور سپنے کو گھر کا مقصد ماننے والے مسیتے کی زندگی میں ایک جھونپڑے کی حسرت پوری ہوئی یا نہیں...... آج اتنے دنوں بعد مجھے اس جھونپڑے کے سامنے مسیتا کی موجودگی حیرت میں ڈال رہی ہے اور میں اس بوڑھے کو دیکھے جا رہا ہوں جس کے ہونٹوں پر سکندر اعظم کی طرح فتح کی مسکراہٹ کھیل رہی ہے...... "تم مسیتا ہو؟"

مسیتے نے عجیب سی گھڑ گھڑاہٹ والی آواز نکال کر میری طرف دیکھا ہے ـــــ وہ جیسے خوش ہو رہا ہے کہ میں اسے جانتا ہوں۔ کتنا خوش ہو رہا ہے۔ اچانک ایک جھٹکے سے اس نے میرا ہاتھ تھاما۔ ہاتھ اب بھی اتنا مضبوط تھا کہ میرا ہاتھ جھنجھنا اٹھا ـــــ پھر اس نے اپنی جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا اور پھر اپنا دایاں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر بتایا کہ میرا ہے۔ میں نے پھر غور سے مضحک کہانی کے اس ہیرو کو دیکھا۔ جس کی آنکھوں کی بجھتی جوت میں اس جھونپڑی کو دکھا کر ہزاروں قمقمے جل اٹھے تھے۔

پھر اچانک اس نے جھونپڑی کے اندر کچھ دیکھنے کے لیے اشارہ کیا۔ میں نے اندر جھانکا تو سن رہ گیا، جہاں وہ اشارہ کر رہا تھا۔ وہاں میلے کپڑے میں، جو کبھی سفید رہا ہوگا۔ اس طرح موڑ کر اور اندر کچھ بھر کر رکھا تھا۔ جیسے کسی آدمی کو کفن پہنایا جاتا ہے۔ اس

نے پھر میری طرف دیکھا۔ جیسے کچھ پوچھ رہا ہو کہ میں نے کچھ سمجھایا نہیں۔ پھر اس کی گھڑ گھڑاتی آواز میں نے سنی......

لا......جو......

میرا پورا وجود جھن جھنا اٹھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ ۸۰ سال کا وہ بوڑھا جھونپڑی کے اندر گیا اور اس کفن کو سینے سے لپٹایا۔ شاید وہ رو رہا تھا۔ مجھ میں اب دیکھنے کی تاب نہیں تھی، اس لیے میں نے اپنے قدم باہر کھینچے۔ تب تک جھونپڑیوں کے کچھ دوسرے مزدور آچکے تھے۔ اور ان میں سے ایک مجھے بتا رہا تھا۔

"صاحب، یہ کس سے بات کر رہے تھے آپ۔ یہ بوڑھا تو پاگل ہے صاحب۔ یہاں آگے ڈیم پر کام چل رہا ہے۔ یہ بوڑھا بھی ہمارے ساتھ ہی کام پر جاتا ہے۔ جھونپڑی میں پتہ نہیں کپڑے میں کیا چیز باندھ رکھی ہے ـــــ اسے لپٹائے پھرتا ہے۔ اس کا دماغ پھر گیا ہے صاحب۔"

میں مزدور کی بات کا کوئی جواب نہیں دے پایا۔ اس لیے کہ ذہن میں عجیب سی ہلچل مچ گئی ہے۔ اتنے گہرے سناٹے میں ہوں کہ خود کو کبھی اتنا بے بس اور مجبور نہیں پایا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ۸۰ سال کی عمر میں یہ بوڑھا خود کو لاجو کی محبت سے دور نہیں کر سکا۔ کبھی کبھی انسان اپنی بے مطلب رائیگاں زندگی کسی بے کار مقصد کی تلاش میں بھی کاٹ دیتا ہے۔ خود سے جڑی ایک مضبوطی بھی اس مقصد کی طرف دھکیلتی ہے۔ آج محل نہ سہی، ایک جھونپڑا ہی سہی۔ اس بوڑھے نے آباد تو کر لیا ہے اور کس کے سہارے ......؟ فقط ایک مردہ وجود کے سہارے......اس محبت کے سہارے جو کبھی اس کی اپنی نہیں تھی۔ لیکن وہ سپنے تو دیکھ ہی سکتا تھا اور آج بھی دیکھ رہا ہے......

○○

آجکل، نومبر ۱۹۹۲ء

بوڑھے جاگ سکتے ہیں

اور وہ واقعہ ہو گیا جس کے بارے میں وِپن لال سوچتے تھے کہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن کیوں نہیں ہونا چاہئے تھا، کا جواب فی الحال ان کے پاس نہیں تھا...... آخر کیوں نہیں ہونا چاہیے تھا؟ وہ بہت دیر تک بلکہ کہنا چاہیے کہ دوسرے بہت سے سوالوں سے فارغ ہو کر جیسے بس اسی سوال پر لوٹ آتے۔ بالکل ہونا تو یہی چاہیے تھا۔ اور آخر بچوں نے انہیں سمجھ کیا رکھا ہے؟ ایک کھوسٹ بے کار بڈھا۔ بڈھے وہ خود ہوں گے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہوں تو چندیا کے کالے بال اب بھی ایسے چمکتے ہیں کہ جوان آدمی بھی رشک کھا جائے۔ اور ابھی بھی، انہوں نے جیسے خود کو چھو کر دیکھا اور مطمئن ہو گئے کہ ہاتھوں کی مچھلیاں اور پیروں کے پٹھے تو اس طرح پھڑکتے ہیں جیسے تالاب میں ایک ''ادھواڑ'' اچھال دو۔ پھر دیکھو جوش، حرکت اور ترنگیں۔ اور آخر انہیں ایسا محسوس کرنے کا حق کیوں نہیں ہے۔ اور انیل اُسے کیا چاہئے تھا، کہ اپنی ماں کے سامنے، اس سے، یعنی اپنے باپ سے اس طرح کے واہیات سوال پوچھے کہ آخر آپ...... انہیں تعجب ہے، آداب و اخلاق کے اس صفحہ پر آخر روشنائی کیسے گر گئی جس پر انگلی پکڑ کر بچپن میں انہوں نے انیل کو سبق رٹوائے تھے۔ نہیں...... انہیں کسی بات پر تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ مگر۔۔۔ ساٹھ سال کا ایک بوڑھا اپنی مرضی سے اپنی بیوی کے ساتھ سونا چاہے تو بچوں کی نظر میں اس میں حیرانی کی

کون سی بات ہے؟ کیا ساٹھ سال کے بڈھے کو...... نہیں وپن لال، گھر خاندان کا پورا جغرافیہ بدل چکا ہے اور تم بڈھے ہو چکے ہو...... ساٹھ سال کے...... ساٹھ سال مطلب، ایک بوڑھا کھوسٹ، سامنے ہر پل موت دیکھتا ہوا بڈھا اور بیوی بھی کیسی...... ساٹھ سال کے آدمی کی بیوی، جس کے چہرے کی جھریاں بدن کی جھریوں سے زیادہ اداس اور بے جان ہوں۔ بدن کے ڈھیلے، جھر جھر، لتھڑے ماس، جہاں جگہ بناتی ہوئید نیا بھر کی بیماریاں ہوتی ہیں اور ہوتی ہے بیزاری، لمبی تھکن...... ایسی بیوی جو زندگی کی سیڑھیاں در سیڑھیاں تجسّس کے سارے سوال طے کرتی ہوئی آخر میں بس ایک بے رس جواب رہ جاتی ہے۔ ایسی بیوی...... اور بچے پوچھتے ہیں...... آخر آپ کیوں سونا چاہتے ہیں، ساتھ ساتھ؟"

وپن لال اپنے آپ کو چھوڑ کر ٹٹول کر محسوس کرانا چاہتے ہیں کہ وہ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ لیکن اندر سے کوئی جھلا کر صاف انکار کر دیتا ہے۔ مان لو اگر عمر سو برس ہوئی تو؟ ذرا اپنے آپ کو غور سے دیکھو...... یعنی اگر چالیس برس اور ہوئی تو...... چالیس سال کی عمر بھی اپنے آپ میں بھگوان کی دی ہوئی نعمت ہے اور چالیس برس اپنے اندر کتنے ہی موسم، بچپن، لڑکپن، جوانی اور ادھیڑ پن کی داستانیں سمیٹے ہے...... کتنی کتنی داستانیں...... اندر سے کوئی چڑچڑا ہو کر گالیاں بکتا ہے۔ چہرے کے ماس بھنچ جاتے ہیں۔ ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔ وہ ایک بار خود کو چھو کر ٹٹولتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں۔ ریٹائر ہو گئے تو کیا ہوا؟ وہ ابھی جوان ہیں۔ اور ابھی بہت دنوں تک جوان رہیں گے اور جوان ہیں اس لیے...... کھانے میں کریلا انہیں کبھی پسند نہیں آیا۔ بڑھاپے کا احساس ان کے پورے وجود کو کریلے جیسا کڑوا بنا دیتا ہے۔ سب سے گھناؤنی چیز بڑھاپا ہے —— نہیں...... یہ جو عمر ہے...... عمر، جو دھیرے دھیرے بڑھتی ہے اور ہمارے معاشرے میں ۴۰ پار کرتے ہی اس شخص کو طرح طرح سے دیکھنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ دیکھا، بڈھا کیسے گھور رہا تھا۔ فلاں کی عورت سے کیسے مزے مزے کی باتیں کر رہا تھا۔

غیر ممالک میں تو اس عمر میں آکر تجربے سانس لیتے ہیں۔ معنویت گہری اور پختہ ہوتی ہے۔ عورتوں کا رجحان بھی ایسے تجربہ کار بوڑھوں کی طرف مخصوص ہوتا ہے۔ مگر ان کے یہاں اس ملک میں......اب یہ اڑوس پڑوس کی گندی ذہنیت والے، ذرا باہر نکل کر فلم انڈسٹری کی طرف نظر ڈالیں۔ دھرمیندر ہے، دلیپ کمار ہیں، جیتندر ہیں۔ اس عمر میں کیا کیا لٹکے جھٹکے ہیں۔ ہیروئنوں کے ساتھ باغوں میں مٹک مٹک کر گانا ہو رہا ہے......اور وہ......وپن لال اس عمر میں سٹھیا گئے ہیں۔ گانا چھوڑ تفریح کے لیے دو بول نہیں بول سکتے۔ آخر کیوں بھئی۔ کیوں کہ وہ ساٹھ برس کے ہو گئے ہیں۔ اس لیے...... ساٹھ برس، مطلب ایک مقدّس ہستی......اور بچوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اس مقدّس ہستی کی پرتیما بنا کر، گھر کے کونے کھدرے میں ڈال کر ان کی توہین کر سکیں۔ اپنے دل کی بھڑاس نکال سکیں۔

ولوڈیئر......وپن لال کا شارٹ فارم ہے۔ جب کبھی تنہائی میں ہوتے ہیں تو مزے لے لے کر خود کو اس نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور خوش ہوتے ہیں......ولوڈیئر۔ وہ خود مسکراتے ہوئے کہتے ہیں...... جانتے ہو اس عمر میں بوڑھے لوگ متقی اور پرہیز گار کیوں ہو جاتے ہیں...... نہیں جانتے......ہاہا......تو سنو...... نہیں، تم ہنسنے لگو گے...... حیرانی کی بات نہیں ہے ولوڈیئر...... بڑھاپا آیا تو محسوس ہوا جوانی کے سارے گناہ ایک طرف۔ اب جو یہ بڑھاپا سامنے ہے...... یہ بڑھاپا......اس کا احساس، یہ سب سے بڑا گناہ ہے......اور ولوڈیئر......ہنسو نہیں۔ یہ انکشاف ہوتے ہی کئی بوڑھے بستر پکڑ کر عبادت اور دھرم سے ناطہ جوڑ لیتے ہیں...... نہیں یقین ہے تو بتاؤ......بوڑھے آدمی کو لوگ عبادت اور شردھا کی وستو کیوں بنا دیتے ہیں۔ کیوں کہ گھر کا ایک آدمی گودام میں رکھے پکے آم کی طرح زندگی کی اتنی گرمی کھا چکا ہے اور اتنا سنکی اور بوڑھا ہو چکا ہے کہ بس آشیرواد دینے اور پاپ پنیہ کی باتیں چھوٹوں کو بتانے تک زندہ ہے۔ وپن لال ہنسو نہیں۔ اب تمہیں بھی بچوں نے ایسی ہی پرتیما بنا کر گھر کے کونے کھدروں میں ڈال دیا ہے...... آشیرواد دینے اور پاپ پنیہ کی باتیں سنانے کے لیے۔

وپن لال کو لگتا ہے جیسے سب انہیں چڑھا رہے ہوں......انہیں جی بھر کر غصہ آتا ہے۔ پاگل ہیں سب کے سب......بدھو، بے وقوف، جبکہ سب کے سب جانتے ہیں، سب کو بوڑھا ہونا ہے ایک دن۔ اگر بوڑھے ہونے سے پہلے مر نہیں گئے تو......پھر جب انہیں بھی ان کی ہی طرح عقیدت کے دار پر چڑھایا جائے گا تو؟ الّو کے پٹھے! باہر سے ہنستے ہنساتے آئیں گے اور ان کے سامنے آتے ہی پتھر بن جائیں گے......ہنسی، قہقہوں اور رنگینیوں کی باتیں ایسے رک جائیں گی جیسے عبادت گاہ میں ہاتھ میں چپل لیے احترام سے داخل ہو رہے ہیں......جیسے سب انہیں چڑھانے بیٹھے ہوں کہ دیکھ بڈھے ہم سب تجھے تیری سیمائیں بتاتے ہیں۔ بس یہاں تک......اس کے آگے ہماری اپنی آزادی کا شہر ہے اور اس شہر میں ہماری بے باک ہنسی ہے۔ زندہ دلی اور قہقہے ہیں اور عریاں مناظر کی نشیلی وادیاں ہیں......

عریاں مناظر۔ بوڑھی نسوں میں کھنچاؤ کے لیے کچھ تو چاہیے......شریانوں میں دوڑنے والے گرم گرم خون کے لاوے کو محسوس کرتے ہیں وہ......سب کی سب، آس پاس گھومتی لڑکیاں ان کی بہو بیٹیاں اور پوتیاں تو نہیں ہیں......پھر گرما گرم خیال کے تندور میں سینکی جانے والی روٹیوں تک ان کی پہنچ کیوں نہیں ہو سکتی؟ کیا جل جائیں گے وہ......یا ذہن کچوکے لگانے لگے گا کہ سالے بڈھے حرامی پن سے باز آ......دیکھ اپنی عمر......اس عمر کی تیری پوتیاں ہیں۔ بہو ہے۔ لڑکیاں ہیں......یہ سب ان کی سنسکرتی میں سمائی جھوٹی آستھائیں ہی تو ہیں......سب بھلا ایک کیسے ہو سکتی ہیں۔ بٹی بیٹی ہے، بہو بہو ہے، غیر تو غیر ہیں......سب ایک ہوتے تو بھلا وہ سمبندھ کیسے ممکن تھے۔ نہیں وپن لال......غلط اگر غلط ہوتا تو من میں وچار ہی کیوں اٹھتے۔ جب کنوارے پن میں یہ وچار آتے تھے تو سوچتے تھے چلو اب نہیں آئیں گے۔ نلنی آ گئی تو سوچا چلو ایک زندہ کتاب آ گئی ہے۔ کھیلنے، خوش ہونے کو____ بستر سے سانٹھ گانٹھ رکھنے اور دوستی نبھائے جانے والے، بھٹکتے سلسلوں کو ایک منزل ضرور مل گئی......مگر منزل کہاں......خیالوں کی حسین آوارگی کی اپنی جنت ہے اور یہ جنت تو عمر کے ہر دور

کو ذائقہ دار، لذیذ ترین کھانے کی طرح پسند ہے......

وقت گزرا۔ سال پر سال گزرے......انیل، وکاس اور لجّو کے ساتھ ذمہ داریوں کی پتوار بھی سنبھالنی پڑی۔ مگر وہ بھٹکتے سلسلوں والی آوارگی کی حسین جنت...... مسائل اور الجھنوں سے گھبرا کر وہ اس جنت کے اسیر ہو جاتے اور ایک ندامت بھرے لطف میں اپنی الجھنیں پیوست کر کے آزاد ہو جاتے۔ تین بچے...... عمر کی ڈالی جیسے اچانک پھلوں سے بھر گئی اور جھک گئی—— جھول گئی ہے—— پھل نہیں آئیں تو کہاں جھکتے ہیں پیڑ۔ بچوں میں پر پھوٹتے رہے اور بچوں میں پھوٹتے پروں کو، موٹی موٹی کتابوں سے بھرے تھیلوں کو دیکھتے دکھاتے بھی وہ اپنی تلنی میں جیتے ضرور تھے اور اپنی مخصوص دنیا میں بھی—— جہاں گھر، بال بچوں کی فکر سے بے نیاز عریاں مناظر کی نشیلی نشیلی وادیاں ہوا کرتیں اور پھر جیسے پانی میں ایک پتھر چمکا۔ موجوں میں کچھ دیر ہلچل مچی اور ایک لہر ساری لہروں کو ملاتی ہوئی شانت اور غائب ہو گئی۔ دپن لال کو کچھ بھی بُرا نہیں لگتا...... کہ اپنی گھر گرہستی کے بعد آوارگی کی اس حسین جنت میں داخل ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے...... وہ کبھی جرم اور گناہ کے بہاؤ میں نہیں گئے۔ وہ اسے بھی ایک ضرورت مانتے تھے اور کبھی کبھی تو تلنی کے مچلنے پر مذاق میں کہہ دیتے......"آج نہیں، ارے کیا بتاؤں آج تو تمہاری دودھ والی یا وہ جو ترکاری سبزی بیچنے آئی تھی اس کے سنگ، یا مسز فلاں کے ساتھ یا پڑوس کی نئی گورنس کے ساتھ خیالی سیر سپاٹے کو نکل گئے تھے۔ بس......"

"بک......" تلنی آ ...ھیں تریرتی تو وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑتے۔ کبھی سناٹے میں جب سارا شہر سو جاتا، تلنی اس کے کھلے سینے کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی پوچھتی......

"ایسا صرف تم کرتے ہو یا دوسرے مرد بھی......؟"

"کیا جانوں۔ پر سب کرتے ہوں گے۔ کیوں، تم لوگ...... تم لوگ نہیں کرتی ہو کیا؟"

نلنی خفا ہوتی تو وہ ہنستا ہوا کہتا۔ ''نہیں اس میں برا ہی کیا ہے......رہنا تو ہم تم دونوں کو ساتھ ہی ہے۔زندگی بھر——میں کسی دوسرے کے پاس تو نہیں گیا۔ کسی کے پاس پہلے تو تم جانے ہی نہیں دوگی۔دوسرا احساس گناہ...... بچپن سے کھونٹ کی طرح خود سے باندھا گیا احساس...... پھر نلنی ذرا خود ہی سوچو......رہنا سہنا سب کچھ تمہارے ساتھ ہی ہے اور روز بس ایک سی یاترا۔یہ یاترائیں بھی کچھ نیا چاہتی ہیں......''

پھر وہ دیر تک ہنستا ہے...... ''بتاؤ۔ مت بتاؤ نلنی۔۔۔پر تم لوگوں نے بھی ایسا کوئی راستہ ضرور نکالا ہوگا۔ لیکن تم عورت ہونا۔پیٹ رکھنے والی......''

وہ دیر تک ہنستے ہیں۔

ولوڈیئر۔ چلو سو جاؤ...... نیند نہیں آرہی تو ویلیم فائیو لے لو...... لیکن سو جاؤ...... نہیں سوتا۔ کیا کرلو گے۔بوڑھے کو خود پر جھلاہٹ ہوتی ہے۔یوں بھی بستر پر لیٹ جانے کے بعد ہوتا ہی کیا ہے...... ساٹھ سالہ زندگی کی ضخیم کتاب کھل جاتی ہے۔اور اس کتاب کے اتنے باب ہوتے ہیں کہ ......اور کیسے کیسے باب...... بھیانک، جذباتی، رنگارنگ۔۔۔تب کی نلنی کا،ایک ایک رنگ انہیں یاد ہے۔۔۔بچوں کی شادی تک یہ رنگ ان کے چہرے کو کیسا شاداب، تروتازہ اور گرم رکھتا تھا۔۔۔رات میں نلنی کا ملائم سا بدن بے خیالی میں ان کے بدن پر ایسے پسرا ہوتا کہ نیند کھل جاتی تو وہ بس زیر لب معصوم تبسم کے اس منظر کو آنکھوں کے حسین فریم میں سجا کر زندہ کر لیتے۔۔۔اور پھر صبح خوشبو کی طرح لہراتی تو نلنی چائے کی قلفی تھامے کھڑکی سے جھانک رہی چور، شرارتی شعاعوں کی طرح اسے گدگدانے،اُٹھانے پہنچ جاتی......

''اٹھو......چائے پی لو......''

"نہیں......ابھی سونے دو، نا......"

"ارے اٹھو۔ بچے کیا کہیں گے۔ تم دیر سے اٹھو گے تو بچوں پر بھی برا اثر پڑے گا۔"

سپنا، ایسے ٹوٹتا ہے...... بچے، بُرا اثر......اچھی بھلی زندگی اور زندگی کی رعنائیوں کو بچوں کی خوشیوں کے آگے بھینٹ کیوں چڑھائی جاتی ہے۔؟ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ یہ مت کرو۔ وہ مت کرو۔ ساتھ مت سوؤ۔ کمرہ مت بند کرو۔ دیر تک بیوی کے ساتھ کمرے میں مت رہو۔۔۔ آخر کیوں بھائی۔۔۔ بچے آگئے تو کیا ماں باپ کی زندگی کا سارا گلیمر ختم ہوگیا۔ ارے ان کی اپنی بھی زندگی ہے۔ حقیقت سے بھری زندگی۔ اور یہ دو آنکھیں جو بچوں ہی کی طرح مسرت اور نت نئی لذتوں سے ہم آہنگ ہونا چاہتی ہیں۔۔۔ بڑھتی عمر کا مطلب یہ تو نہیں کہ ان سارے احساسات کو کچل دیا جائے۔۔۔ ارے کل کو ان کی بھی شادی ہو گی، ان کے بچے ہوں گے۔

تلنی ان کی باتیں سن کر ہنستی ہے۔۔۔ "تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ خیالی بستی تو ہے ہی تمہارے پاس۔ گھومنے پھرنے کو۔ میرے سامنے مجھے بتائے بغیر بھی اتنی آزادی چھین سکتے ہو تم۔ خیالی بستی والیاں چلی تو نہیں گئیں۔"

"چلی گئیں۔" ان کو ہنسی آتی ہے۔ "وہ بھی بوڑھی ہو گئیں ہماری طرح۔۔۔"

"پھر۔۔۔ اب کیا کرتے ہو؟"

"اب نئی بستیاں آباد ہیں۔ وہ پڑوس والی اجیت کور ہے۔ شانتا منمو ہن ہیں اور وہ نتاشا ـــــ"

"نتاشا۔" تلنی نے پہلی بار سچ مچ کھا جانے والی نظروں سے دیکھا ـــــ "تمہیں خبط ہو گیا ہے۔ وہ تمہاری لجّو کی سہیلی ہے۔"

"لجّو کی نا ـــــ؟"

تلنی کی آنکھوں میں الجھنوں کی پھوٹتی چنگاریاں تھیں۔۔۔ "لجّو تمہاری بیٹی ہے۔ اور نتاشا تمہاری بیٹی کی عمر کی۔"

پہلی بار لگا، تلنی نے مذاق میں ہاتھ نہیں بٹایا۔ ہنسی میں ساتھ نہیں دیا۔۔۔ آنکھیں کسی نشتر کی طرح آنکھوں میں چھپے کسی بوالہوس بوڑھے کی ٹوہ میں ہیں کہ وہ بوڑھا سامنے دکھے تو اس کے ہوسناک تیور کی خبر لی جائے۔ ونپن لال کی آنکھوں میں اسی دم اندر بسنے والا وہ خوش مذاق جوان ریت کے تودوں کی طرح گرتا، تڑپتا اور بے دم ہوتا ہوا دکھائی دیا۔

تلنی سنجیدہ تھی——"یہ مذاق بہت ہو چکا۔ اب تمہیں ایسا......"

کوئی پگھلا ہوا سیسہ ان کے کانوں میں انڈیل رہا تھا۔ "نہیں سوچنا چاہیے۔۔۔ کیوں کہ ...... کیونکہ تم ایک بڈھے خرانٹ ہو۔۔۔ ایک جوان لڑکی کے باپ ہو۔۔۔"

انہیں احساس ہوا مذاق پچانے والی عمر سے باہر نکل گئی ہے تلنی۔۔۔ جہاں اس کے چہرے کی جھریاں، اس کے چہرے پر رجھاتی بڑھتی عمر کی لکیروں سے زیادہ تجرباتی، مقدّس اور عمر دراز ہو گئی ہیں۔۔۔ اتنی مقدس کہ اب یہ حسین آوارگی کے قصے اس کے سخت ہوتے رخسار پر منقش نہیں کئے جا سکتے۔۔۔ تلنی میں ایک بوڑھی عورت آگئی ہے۔ اس سے زیادہ عمر کی ایک بوڑھی عورت جو ایسے مذاق پر انہیں گھور کر دیکھتی ہے۔ بچوں کی اونچ نیچ پر پھنکار برساتی ہے۔ لجّو کی الٹی سیدھی حرکتوں پر اسے بُری طرح جھڑکتی ہے اور بوڑھی ہو کر......"

بس، تلنی کی اس بڑھتی عمر سے پہلی بار خوف محسوس ہوا تھا انہیں۔۔۔ اور اپنے گرد ایک حصار کھینچ کر بیٹھ گئے تھے وہ۔۔۔ ہنسی قہقہوں کی باتوں کو دفتر سے واپس آتے ہی، سلانے لگے تھے۔۔۔ کتابوں میں، بچوں کے حال چال میں، ان کی پڑھائی کی

رپورٹ میں۔۔۔ ملنے جلنے والے رشتہ داروں میں ــــــ اور یہ حصار دھیرے دھیرے وہ گھر باہر دفتر سب جگہ کھینچنے پر مجبور ہو گئے۔ کیونکہ اب لجّو بیاہنے کو آ گئی تھی اور وہ رنگین مزاجی کے الزام سے بھی بچنا چاہتے تھے۔

اس عمر میں اپنی ہی بنائی ہوئی سولی پر چڑھنے کا احساس بھی کم خوفناک نہیں ہوتا۔۔۔ ویپن لال گھوم پھر کر نتاشا والی کہانی پر لوٹ آتے۔۔۔ ارے لجّو کی دوست ہے تو کیا۔۔۔ وہ جان بوجھ کر تھوڑے ہی گئے تھے خیالی بستی میں۔ اس عمر میں تو خود پر اتنی گرفت رہتی ہی کہاں ہے اور حرج ہی کیا ہے۔۔۔ نتاشا جب گھر آتی ہے تو بیٹی بیٹی کرتے ان کا بھی منہ نہیں دکھتا۔ تنہائی میں ضمیر اور اصول سے بھی تھانے دار کے سے انداز میں نبٹ چکے تھے وہ۔ قاعدے قانون اور مذہب کی پڑھی کتابیں بھی کھول کر تنہائی میں بڈھے کو ندامت کا احساس دلا چکے تھے، مگر نہیں۔۔۔ تلنی کی نظروں میں یہ جرم ثابت ہو چکا تھا۔ اب نتاشا آتی تو تلی جیسے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتی۔ 'وہ کیا کر رہے ہیں۔ کہاں گئے ہیں۔ کہاں دیکھ رہے ہیں.... '

ویپن لال سے برداشت نہیں ہوا تو وہ ایک دن غصے میں برس پڑے۔ میں نے تو مذاق کیا تھا۔"

تلنی گم سم سی انہیں دیکھتی رہی تھی۔ جیسے یقین اور بے یقینی کے بیچ کی کھائیاں ناپ رہی ہو۔۔۔ وہ انہیں سمجھانا چاہتے تھے کہ تلنی...... ہر ذہن کا اپنا ایک چور دروازہ ہوتا ہے۔ سب کا ہوتا ہے...... تمہارا بھی ہوگا۔ خود کو ٹٹولو۔۔۔ تب جانو۔ اور یہ دروازہ عمر کے ہر پڑاؤ پر کھلا رہتا ہے۔ سوال تو صرف اس دروازے میں داخل ہونے کا ہے۔ اب دیکھو۔۔۔ اصولوں، قاعدوں، قانونوں میں لپٹے ہم کتنے کمزور ہوتے ہیں کہ اس دروازے میں جھانکنے، داخل ہونے سے بھی خوف کھاتے ہیں۔ اب اگر اس چور دروازے میں اپنا بڑھاپا کچھ دیر کے لیے آرام کرنا چاہتا ہے تو ــــــ اسے روکو مت ــــــ ٹوکو مت......"

لیکن غلط کون تھا؟ ہاں جو چور دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ وہاں سے بیچ بیچ کا ایک بڈھا ان

کے اندر اتر آیا تھا۔ وقت کافی گزر چکا تھا۔ بچے کام دھام سے لگ گئے تھے۔ لجّو کی شادی کی فکر تھی۔ سو اس کی شادی بھی خوب دھوم دھام سے کر دی۔ ہاں لجّو کی بدائی کے بعد سچ مچ ٹوٹ گئے۔ آئینہ میں چہرہ دیکھا تو ٹھٹھک سے گئے ــــــــ لگا، سامنے ایک بوڑھا کھڑا ہے، اور بوڑھے کے سامنے کھڑی ہے۔۔۔اس کی موت۔ عمر جو دن دن جوڑتی ہے اور کم ہوتی جاتی ہے......ہاں بوڑھا ہو رہا ہوں......ولو ڈیئر۔۔۔ چڑچڑے ہو کر انہوں نے خود کو ڈانٹا۔ لیکن یاد رکھو ولو۔۔۔بوڑھا نہیں ہوں گا۔۔۔ نہیں ہوں گا......بستر پر آئے تو آوارہ خیالوں کی آندھی چل رہی تھی۔ اس آندھی سے لڑتے ہوئے وہ سچ مچ ہانپ رہے تھے۔ تھوکتا ہوں تم پر...... آخ تھو...... تم سڑے ہوئے آدمی ہو۔ کتے ہو تم...... جیسے ضمیر کو ہوش آگیا تھا۔ وہ خود سے لڑ رہے تھے۔ ہاں تھوکتا ہوں تم پر...... جیسے چاروں طرف سے، اچھالی گئی تھوک سیدھے ان کے منھ پر گر رہی تھی...... پہلی بار وہ جسمانی کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ اس قدر کہ اب وہ میڈیکل چیک اپ کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ ہانپتے ہوئے وہ تلنی کے کمرے میں آئے ــــــ تلنی کے پاس بیٹھنا چاہا تو وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ایسے کیوں آگئے۔۔۔انیل، و کاس کوئی آگیا تو......"

"ہاں۔۔۔مجھے نہیں آنا چاہیے تھا۔" وہ کمزور آواز میں بولے۔ "مجھے سچ مچ نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ تم بڑھاپے سے سودا کر چکی ہو۔"

پھر وہ وہاں رکے نہیں۔۔۔اپنے کمرے میں واپس لوٹنے تک لگا، پہلی بار ان میں کوئی موج، کوئی ترنگ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ دریا میں 'ادھواڑ' اچھالنے کے بعد بھی۔۔ نہیں۔۔۔وہ ڈاکٹر سے رجوع کریں گے۔ کسی اچھے Sexologist سے۔ اب وہ مطمئن تھے۔ انہیں اپنے دوستوں پر حیرت ہوتی تھی۔ جو روگ کو بس ڈھوئے جاتے

تھے ـــــ ندامت، بچوں کی بڑھتی عمر اور حیرت کے منوں ٹن وزنی بوجھ سے دبے، گھٹ گھٹ کر اپنی زندگی ختم کر دیتے تھے۔ اپنی زندگی، جس کا بچوں اور بچوں کی زندگی سے الگ بھی ایک حسین اور انفرادی تصور ہے۔۔۔ بچے بھلا اپنی دنیاؤں سے ان بوڑھوں کے لیے کتنا وقت چرا پاتے ہوں گے۔ اور ایک یہ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ بوڑھے لوگ۔ موت سوچتے سوچتے بچوں کے سامنے ختم کر دیتے ہیں۔ اپنی بے رنگ زندگی۔۔۔ اور سچ پوچھو تو سارا قصہ بس ڈاکٹر کے یہاں سے نکلنے کے بعد ہی شروع ہوا تھا۔

وقت کی سوئیاں کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھیں۔ بچے اپنے اپنے حصوں کی ذمہ داریوں پر دستخط کر چکے تھے۔ اب ان کی اپنی دنیائیں آباد تھیں۔ ان کے سکھ میں ان کا حصہ اتنا بھر ہو تا کہ وہ بچوں سے خیریت پوچھ لیتے۔ منا کیسا ہے۔ بہو کی طبیعت کیسی ہے۔ ڈاکٹر نے کیا کہا۔ ایسے میں وہ نلنی کو دیکھتے۔۔۔ وہ بجھی بجھی سی ہوتی۔ نہیں بجھی نہیں۔ اپنے آپ میں سمٹی۔۔ اپنی عمر سے تھکی۔ وہ جیسے ابھی سے موت کو سمریت تھی۔ بچوں کے بچوں میں الجھی اور کھوئی کھوئی ـــــ نلنی وکاس کی بچی اشونی کے ساتھ چھوٹی دالان میں سوتی تھی۔ چھوٹی سی کوٹھری ـــــ عمر نے یہ بھی کرشمہ کیا تھا کہ اب وہ اوپر کے دالان میں سوتے تھے۔ نلنی کی کوٹھری میں ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا۔ اور ان کا اپنا کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا۔۔۔ موت کے بارے میں ان کا اپنا الگ نظریہ تھا۔ جیسے وہ سوچتے تھے کہ جو چیز ابھی نہیں ہے اس کے بارے میں زیادہ کیوں سوچا جائے۔۔۔ ہو سکتا ہے۔ باقی بچی زندگی میں ایک لمبی زندگی چھپی ہو۔۔۔ تو اس باقی بچی زندگی کو اداس، بے رنگ کیوں کیا جائے۔ وہ باقی بچی زندگی کو پنیہ کمانے کے ڈھونگ سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے خوب پڑھتے تھے۔

وہ سمجھتے تھے، میڈیکل چیک اپ ہونا ضروری ہے۔۔۔۔۔۔ Sex ایک ضروری چیز ہے۔۔۔۔۔۔ ہاں، یہ الگ بات ہے کہ کہیں شادی کے بعد، ایک سمجھوتہ کر لینا پڑا ہے۔ اندر حرارت تو ہونی چاہیے تھی۔ تمازت اور حرارت کہ اپنے مرد ہونے کا احساس بنا رہے۔ آخر بوڑھوں کو یہ حق، حاصل کیوں نہیں ہے۔ Sexologist کے یہاں سے نکلنے تو

انیل کے دوست وِل سے ملاقات ہوگئی، جو آنکھیں ترچھی کر کے طنز بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں کسی کی بھی بے جا مداخلت کو پسند نہیں کرتے تھے۔

لیکن اس دن وہی ہوا جو انہوں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ شام کو دفتر سے آ کر انیل نے ٹوکا۔

"بابوجی۔۔۔ آپ ڈاکٹر اشوک کے پاس گئے تھے؟"

"ہاں"

"لیکن وہ تو......" انیل کہتے کہتے ٹھہر گیا۔

"Sexologist" ہے......" ان کی آواز نپی تلی تھی۔

"ہاں وہی تو مجھے حیرت ہوئی۔" انیل اپنے کمزور لفظوں سے پریشان تھا۔ یا شاید باپ کے سامنے کچھ اس طرح کی باتوں کے اظہار کے لیے لفظ نہیں جٹا پا رہا تھا۔۔۔ "آخر آپ وہاں......؟"

اس نے نظریں نیچی کر لیں۔

ویپن لال نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ "کچھ پرابلم تھی اس لیے۔۔۔"

"کوئی پرابلم تھی تو مجھے بتاتے۔۔۔ میرے کئی ڈاکٹر دوست جاننے والے ہیں......"

"نہیں پرابلم کچھ دوسری طرح کی تھی۔"

انہوں نے دیکھا۔ انیل نے کچھ سمجھنے کے لیے آنکھیں ملانے کی کوشش کی۔ مگر ان آنکھوں کا درجہ حرارت کچھ اتنا زیادہ تھا کہ وہ تاب نہ لا سکا اور خفگی اوڑھے اپنے کمرے میں لوٹ گیا ــــــ رات میں کھانا لگا تو انہوں نے دیکھا انیل کتنی ہی بار چور نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتا رہا...... جیسے پس و پیش میں ہو۔ آخر بابوجی کو......ایک کشمکش ان کے اندر بھی چل رہی تھی۔ زندگی کے اتنے پڑاؤ میں کبھی اس طرح کے بے جا سوال سے ان کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ آخر بچے سمجھتے کیا ہیں ــــــ Sexologist کے

یہاں جانے میں برائی ہی کیا تھی۔۔۔ آخر اس عمر میں اپنے جذبات کو سلانے کا اپدیش گیتا کے کس ادھیائے میں دیا گیا ہے۔۔ نہیں۔۔۔وہ اپنے طور پر مطمئن تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر انگریزی کی جاسوسی کتاب لیے دیر تک پڑھتے رہے۔ خیالوں میں خون کا گرماگرم رقص جاری تھا۔ انہیں اپنی دنیا کو مایوس اور پیروں فقیروں کی دنیا بنانے سے سروکار نہیں تھا۔۔۔وہ اس عمر میں بھی زندگی کی تمام رعنائیوں اور دھڑکنوں کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ ٹھیک اپنے جوان بچوں کی طرح۔۔۔اور وہ اپنے آپ سے پوری طرح مطمئن تھے۔

ڈاکٹر کی دوائی نے اثر دکھایا تھا۔ وقتی طور پر جو کمزوری اور تھکان ان کے اندر پیدا ہوئی تھی وہ کسی قدر دور ہو گئی تھی۔ دو چار روز میں ہی وہ خود کو پہلے سے بہتر محسوس کر رہے تھے۔ انہیں انیل سے زیادہ اپنے معاشرے میں بوڑھوں کے لیے پیدا کئے جانے والے احساس سے شکایت تھی۔ اچھا برا دیکھنے اور سمجھنے کی نگاہ نے ہی تلنی اور انہیں تقسیم کر رکھا تھا۔۔۔ایسا نہیں ہے، ان کے کئی دوست اپنی بیویوں کے ساتھ آج بھی سوتے تھے، مگر اس معاملے میں تلنی ہی کچھ زیادہ دھارمک اور دقیانوسی ثابت ہوئی تھی یا پھر بڑھتی عمر اور بچوں کے بچوں کو کھلانے والے احساس نے اسے کسی گمراہ کن مغالطے میں ڈال رکھا تھا۔ پرانی کتابوں کے پنوں سے جل کمبھیوں کی طرح ملائم اور ریشم جیسی تلنی نے سر نکالا تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ اب تو تلنی کو دیکھے ہوئے بھی مدّت ہو جاتی ہے اور جب سے تلنی نے نیچے اکیلے سونا شروع کیا ہے تو جیسے ان کی دنیا ہی بدل گئی۔۔۔اب پوچھتی تک نہیں کہ چائے ملی یا نہیں؟ چائے میں کتنی شکر لو گے۔۔ دنیا کیوں بدلتی ہے ولو ڈیئر۔؟

وہ خود سے یہ پوچھ رہے تھے۔۔۔ بدلتی اس لیے ہے ڈیئر کہ تم دنیا کو اپنی نظروں میں اداس اور بے رنگ کر دیتے ہو۔ جیسے تلنی نے، جیسے اس نے اب تمہارے ذکر تک کو چھوڑ دیا ہے۔ پہلے بستر کی سلوٹوں پر ہاتھ پھراتی تھی۔ ہولے ہولے۔ اور خمار آلود آنکھوں سے صبح صبح چائے کی قلفی لے کر آتی تھی......وہ رومانی قصے بڑھتی عمر کی

جھریوں میں کیوں چھپ گئے ؟اس لیے کہ بچوں کی دنیا کو حسین بنانے کے پیچھے تم اپنی دنیا کو بھول گئے۔۔۔

نہیں۔۔۔اس دنیا کو زندہ کرنا ہوگا۔۔۔

وہ ایک مضبوط فیصلے کے تحت کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دروازہ کھولا۔ جذبات کی گرمی نے ان کے اندر کے تندور میں آگ لگادی تھی۔ نلنی کے کمرے تک گئے۔ کمرہ ہلکا سا بھڑا ہوا تھا۔ انہوں نے دروازے کو آہستہ سے کھولا۔ سامنے نلنی وکاس کی بچی اشونی کو جھری بھرے بازوؤں میں دبائے بے فکر خرّاٹے بھر رہی تھی۔ سینے سے آنچل ڈھلکا ہوا تھا۔ ٹخنوں تک ساری اٹھ گئی تھی۔ کچھ بھی ہو وہ اس منظر کو جوان احساس کے سہارے دیکھنا چاہتے تھے۔ ہاں جوان احساس کے ......اور گرم گرم انگاروں پر چلنا چاہتے تھے ......وہ جی بھر کر دیکھتے رہے۔۔۔ لیکن وہ اس طرح کیوں دیکھنا چاہتے ہیں۔؟ کسی اجنبی لڑکی کو، خواہ وہ تماشا ہی کیوں نہ ہو، گھورتے تو کوئی بات بھی تھی، مگر وہ عورت جو چالیس برسوں تک پل پل ان کے پاس رہی۔ جس کے جسم کے ہر حصے، ہر سرد و گرم کو بخوبی پہچانتے ہیں۔ وہ اسے اس طرح ......اچانک وہ ٹھہر گئے۔۔۔ جیسے برف کی سلّیوں میں، اچانک گرم گرم آتشدان سے نکلی سرخ لوہے کی تیلی پیوست کردی گئی ہو اور گرم گرم بھاپ سے برف پگھلی ہو ......اندر تک......اور گرم تیلی برف میں گھستی چلی گئی ہو۔۔۔انہوں نے محسوس کیا۔ ہاں نلنی میں ابھی گرمی باقی ہے اور بچوں کے ڈر سے اپنی بزدلی کی جھریوں میں وہ اس گرمی کو پی کر بھول گئی تھی۔

دوسرے دن کھانے پر انہوں نے فیصلہ کن انداز میں وکاس سے کہا۔

"اشونی کو آج سے اپنے پاس ہی سلاؤ۔"

بہو نوالہ لیتے لیتے ٹھہر گئی____

"اماں کو کچھ پریشانی ہے کیا؟"

"نہیں۔" وہ دھیرے سے بولے۔ "مجھے پریشانی ہے۔"

"بابو جی...... دراصل مجھے دقت ہو جاتی ہے۔ صبح میں دفتر جلد جانا پڑتا ہے۔۔۔"

وکاس بے چارگی سے انیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بہو دھیرے سے بولی۔ "کمرے میں مچھر زیادہ ہیں۔ اماں کو وہاں آرام نہیں ہے کیا؟"

انیل نے کچھ شک سے ان کی طرف دیکھا "اماں آج کل زیادہ کھانسنے لگی ہیں۔ اس وجہ سے تو نہیں۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" لقمہ ہاتھوں میں لے کر انہوں نے انیل، وکاس اور دونوں بہوؤں کو دیکھا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

انیل اور وکاس اب بھی حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔۔۔ وہ جیسے اندر ہی اندر رڑھ رہے تھے۔

"آخر بوڑھے آدمی کو بوڑھی بیوی کی ضرورت کیوں پڑتی ہے۔۔۔ تم کیا سوچتے ہو۔ میں نہیں جانتا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تم میرے یا ہمارے بارے میں کیا سوچ سکتے ہو۔۔۔ تم نئے زمانے کے ہو، وہ ذرا طنز سے بولے۔ "ماں باپ کے بارے میں یا یوں بھی اچھا برا کچھ بھی سوچنے کی نیتک ذمہ داری تمہاری ہے۔۔۔ رہی ہماری بات ۔۔۔ کئی دنوں سے سوچ رہا تھا۔ تم لوگوں سے پوچھوں۔ ایک آدمی کنبہ میں بوڑھا ہو جاتا ہے تو تم یہ کیوں سوچتے ہو کہ وہ ابھی مر جائے گا۔۔۔ یا اس کے مرنے میں بہت کم دن باقی ہیں۔ ایسا تم پورے وثوق سے کیسے سوچ سکتے ہو؟"

انیل نے شک کی حالت میں انہیں ٹٹولا۔ "میں سمجھا نہیں بابو جی۔"

"سمجھو گے بھی نہیں۔۔۔" انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس لیے کہ تمہاری ماں اور ہم میں سے کسی کے بارے میں ابھی یہ طے نہیں ہوا کہ ہم بس مرنے والے ہیں۔۔۔ اور جب مرنے والے نہیں ہیں تو ساتھ رہیں گے۔ اور رہی ضروری

بات تو رات برات ہم دونوں کو اٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں پتی پتنی ایک دوسرے کے لیے سہارا ہوتے ہیں۔"

انہوں نے دیکھا۔ اس آخری جملے سے انیل اور وکاس کے چہرے پر پڑی ہوئی کائی چھٹی تھی۔ گو اب بھی ان کے چہرے بنے ہوئے تھے۔۔۔ جیسے اندر ابھی بھی اتھل پتھل مچی ہو۔۔۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر دروازے کے پاس نلنی اشونی سے کھیل رہی تھی۔

رات ہو گئی۔ انہیں لگا جیسے کسی پر اسرار طلسم کو توڑتے ہوئے وہ خواب کی دنیا میں واپس آگئے ہوں۔ شاید برسوں بعد۔۔۔ برسوں بعد نلنی کے جھری بھرے بدن کی ٹھنڈی آگ چیخی تھی۔ وہ آج بڑھاپے کے احساس کو ایک دم سے بھلانے پر تلے تھے۔ انہوں نے نلنی کو چھیڑا بھی۔ گدگدایا بھی۔ موج میں آئے تو شرارت سے کمرے میں دوڑایا بھی۔۔۔ جیسا کہ وہ شادی کے وقت تھے۔ وہ بالکل بچہ بن جانا چاہتے تھے۔ جیسے نلنی کوئی شہزادی ہو اور شہزادی دیو کے قلعے میں قید ہو۔ وہ نلنی کو اس قید سے کسی شہزادے کی طرح چھڑا کر لائے تھے۔ اور اس فتح کا بھرپور جشن منانا چاہتے تھے۔ وہ موج میں تھے۔ کبھی چٹکلے سناتے۔ نلنی زور سے ہنستی تو انہیں اچھا لگتا۔ انہوں نے پوچھا۔

"اتنے دنوں تک چپ کیوں رہیں؟"

نلنی ہنسی۔ "بچوں میں یاد ہی نہیں رہا کہ ہماری بھی......" وہ اٹک سی گئی۔ "اب تمہاری طبیعت کیسی رہتی ہے؟"

"بالکل چنگا۔" وہ ہنسے۔

"نہیں دبلے ہو گئے ہو۔۔۔" نلنی کے چہرے پر اداسی تھی۔ "غلطی میری بھی تھی۔ تمہاری چنتا ایک دم سے چھوڑ دی تھی......"

وہ اس کی ذات پر بچھے جا رہے تھے ــــــ جیسے پہلی بار، پہلی رات نلنی کو آغوش

میں بھرنے کے لیے انہوں نے پلنگ پر پھول سجائے تھے...... تلنی کے استقبال کے لیے۔ وہ ان خوشبوؤں کو تلنی کے جسم سے دوبارہ بولتے ہوئے سننا چاہتے تھے۔ وہ جیسے گہرے نشے میں ڈوب رہے تھے...... "سو جاؤ تلنی...... مجھے نیند آ رہی ہے۔ سنو۔۔۔اپنا مندر یہیں لے آنا۔۔۔ارے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ میری لائبریری، وہ ہنسے...... وہ تو اس طرف ہے...... تم دن بھر مندر میں رہنا۔ میں کتابوں میں......" وہ ہنس رہے تھے۔ مگر اب آنکھوں میں غنودگی لہرا رہی تھی۔ "سو جاؤں؟"

"ہاں سو جاؤ"____ تلنی نے مسکراتے ہوئے سر پر ہاتھ رکھا۔

ولو ڈیئر...... وہ اپنی فتح پر نثار ہو رہے تھے...... ولو ڈیئر، بچے بے وقوف ہوتے ہیں جو یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایک دن بوڑھے جاگ سکتے ہیں۔ تمام بوڑھے جاگ سکتے ہیں۔ تلنی پاس میں لیٹ گئی۔ نیند نے ان پر بری طرح حملہ کر دیا تھا۔ وہ گھوڑے بیچ کر دینا و مافیہا سے بے خبر ہو کر سو گئے تھے۔

صبح ہو گئی۔۔۔ جیسے وہ ایک دم سے چونک گئے۔۔۔ کوئی ہولے ہولے ان کا سر سہلا رہا تھا۔

"چائے!"

انہوں نے نظر گھمائی۔ تلنی کھڑی تھی۔ کچھ دیر کے لیے وہ ایک دم چونک گئے۔ یہ تلنی شادی کے فوراً بعد والی تلنی سے بالکل الگ نہیں لگ رہی تھی۔ وہ زیر لب مسکرائے۔ تلنی میز پر چائے کی تلفی رکھنے کے بعد سامنے سے کھڑکی کا پردہ ہٹا رہی تھی اور دھوپ چھن چھن کرتی ہوئی کمرے میں اتر رہی تھی۔

OO

آجکل، جولائی ۱۹۹۳ء

چھوٹے بچے بھی
بڑے سپنے دیکھتے ہیں

●●

اگر تم ماضی پر پستول سے گولی چلاؤ گے
تو مستقبل تم پر توپ سے گولے برسائے گا

—— رسول حمزہ توف

('میرا داغستان' سے)

پُرانے عکس

اللہ ایک ہے، پاک اور بے عیب ہے

"میں بیتے ہوئے تمام لمحوں کو سمیٹ کر جی نہیں سکتا/
کہ ان میں کچھ لمحے ایسے بھی ہیں/
جو اپنے سیدھے تعلق کی بنا پر/
میری موت کو آسان بنا دیں گے/"

(۲)

خلاء میں دیر تک دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئی ہیں...... معمولات کے بندھے ٹکے اصولوں کا آدمی ہانپ رہا ہے...... گزرے ماہ و سال سے کتنی یادیں چرا لائی ہیں آنکھیں......ایک جگہ بیٹھے بیٹھے طبیعت بھی اکتا جاتی ہے۔یادیں میرے ساتھ ساتھ چھت پر ٹہلتی ہیں...... میری لمبی لمبی سانسوں میں الجھتی ہیں......ہانپتی ہیں اور جب یادوں کی یلغار ایک دم سے مجھے پریشان کر دیتی ہے......، شریانوں میں خون کے گرم گرم لاوے دوڑ جاتے ہیں۔ دماغ کی نسوں میں تناؤ آ جاتا ہے اور سب مل کر مجھے مخبوط الحواس بنا دیتے ہیں...... تو اچانک بالکل اچانک چھت پر پاگلوں کی طرح دوڑنے لگتا ہوں اور آنکھیں دہشت زدہ ہو کر گزرے مناظر سے نجات چاہتی ہیں اور یادوں کا مکروہ چہرہ شب دیجور کی الگنی پر کسی چمگاڈر کی طرح لٹک جاتا ہے......!"

لمبی لمبی سیڑھیاں طے کر کے نیچے آتا ہوں...... مگر نہیں کوئی نہیں...... بے خواب کواڑوں کی طرح مقفل سارے کمرے......اور اکیلے گھر میں بھٹکتا ہوا تن تنہا صرف میرا وجود......یادیں پھر سے حملہ آور ہوتی ہیں......"کہ وہ لوگ کہاں گئے جو تمہاری اپنی کہانی کے حصہ دار تھے...... جو تمہاری اپنی زندہ کہانی کے کردار تھے۔ تمہارے وقت بے وقت کے قہقہے تھے...... ٹھٹھول تھے...... تمہارے شب و روز میں سمائے ہوئے لمحات تھے"____

مشکی گھوڑے کی ہنہناہٹ تھم گئی ہے جو یادوں کے حملہ آور ہوتے ہی میرے سارے بدن میں سما جایا کرتی تھی...... مگر یادیں...... لمبی لمبی سانسوں کو درست کرتے ہوئے پیچھے چھوٹتی جارہی ہیں......اب گھر کے سارے بند دروازے کھولنے ہونگے کہ شب و یجور کی الگنی پر لٹکا ہوا چمگادڑ پھر مجھ سے سوال کرے گا...... "کہ مجھے لکھا یا نہیں؟"

"نہیں؟ تو کیوں نہیں لکھا؟"

"یا لکھ ہی نہیں سکے......"

تمہارے قلم ٹوٹ گئے۔ گونگے بن گئے۔

"دنیا کے بڑے بڑے فلسفوں کو چابک دست ہاتھوں کی ہتھکڑیاں پہنانے والے میرے معصوم ادیب! اپنی ہی کہانی سے ڈر گئے......؟"

اور اس طرح کے سوالوں کا ایک طویل سلسلہ۔ سوال جو ڈیڑھ سال سے برابر مجھے پریشان کرتے آرہے ہیں...... مگر اب سوچ رکھا ہے۔اس عفریت کو خود سے الگ ضرور کروں گا۔ لکھوں گا ضرور......"

سردی شباب پر ہے۔ لمبی بھاگ دوڑ کے نتیجے نے کھلے آسمان کے نیچے چھت پر مجھے ہانپنے کے لیے مجبور کر دیا ہے...... چھت کی چکنائی سے تلوؤں کو ٹھنڈک مل رہی ہے۔اندر بے چینی ہی بے چینی بھر گئی ہے____ سارے دروازے بند ہیں۔پورے گھر میں اکیلا ہوں۔اور یادیں جب شب خون مارنے لگتی ہیں تو......

"یہ شور کیسا ہے؟" ابا حضور مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔

میں حیران حیران سا ابا کو دیکھ رہا ہوں ـــــ آنکھیں ملتے ہوئے حیرت سے......"آپ؟" خوشی کے مارے میری آواز نہیں نکل رہی ہے......آپ ہیں......آپ ابھی بھی ہیں......شاید بھولنے کی بیماری ہو گئی ہے مجھے ـــــ ایکدم سے سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ جو ہے اس کے وجود کو بھی......کہ کل تو سارے کے سارے تھے مگر سب اتنی جلد چلے گئے کہ یاد ہی نہیں رہا......اب کون بچا ہے اور کون نہیں......مگر آپ......!"

"چلو سو جاؤ۔ رات کافی ہو گئی ہے۔"

"آنکھوں میں نیند نہیں ہے ابا۔" حیرت و خوشی کا ملا جلا رنگ میری آواز پر غالب آ گیا ہے۔

"نیم شب میں چھت پر دوڑتے رہو گے تو لوگ کیا کہیں گے۔"

بغیر کچھ بولے میں ابا حضور کو ایک ٹک دیکھے جا رہا ہوں۔ ابا حضور صرف ایک چھوٹی سی تنبیہ کرتے ہوئے واپس لوٹ گئے ہیں......"کہ رات کے وقت بالائی منزل کی روشنی مت بجھانا۔ جو دروازے بند ہیں انہیں کھولنا نہیں۔ بند دروازوں کے اندر کی روشنی کو جلتے رہنے دینا۔" اس نے اقرار میں سر ہلا دیا ہے۔ ابا شام ہوتے ہی گھر کی ساری بتیاں روشن کر دیتے ہیں۔ اور رات کے اندھیرے میں وہ تمام بتیاں گل کر دیتا ہے۔ پتہ نہیں کن جذبوں کے تحت......!

چپ چپ ابا حضور کو جاتے دیکھتا رہا۔ خوشی و انبساط کی لہریں سارے جسم میں دوڑ گئی ہیں۔ میں تنہا نہیں۔ اس ویرانے میں تنہا نہیں۔ ابا بھی ہیں...... مگر ابا نے بند کمروں میں جانے سے منع کیا ہے۔ چپ چاپ نیچے آ کر اپنے بستر پر سو جانے کو کہا ہے......اس سے کیا......ابا ڈرتے ہیں......رات کے ویرانے میں کمرے میں اندھیرا دیکھ کر شاید روحیں بے چین ہو جائیں کہ گھر والوں نے اب تک غمی اوڑھ رکھی ہے......رات کا پچھلا پہر، چوکیدار کے گھنٹوں کی آواز سے گونج رہا ہے...... ہوا کے ٹھنڈے جھونکے جسم میں طوفان مچا گئے ہیں۔ میں ایک دروازے کے قریب آ کر ٹھہر گیا ہوں......یہ

میری امی کا کمرہ ہے...... میری امی کا پیارا کمرہ......اسی کمرے میں سوتی تھی امی......اسی کمرے سے کتنی بار مجھے صدا دی تھی...... مجھ پر بگڑی تھی۔ میرے آنسوؤں میں خود بھی شامل ہوئی تھی۔ مجھے مارا تھا۔ پھر منایا تھا...... مجھ سے روٹھی تھی۔ غصہ ہوئی تھی پھر خوش خوش مجھے مٹھائیوں سے نوازا تھا...... یہی کمرہ!...... سہمے سہمے قدموں سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولتا ہوں۔ پھر ایک چیخ میرے منہ سے نکل جاتی ہے...... آنکھیں خوف زدہ ہو جاتی ہیں۔ جسم لرزنے لگتا ہے...... بستر پر ایک مردہ جسم پڑا ہے۔ امی کا بے جان جسم۔ اوپر سے لے کر نیچے تک چادر سے ڈھکا ہوا۔ اس کے باوجود امی کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ مجھے اشارے سے بلا رہی ہیں۔

"منا، بیٹے ایک گلاس پانی لانا"

"دیکھو...... آپس میں شرارت مت کرنا۔ منو تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔"

"لڑنا جھگڑنا نہیں۔"

امی کی کھلی کھلی آنکھیں چادر سے باہر نکل کر میرے سامنے معلق ہو جاتی ہیں۔ میں دیوانہ وار کمرے سے بھاگتا ہوں...... سانس دھونکنی کی طرح چل رہا ہے...... امی حضور کے مردہ جسم کی زندہ آنکھیں میرے تعاقب میں چھت پر نکل آئی ہیں۔ جہاں میں الجھنوں اور وحشتوں میں سمایا ہوا لمبی لمبی سانس لے رہا ہوتا ہوں......

خدا کے لیے امی حضور! میری یادوں سے دور چلی جائیے۔

"منا، بیٹے!" رات کی تنہائی میں ممتا پھر سے سسک اٹھی ہے۔

مولوی صاحب آموختہ پڑھا رہے ہیں...... میں رو رہا ہوں۔ ناک سے پانی بہہ رہا ہے۔ پڑھتے پڑھتے امی کے پاس بھاگ آیا ہوں۔ چہرہ آنسوؤں سے تر ہے۔ چائے بناتی ہوئی امی میری حالت زار پر کھلکھلا اٹھتی ہیں......

"مولوی صاحب کے پاس سے پھر بھاگ آیا۔ مولوی صاحب مارتے تو نہیں پھر اٹھ کے کیوں آیا...... یہ چائے پہنچا دے"......

اپنے آنچل سے میری ناک پونچھتی اجلی اجلی بھلی بھلی دعائیں میری جانب اچھال

دیتی ہیں امی۔ چائے کی ٹرے لے کر دوبارہ مولوی صاحب کے پاس آکر دوزانو بیٹھ جاتا ہوں۔ آموختہ کے سبق شروع ہو جاتے ہیں......"

اللہ ایک ہے۔ پاک اور بے عیب ہے اس جیسا اور کوئی نہیں......"

"اللہ رہتا کہاں ہے۔"

"امی کے یہاں؟"

"اور؟"

"دادی کے یہاں"

"اور؟"

"نانی اماں کے یہاں"

"اور؟"

مولوی صاحب اس بچپنے پر مسکرا اٹھتے ہیں۔ میں دوڑ کر دادی اماں کے پاس آتا ہوں۔ دادی اماں ایک لمبے عرصے سے بستر کی ہو کر رہ گئی ہیں...... 'گٹھیا' کے پرانے حملے نے توڑ دیا ہے...... مجھے دیکھتے ہی پوپلے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے......"بھاگ آتا ہے ـــــ پڑھنے میں دل ہی نہیں لگتا تیرا...... جا پڑھ......"

"دادی اماں خدا کو دیکھا ہے کبھی؟"

"ایسی بات نہیں کرتے۔ مولوی صاحب کیا کہیں گے۔" دادی اماں ڈانٹتی ہیں۔

بستر سے مکھیاں اڑاتے ہاتھ۔ پوپلے ہونٹوں کی بڑبڑاہٹ...... سب تھم گئی ہے۔ اوسارے میں پلنگ پر لیٹی ہوئی نانی اماں کے پنکھا جھلاتے ہاتھ مجھے دیکھ کر ٹھہر جاتے ہیں۔۔۔ "منا، مولی صاحب چلے گئے کیا؟ کیا وقت ہوا ہے؟ حشا ابھی تک نہیں آئے...... خدا معلوم کہاں رہ گئے۔"

"نانی اماں آپ نے کبھی خدا کو دیکھا ہے؟" میں ٹھہر کر نانی اماں کی آنکھوں میں جھانکتا ہوں۔

"پگلے!"۔۔۔ نانی اماں ہنس پڑتی ہیں۔

"تب لوگ کیسے کہتے ہیں"...... معصوم بنا دوبارہ مولوی صاحب کے پاس آکر دوزانو بیٹھ گیا ہوں...... "اللہ ایک ہے۔ پاک اور بے عیب ہے۔ اس جیسا اور کوئی نہیں۔ وہی سب سے بڑا بادشاہ ہے......"

سوچتا ہوں... معصومیت میں ڈوبے قہقہے اور انجانے طور پر میری جانب اچھالی گئی دعائیں اب کتنے فاصلے پر سمٹ گئی ہیں......اور شب دیجور کی انگلی پر لٹکا چمگاڈر سرد ہوا کے تھپیڑوں میں کانپ اٹھتا ہے......

وقت اس قصاب کی طرح ہے جو تیز چھری زندہ جانور کی گردن پر پھیر رہا ہوتا ہے۔ پھر اس کی دل شگاف چیخ سنتا ہے اور اپنی بے حس آنکھوں سے اس کی چھٹپٹاہٹ کا لطف لیتا ہے اور جب جانور ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو چھری سے اس کی بوٹی بوٹی الگ کرنے لگتا ہے......

وقت!...... بے رحم وقت!!

تو امی حضور کو تو لے گیا۔

مگر اس جسم کو نہ لے جاسکا جو آج بھی اس بند کمرے میں موجود ہے۔ جو دروازہ کھلتے ہی اور مجھے دیکھتے ہی زندہ ہو جاتا ہے۔ پھر میرے پورے وجود میں پیوست ہو جاتا ہے......"

ایک بار پھر سے ہانپنے لگا ہوں......

"میرے گھر کی بزرگ ہستیو! تم سب کہاں چلے گئے ؟!"

نیم شب کے سناٹے میں میری پاگلوں جیسی چیخ دور دور تک گونج جاتی ہے......

اچانک ہی میرے ہاتھوں میں چمڑے کا بیلٹ آ جاتا ہے۔ ایذار سانی کا بھوت پھر سے مجھ پر سوار ہو جاتا ہے۔ کہرے آسمان پر چھا گئے ہیں۔ ٹھنڈک بڑھ گئی ہے۔ پیروں سے چپل الگ کر کے شرٹ اتار کر ایک جانب رکھ دیتا ہوں۔ بوکھلائی ہوئی حالت میں ننگے جسم پر بیلٹ سے بوچھار کرنے لگتا ہوں......

ایک......

دو......

تین......چار......پانچ......

کچھ ہی فاصلے پر امی حضور کی سوچ میں ڈوبی آنکھیں میرے پاگل وجود کو تک رہی ہیں......رات کافی ہو گئی ہے بیٹے چلو سو جاؤ۔ ضد نہیں کرتے۔"

سہمے ہوئے جانور کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چل پڑتا ہوں۔ سانسیں اب تک درست نہیں ہوئی ہیں۔ اسی حالت میں بستر پر لیٹ جاتا ہوں...... مگر نیند کہاں...... بے چینی کی چیونیاں کاٹے جا رہی ہیں۔ اور شب دیجور کی الگنی پر لٹکا ہوا چمگادڑ مجھ سے پوچھ رہا ہے "مجھے لکھا کہ نہیں......اب تک کیوں نہیں لکھا......یا لکھ نہیں سکے کیا؟!"

کیسے کہوں کہ تمہیں ایک ساتھ قلمبند کرنا میرے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔اس لیے کہ اپنی کیفیات کے ملبے میں دب کر میں ترتیب کا راستہ بھول جاتا ہوں...... مگر اس کے باوجود تمہیں لکھوں گا...... کہ جواب تک ہوتا رہا ہے اور جو ہمیشہ ہوتا رہے گا......یعنی آنکھوں کا کھلنا پھر ہمیشہ کے لیے بند ہو جانا......ان دو غیر معمولی باتوں کو ہم نے اب تک کتنے معمولی انداز سے لیا ہے...... مگر میرے محسوسات کے صحرا میں اب وہ مشکی گھوڑا ہنہنا رہا ہے جو اچانک مجھ میں داخل ہو کر مجھے بند کمرے سے جھانکتی امی کی لاش دکھا دیتا ہے......جہاں ڈھکی ہوئی چادر سے باہر نکلی ہوئی آنکھیں مجھے پکارتی ہوئی نظر آتی ہیں......اس لیے تمہیں لکھوں گا ضرور...... قلمبند کروں گا......!"

(۳)

زیبا مجھ سے پوچھ رہی ہے۔۔۔"سوچتے سوچتے تمہیں عجیب نہیں لگتا......ہر وقت سوچتے رہتے ہو۔ کبھی میرے بارے میں۔ کبھی گھر کو لے کر......اپنی آنکھوں کو دیکھا ہے تم نے جو روز اپنی چمک کھوتی جا رہی ہیں۔"

میں اس کی معصومیت پر ہنس دیتا ہوں...... "بس اپنے ہی بارے میں نہیں سوچا زیبا! تم لوگوں کی باتیں اتنا وقت ہی نہیں دیتیں کہ اپنے بارے میں کچھ سوچ سکوں۔ مگر جانے کیوں لگتا ہے...... یہ سارے لمحے مجھ سے چھنتے جا رہے ہیں...... دور ہوتے جا رہے ہیں...... گھر کے لوگ بھی...... یہ چہل پہل بھی...... اور تم بھی......!"

"ہش"۔ زیبا ہنستی ضرور ہے مگر سنجیدہ ہو گئی ہے۔ "ایسا کیوں لگتا ہے کہ ہم الگ ہو رہے ہیں"

ایسا کل تک نہیں تھا۔ مگر اب ایسا اس لیے ہے کہ عمر جاگ رہی ہے...... اور میں سب کو دور ہوتا ہوا دیکھ رہا ہوں...... ٹھہرو تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں......"

کچھ بولنے سے قبل ہی اس کے سرخ ہونٹوں پر انگلی رکھ دیتا ہوں۔ اب یہاں سے کوٹھے کے نیچے ہونے والی باتوں پر کان لگاؤ۔۔۔ کیسا شور ہے؟ آپا کھانا پکار رہی ہیں۔ عصمت باجی اور زینت باجی میں کسی بات پر جنگ ہو رہی ہے... اور ان سے الگ وہ دیکھو...... دھوپ کی نرم نرم آغوش میں بڑی اماں اور اماں پلنگ پر بیٹھی ہوئی گپ شپ میں مشغول ہیں...... نانی اماں کسی کو آواز دے رہی ہیں...... آواز کیا...... خدا کو کوس رہی ہیں کہ موت ہی نہیں آتی۔ اور ان سے الگ دادی اماں کی تھکی تھکی آواز سن رہی ہو جو مریم بوا کو پکارتے پکارتے کھانسی میں تبدیل ہو گئی ہے......"

"ہاں!۔ اس میں کون سی نئی بات ہے؟" زیبا کچھ پریشان سی ہو گئی ہے۔

"جانے کیوں لگتا ہے۔ کل اگر یہ سب ختم ہو گیا تو کیسا لگے گا...... بہنوں کی شادی ہو گئی اور یہ سارے منظر ایک دم سے جدا ہو گئے تو یہ گھر کیسا دکھے گا...... پرانے لمحوں کو پھر کیسے سمیٹ پاؤں گا میں...... یا نئے لمحوں سے سمجھوتا کر لینے میں ہی بھلائی نظر آئے گی کیا؟......"

"ایسے میں نئے لمحوں سے سمجھوتا کر لینا چاہئے"۔ زیبا نے سر جھکا لیا "تم بہت سوچتے ہو۔ اچھی بھلی بات کیوں نہیں سوچتے؟"

اچانک ہی اس کے نرم نرم ملائم ہاتھوں کو تھام لیتا ہوں۔ "تم نہیں جانتی زیبا!

میرے اندر کیا ہو رہا ہے۔ کیسی ہل چل مچی ہوئی ہے...... مجھے روکو زیبا، سنبھالو...... پتہ نہیں کیوں......اپنے آپ سے دور ہوتا جارہا ہوں... تم نے سچ کہا ہے... اب میری آنکھوں میں وہ پہلی سی چمک نہیں رہی۔ یہ چمک بھی میرا ساتھ چھوڑ رہی ہے......"

برتن ٹکرانے اور خوش گپیوں کی فضا میں جانے کیسے ایک قطرہ آنسو ٹپک گیا......

"میری آنکھوں میں پرچھائیاں اتر رہی ہیں زیبا! منور اسکول گیا ہے اور بھیا کالج۔۔۔ آنکھوں میں کتنے ہی ڈستے اور چبھتے سوال ہیں جو سانپوں کی طرح میرے اردگرد کستے جارہے ہیں...... مجھے نجات دلاؤ زیبا...... میرا دم گھٹ رہا ہے......"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" وہ پریشان ہو گئی ہے۔

"لگتا ہے ایک دن اسی طرح منوں سوالوں کے بوجھ تلے دب جاؤں گا۔ تب تم مجھے یاد کرو گی زیبا؟۔"

زیبا اچانک سکتے میں آگئی ہے۔ آنکھوں کے نیلگوں آسمان میں تیرتی سیاہ کشتی میں آنسوؤں کے موٹے موٹے ڈورے تیر گئے ہیں۔

"میں اکثر سوچتا ہوں زیبا کہ یہ لمحے ٹھہرتے کیوں نہیں۔ ان لمحوں کو جاودانی کیوں نہیں حاصل ہے۔ میں جب جب سوچتا ہوں۔ برہنہ احساس پر اچھالے گئے پتھر مجھے زخمی کر دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ لمحہ بھی جس میں ہم تم سمٹ کر باتیں کرنے میں مشغول ہیں...... یہ لمحہ بھی ہم سے دور چھن جائے گا...... یہ بھی ایک بڑا حادثہ ہوگا کہ تم نہیں مل پاؤ گی۔ اور میرے اپنے ایک ایک کر کے میرا ساتھ چھوڑ دیں گے...... یہ بڑا سا گھر...... ہنگاموں میں پلتے پکتے جسم... دادی اماں، نانی اماں کے پوپلے ہونٹوں سے پھوٹتی آوازیں... امی اور بڑی اماں کی گپیں... ابا کے ہر وقت بڑبڑاتے اور قصہ کہانیاں کہتے ہوئے ہونٹ، بڑے ابا اور چھوٹے ابا کی سنجیدگی سے نکلا ہوا لمحہ... ان کے قہقہے،... جن سے لمحے زندگی کی روح میں داخل ہو جاتے ہیں... کل یہ سب نہیں ہوں گے۔"

"سچ تو یہ ہے کہ کل کچھ بھی نہ ہوگا۔ نہ ہم نہ تم۔ پھر یہ سب کیا سوچنا۔" زیبا کے

لرزتے ہاتھوں نے مجھے تھام لیا...... "یہ سب کیوں سوچتے ہو؟"

"اس لیے زیبا! کہ میں آج میں جینا چاہتا ہوں۔ میں ان لمحوں سے فرار نہیں چاہتا۔ سچ کے نام پر مجھے بیزاری اور گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ میں ان لمحوں کو سمیٹ کر اور گھر کے تمام افراد کو لے کر...... کبھی ختم نہیں ہونے والی زندگی اور کبھی ختم نہ ہونے والی دنیا کو تصور کے پردے سے کھینچ لانا چاہتا ہوں......"

میں ایک بار پھر ہانپ رہا ہوں......

میلوں لمبی دوڑ کے بعد تکان کے احساس سے چور ہو گیا ہوں...... "مجھے سنبھالو زیبا! پرچھائیاں مجھے گھیر رہی ہیں۔ آنکھوں کے آگے دھندلے دھندلے خاکوں کا رقص اب زور پکڑتا جا رہا ہے۔ تم نے کہا تھا میری آنکھوں کی چمک دن بہ دن ختم ہوتی جا رہی ہے... کیا میری آنکھیں سچ مچ میرا ساتھ چھوڑ رہی ہیں......؟"

"عالم"--- زیبا مجھے جھنجھوڑ دیتی ہے--- "اپنے ساتھ مجھے بھی پاگل بنائے دے رہے ہو! ہوش میں آؤ۔ وحشی دنیا میں انسان بن کر جینا سیکھو۔ آج کی صدی میں احساس اور جذبات کے نام پر تم ایک پل بھی جی نہیں سکتے۔"

میں پھر بیٹھ گیا ہوں۔ پسینے میں تربتر اپنے حیوانی وجود کے ساتھ —— پریشان پریشان سی زیبا اب بھی ایک ٹک مجھے گھورے جا رہی ہے...

"مگر میں ایسا کیوں سوچتا ہوں کہ میں اس بھرے پرے گھر میں اکیلا ہوں۔ تنہا ہوں۔ اور سب کے سب مجھ سے رخصت ہو گئے ہیں۔ سارے دروازے بند ہیں، اور میں ایک ایک دروازے سے اندر جھانک رہا ہوں جہاں گھر کے مختلف افراد کی نعشیں مجھ سے مخاطب ہیں اور مجھے گزرے دنوں میں لوٹ چلنے کو کہہ رہی ہیں......

"میں ایسا کیوں سوچتا ہوں تم مجھے بتا سکتی ہو؟

مگر زیبا چپ ہے......اور آہستہ آہستہ میری آنکھوں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہے......

تو وقت رخصت ہو گیا ہے۔

اور وقت اس قصاب کی طرح ہے جس نے مردہ جانور کی کتنی ہی بوٹیاں الگ کر ڈالی ہیں......

"زیبا......زیبا......!!"

آواز بھی دینا چاہوں تو زیبا اپنے دوسرے گھر سے واپس نہیں آئے گی ــــــ ہاں گزرے دنوں کی ڈائری سے اس کے معصوم قہقہے نکل کر پھر سے میرے سامنے آ کھڑے ہوں گے۔ تھکن سے چور ہو کر بند کمرے سے نجات چاہوں گا تو آس پاس کی یادوں کا حملہ شروع ہو جائے گا۔ بھولنا چاہوں گا تو ایذار سانی کا بیلٹ رات کی دودھیا چاندنی میں پھر سے میرے ہاتھوں میں چمک اٹھے گا اور انجانے طور پر دیکھتی ہوئی آنکھیں میرے اندر اس شیطان کو محسوس کر لیں گی جسے میں نے نہ پہنچاننے کی قسم کھا رکھی ہے...

گھر سناٹے میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور ایک ایک کمرہ بند ہے...... میں تمام کمروں میں جھانک آیا ہوں... کوئی نہیں ہے۔ بے خواب کواڑوں کی طرح مقفل سارے کمرے......اور چھت پر میری وحشت زدہ آنکھیں دیر تک خلا میں دیکھتے دیکھتے تھک چکی ہیں... اور پھر ایک نئے منظر کو اپنی گرفت میں لے رہی ہیں......

لوگوں کے کندھوں پر سوار...... چار نعشیں...... آخری منزل کی جانب رواں دواں ہیں......

انا للہ وانا الیہ راجعون

آگے آگے......دو بوڑھے سر جھکائے ہوئے ــــــ بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے...... پیچھے پیچھے سوگواروں کی بھیڑ...... سرخ سرخ آنکھیں...... آگے آگے ابا، بڑے ابا...... پیچھے منور، ننو بھائی، جھنو بھائی منجھلے بھیا......اور حیران حیران سا پاگلوں جیسا دیکھتا ہوا میں......! بڑی اماں، امی، دادی اماں اور نانی اماں تم سب کہاں کھو گئے...... کہاں چلے گئے......اب کبھی نہیں واپس آؤ گے کیا......؟

"گھر کی بزرگ ہستیو!"

الوداع......الوداع......

آخر تم نے رختِ سفر باندھ ہی لیا......

تمہارے ہی دم سے ہم نے اجالوں سے تعلق پیدا کیا تھا اور تم ہی یہ گھر یہ جہاں چھوڑ کر جا رہے ہو۔

تارِ عنکبوت اگر اس گھر کا مقدر ہے تو مقدر رہے...... کہ خوشیاں تقسیم کرنے اور دیکھنے والی آنکھیں اب تمہارے بغیر اس ٹوٹتے اجڑتے گھر میں چوتا گردانی نہیں کرا سکتیں......

الوادع...... میرے بزرگو! کہ اب اس غریب الدیار کو تمہارے بعد تنہائی سے ہی رشتہ قائم کرنا ہوگا......!!

الوداع، الوداع......!!

آسمان سب کچھ چرا کر لے گیا ہے... کبھی کبھی لگتا ہے، زندگی ایک بے زبان مکالمہ ہے جو خود سے کیے جا رہے ہوں......

زیبا اداس اداس سی میرے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے..." جو لوگ وقت سے سمجھوتا نہیں کر پاتے وہ ٹوٹ جاتے ہیں......"

"ہاں ٹوٹ جاتے ہیں..." جھنجھلاہٹ میں جواب دیتا ہوں...... کہ اب وہ تار ہی ٹوٹ گیا ہے۔ جو موسیقی کی لہروں کو آواز دیا کرتا تھا۔ اور خالی پن کا عجیب سا احساس مجھے دکھاتا ہے...... اپنے ہی گھر میں زندگی سے جوجھتے ہوئے بڑے ابا کو......اور دوسری طرف محض زندگی کاٹتے ہوئے ابا کو...... یعنی دو بوڑھے پیکر اور ان سے علیحدہ ہم......اور حادثوں سے متاثر دکھائی دینے والا میرا چھوٹا بھائی.... میرے بھیا...... کیا یہ تمام باتیں چیخ چیخ کر نہیں کہتیں کہ سمجھوتے کی فصل اب دل میں نہیں اگ سکتی...... تغیرات ہر ایک کا نصیب نہیں ہو سکتا......اور تم بھی اس قدر دور ہو گئی ہو کہ کل کو زندہ بھی کرنا چاہوں تو ممکن نہ ہوگا......اور جب جب میں یہ سب سوچتا ہوں... تب تب یہ بھی سوچتا ہوں کہ کیا سارے کے سارے میری ہی طرح سوچتے

ہیں؟اگر ہاں تو پھر یہ سارے کے سارے جیتے کیسے ہیں؟ کیا وہی ایذا رسانی کا بیلٹ رات کی دودھیا روشنی میں ان کے ہاتھوں میں چمک جاتا ہے...... کیا شرٹ میں ڈھکی پیٹھ پر ان گنت زخم رات کے سناٹے میں جاگ جاتے ہیں...... دُکھنے لگتے ہیں......اور وہ شب دیجور کی الگنی پر لٹکا ہوا چمگادڑ کیا سب سے ایسے ہی سوال کرتا ہے کہ مجھے لکھا کیوں نہیں...... لکھ کیوں نہیں سکے...... تمہارے قلم ٹوٹ گئے کیا......؟"

توزیبا چپ ہے......

اور شب دیجور کی الگنی پر لٹکنے والے چمگادڑو!

میں نے تمہیں لکھنے کی حامی بھرلی ہے......اور دیکھو کہ میں تمہیں لکھ بھی رہا ہوں......

اب میری آنکھوں نے پرچھائیوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے......اور گھنیرے دشت میں گم ہوتی جارہی ہیں......دور تک پھیلے ہوئے اندھیرے میں مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ گزرے ہوئے ماہ و سال کے کیکٹس نے اپنے نوکیلے کانٹے میرے جسم میں گاڑ دیئے ہیں اور میری دبی دبی دلخراش چیخیں بلند بانگ فضا میں رینگ جاتی ہیں......

"مجھے کچھ نظر نہیں آتا...... کچھ دکھائی نہیں دیتا"

دکھائی دینے والے منظرو!

تم سارے کے سارے میرے جسم میں اتر گئے ہو......

اور اب پھر سے میں سورج کی گرم گرم شعاؤں کو اپنے اندر اتار لینا چاہتا ہوں۔ ہواؤں کا پاگل رقص دیکھنا چاہتا ہوں...... دودھیا چاندنی راتوں میں اپنی پاگل حرکتوں کا لطف لینا چاہتا ہوں...... میرے لوگو! میرے بزرگو! میرے عزیزو!!! میری زیبا...... ٹٹولتے ٹٹولتے اپنا ہی گریبان ہاتھ لگتا ہے اور اسے ہی پکڑ کر میں چیخ پڑتا ہوں

آہستہ آہستہ مجھ پر غشی طاری ہوتی جارہی ہے......اور نیم غنودگی کی حالت میں محسوس کرتا ہوں......ڈاکٹر مجھ پر جھکا ہوا ہے...... میرا معائنہ کر رہا ہے...... بڑے بڑے

آنوں کی مدد سے مجھے دیکھ رہا ہے اور پھر اپنا حتمی فیصلہ سنا دیتا ہے...... "آنکھیں بے حد کمزور ہو گئی ہیں ـــــ بے حد کمزور۔ ریٹینال ڈیٹچمنٹ (Retinal-Detachement)

آپریشن کرنا ہوگا...... بے حد نازک آپریشن......"

آنکھیں سچ مچ بے حد کمزور ہو گئی ہیں......

اور ایک طویل وقفہ ہوا کے پنکھ پر سوار ہو کر اڑ چکا ہے...... کمزور آنکھوں سے گھر کے سارے بند کمرے جھانک آتا ہوں۔ مگر کوئی نظر نہیں آتا......

کوئی دکھائی نہیں دیتا...... مشکی گھوڑا اندر تیزی سے ہنہنا رہا ہے...... نیم شب کے سناٹے میں چھت پر دوڑتا دوڑتا ایک جگہ ٹھہر گیا ہوں......

میرے گزرے دنو!

تمہیں سمیٹنا آسان نہیں ہے......

میں چاند کی دودھیا روشنی میں اشکوں سے غسل کر رہا ہوں......

"بیٹے سو جاؤ...... سو جاؤ بیٹے"۔۔۔ یہ ابا حضور کی آواز ہے۔ جو ایک بار پھر نیم شب کے سناٹے میں میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے ہیں۔

"سو رہا ہوں ابا حضور! مگر آسمان میں اڑنے والی چڑیوں کو وہ کہانی تو سنا دوں جو مستقل مجھے ڈیڑھ سال سے پریشان کرتی آرہی ہیں۔ پہلی بار آپریشن تھیٹر میں واقعات کے گھنے جنگل سے گزرنے کے بعد جو پرچھائیاں میری آنکھوں میں پیدا ہوئی تھیں...... اور ڈاکٹر ان پرچھائیوں کو میری آنکھوں سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔ تو انہیں پرچھائیوں کی کہانی ابا حضور! میں آج آسمان میں اڑنے والی ان چڑیوں کو سنانا چاہتا ہوں......

تو پرچھائیوں کے نکل جانے کے بعد کا 'میں' آپ کے سامنے موجود ہوں اور یہاں میری کہانی ختم ہوتی ہے اور وہ کہانی شروع ہوتی ہے جسے آنکھوں میں اترتی ہوئی پرچھائیوں نے بارہا مجھ سے لکھنے کے لیے کہا تھا۔۔۔"

اور جب آنکھوں میں اترتی ہوئی پرچھائیاں لمبی ہوتی جارہی تھیں۔ روشنی روز بروز میری آنکھوں سے دور ہوتی جارہی تھی تو یہ کہانی (جو آپ کو سنانے والا ہوں) میں مختلف شکلوں میں دیکھتا رہا اور محسوس کرتا رہا ہوں۔ روز ایک ہی کہانی۔ آنکھ لگتے ہی لق ودق صحرا میں بھٹکنے والا وہ تن تنہا انسانی وجود میری آنکھوں میں کھٹکنے لگتا......روز ایک ہی قصہ۔ ایک ہی کہانی ـــــ بچپن میں ابا نے کہا تھا۔ ایک کہانی بار بار دستک دے تو اسے لکھ لینا چاہیے......

اسے میں نے جب دیکھا مادر زاد ننگا ہی دیکھا۔ جانوروں کی چیختی چنگھاڑتی ٹولیوں سے الگ اپنی نسل کا واحد جانور تھا وہ......خواب نے اس کا تعارف پہلے انسان کی حیثیت سے کرایا۔ اس وقت دنیا تو بن گئی تھی مگر صفحہ ہستی پر انسانی وجود کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اکیلا جانور۔ خواہشات کے ننگے ثمر کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتا رہتا۔ وہ وجود میں کیسے آیا اس کے بارے میں خواب نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ شاید عناصر اربعہ کے میل سے۔ مٹی آگ، ہوا پانی نے اسے انسانی شکل دے دی تھی۔ کبھی کبھی اپنے منہ سے عجیب سی آواز نکالتا۔ [خواب کے بار بار آنے سے میں نے اس کا ایک نام رکھ لیا تھا "مدا"] ایسا لگتا ہے جیسے مدا اپنی تنہائی کا شکوہ کر رہا ہو۔ کہ سب کچھ تو ہے مگر میری تلاش کو وہ "بو" نہیں مل سکی جس کے لیے میں دوڑا دوڑا پھرتا ہوں......اور پھر جب اپنی جیسی کسی مخلوق کی تلاش میں وہ ناکام رہا اور تنہائی کا جان لیوا احساس، گھنیرے دشت اور لق ودق صحرا میں دوسرے چرند پرند کی موجودگی میں اسے پریشان کرتا رہا تو اچانک ہی ایک انوکھے خیال نے اسے بچوں کی طرح خوش کر دیا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ خاک سے اپنی ہی جیسی انسانی مخلوق بنائے گا۔ اور نادیدہ قوتوں سے ان میں زندگی عطا کرنے کی دعا کرے گا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ مدا اپنے کام میں جٹ گیا۔ مدت گزر گئی۔ عرصہ بیت گیا اور شاید صدیاں گزر گئیں۔ مدا اپنے کام

میں لگا رہا۔ شب و روز کی محنت نے کتنے ہی خاکی پتلے اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑے کر دیئے ...... یہاں تک کہ ایک دن وہ تھک گیا۔ اور تھکنے کے بعد اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی محنت میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے۔ یعنی کہ پتلوں کے چہرے پر جو خالی گڑھے ہیں، ان میں آنکھ لگانا بھول گیا ہے۔ پتلے تیار ہو چکے تھے اور مدا تھک چکا تھا۔ اور دوسرے، سارے پتلوں کو ملانا اور خالی گڑھوں میں آنکھ بھرنا سچ مچ ایک مشکل امر تھا۔ بہت غور کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مٹی کی لوئیوں سے آنکھ کی شکل کی کئی پتلیاں ترتیب دے گا اور پتلیوں کو ان کی قسمت کے حوالے کر دے گا ...... مدا پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ وقت بہتا رہا اور پھر ایک لمبی مدت گزر گئی۔ مدا تھک چکا تھا اور اس کی مٹی کا ذخیرہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ پس ایک روز مدا نے اپنے کام کو بیچ میں ہی روک کر نادیدہ قوتوں سے یہ دعا کی کہ ان میں زندگی پیدا ہو جائے۔ سارے پتلے اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور مٹی کی لوئیوں سے نکلتی شعاؤں نے لق و دق صحرا کو گلزار بنا دیا۔ لیکن آنکھوں میں جوت نہ ہونے کے سبب پتلے چل پھر سکنے سے معذور تھے۔ مدا نے ان کی بے چینی دیکھی اور حکم دیا کہ جاؤ ...... جا کر اپنی آنکھیں اٹھا لو ...... خود کو قسمت کے حوالے کر دو۔ اور قسمت کی روٹیاں کھاؤ۔ پتلے تیزی کے ساتھ دوڑ گئے۔ پتلوں کو اپنے درمیان سے روپوش ہوتے ہوتے مدا نے بس اتنا دیکھا کہ تخلیق کردہ پتلوں کے درمیان ذہنی کشمکش کا آغاز ہو چکا ہے اور ایک سرد جنگ کے آثار نمایاں ہو گئے ہیں۔ جو پتلے پہلے لپکے تھے ان کے حصے میں دو دو آنکھیں آئیں۔ لیکن بعد والوں کے حصے میں ایک ہی آنکھ آ سکی۔ اب جو بالکل پیچھے تھے وہ آنکھوں سے محروم رہے۔ بس مدا اتنا ہی دیکھ سکا۔ پھر وہ گھنے جنگل میں لاپتہ ہو گیا۔

پھر صدیاں گزر گئیں۔ معاً مدا کو خیال آیا کہ اپنی تخلیق کا حشر دیکھنا چاہیے۔ اور پھر وہ ان کی قسمت کا حال دیکھنے نکل گیا۔ کچھ دور جا کر اس نے دیکھا کہ عالیشان عمارتیں شان سے کھڑی ہیں۔ سڑکوں پر لوگوں کا سیلاب امڈا ہوا ہے۔ لوگ باگ برق رفتاری کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ طرح طرح کی گاڑیوں کا ایک زبردست شور

مستقل فضاؤں میں بکھر رہا ہے۔اور حیرت کی بات یہ تھی کہ کوئی کہیں ٹھہرا ہوا نہیں تھا۔ کوئی کسی سے بات چیت نہیں کر رہا تھا۔ سب کے سب نا معلوم سمتوں میں بھاگے جا رہے تھے......

"ان دوڑتے ہوئے لوگوں کو ہوش ہے کہ نہیں"۔۔۔ مدا نے سوچا ـــــ ٹھہر کر اُس کو بھی یاد کر لیں جو ان کی موجودگی کا سبب بنا۔ جس نے انہیں صدیوں کی جان توڑ محنت کے بعد پیدا کیا...... "مدا نے اپنے اس خیال کو آواز دے دی۔

"کیا تمہارے پاس اس کے لیے بھی وقت ہے، جس نے تمہیں پیدا کیا ـــــ" مدا نے لوگوں سے اپنا سوال دہرایا۔

اس کی بات سن کر ان میں سے ایک شخص جھنجھلا کر بولا......"ہم اس طرح کی دقیانوسی سوچوں سے دور نکل آئے ہیں۔ اب ہمارے یہاں اس طرح کی فضولیات پر ریسرچ بھی نہیں ہوتی۔ یہ سب پرانی باتیں ہیں۔"

مدا کے دل کو چوٹ پہنچی۔ جس نے بنایا اسی کے بارے میں یہ خیال......شاید ایسا ہی ہو تا رہا ہو......اب وہ ایک آنکھ والوں کی دنیا میں ان سے ملنے جا رہا تھا۔ اس دنیا میں اس نے دیکھا کہ ترقی وہاں بھی ہوئی ہے مگر ایسی نہیں...... جیسی کہ دو دو آنکھ والوں نے کی ہے۔ اچھے پکے مکانات یہاں بھی ہیں مگر اتنے اونچے نہیں تھے۔ سڑکوں پر گہما گہمی بھی تھی۔ مگر اس دنیا کی طرح نہ تھی۔ لوگ باگ، بھاگ دوڑ میں مشغول تھے...... مگر زندگی کی وہ اڑان نہ تھی جو دو آنکھ والوں کی دنیا میں مدا دیکھ آیا تھا۔

"خیر! تم سے باتیں ہو سکتی ہیں۔ مدا نے سوچا......شاید تمہیں اس کا احساس ہو کہ تمہاری موجودگی کا سبب کون ہے؟"

ایک شخص کو روک کر جب اس نے اپنا سوال دہرایا تو اس نے شکوہ کرنے کے انداز میں مدا کو دیکھا اور کسی قدر غصے سے بولا......وہ جو بھی ہو اس سے ہم سب کو ایک جیسی شکایت ہے کہ اس نے ہم پر ظلم کیا ہے۔ بہت بڑا ظلم۔۔۔ اس نے ہماری ایک آنکھ کو روشنی سے محروم رکھا......ورنہ ہم ترقی میں دو آنکھوں والوں سے کسی بھی طرح پیچھے نہیں رہتے......"

مدا پھر سناٹے میں آگیا تھا ــــــ شاید اسے اپنی پیدا کردہ مخلوق سے اس طرح کے جواب کی امید نہیں تھی۔ اب مدا اپنی اس بدنصیب مخلوق سے ملنے جارہا تھا جو آنکھوں کی دوڑ میں پیچھے رہ گئی تھی۔

افسوس۔ صد افسوس!

ان کے درمیان آکر مدا کو بے حد رنج ہوا کہ ان کے یہاں کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ نہ کوئی گہما گہمی تھی، نہ ہی شاندار مکانات تھے کچھ کچی کچھ پکی جھونپڑیاں نظر آرہی تھیں جہاں سر جھکائے کچھ لوگ زندگی کی معنویت سے پرے، بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ مدا نے ان کے قریب آکر دریافت کیا...... تم میں سے کوئی واقف ہے تمہاری موجودگی کا سبب کون ہے...... "ایک شخص نے اپنی خالی گڑھے والی آنکھیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور یوں گویا ہوا...... "وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ ہم نے کبھی محسوس نہیں کیا...... نہ ہمیں اس سے کوئی شکایت ہے۔ مگر وہ جب چاہے ہمارے درمیان آکر بیٹھ سکتا ہے......"

مدا اس بار سناٹے میں نہیں ڈوبا۔ اس بار اس کے دل کو کسی طرح کی چوٹ نہیں پہنچی۔ اور وہ سچ مچ ان کے درمیان آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا......

صدیاں گزر چکی ہیں اور مدا انہیں کے درمیان بیٹھا ہوا ہے۔ اور ان کی گفتگو کا ایک حصہ بن گیا ہے......"

(۵)

میری کہانی کے ساتھ ساتھ مدا کی یہ کہانی بھی ختم ہوتی ہے کہ آج ایک مدت کے بعد اپنے جسم سے وہ کثیف لبادہ اتار رہا ہوں جو ڈیڑھ سال سے مستقل مجھے اذیت میں مبتلا کئے ہوئے تھا۔ دونوں کہانیوں میں کوئی قدر مشترک ہو یا نہ ہو لیکن میں سوچتا ہوں...... کہ اگر سچ مچ میری آنکھوں کی چمک نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تو کیا میں مدا کو اپنے اندر پناہ دے پاؤں گا!!؟؟

OO

شاعر، ۱۹۸۴ء

لاش گھر

(۱)

اپنا تجربہ فرضی کہانیوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

(۲)

کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے اندر بڑی عجیب تبدیلیاں پیدا ہونے لگی ہیں۔ پیدا شدہ تبدیلیوں کا تعلق بہر طور میری ذات سے تھا۔ جانے کیوں زندگی اور موت کے بڑے بڑے فلسفوں اور حقائق کے درمیان میں محسوس کر رہا تھا کہ میری آنکھیں رفتہ رفتہ میرا ساتھ چھوڑ رہی ہیں۔ اور اندھیری سلطنت کا نگہبان اپنے تاریک سرنگ میں نکلنے کی خاطر آگے بڑھ رہا ہے۔ بچپن سے ہی لاابالی واقع ہوا ہوں اور زندگی میں ہونے والا یہ حادثہ بھی میرے لاابالی پن کے تار عنکبوت میں گم ہو گیا۔ زندگی کی طویل شاہراہ پر خود کو چھوڑ دیا۔ چلتا گیا۔ چلتا گیا۔ اور اس شام جب گھر لوٹا تو میرے چھوٹے بھائی نے بتایا،...... زیبا آئی تھی اور زیبا نے آپ کے نام یہ خط دیا ہے۔ میں ٹھہرا۔ بھائی کے ہاتھ سے خط لیا۔ چند جملے تحریر تھے...... "کل تمہیں چوک کے قریب سے آتے دیکھا—— پتہ نہیں کیوں تم ادیب نہیں لگے۔ تمہارے پہلو سے.

ایک لاش گزری۔ اور دنوں کی طرح کوئی خاص تاثر تمہارے چہرے پر نظر نہیں آیا۔ یہ میرے لیے ایک بڑی بات تھی اور حیران کن بھی۔ پتہ نہیں کیوں سب بدلتا جارہا ہے۔ دنیا کا نظام بھی۔ دستور بھی اور شاید تم بھی......!

بس اتنا ہی تحریر تھا......

میرے ہونٹوں پر ایک شستہ سی مسکراہٹ رینگ گئی اور میں نے خط جیب کے حوالے کر دیا۔

(۳)

بہت پہلے میں نے زیبا کے سامنے ایک جملہ اچھالا تھا۔ زندگی کا حاصل کچھ بھی نہیں ہے۔ میں موت کے تعاقب میں جارہا ہوں۔ میری ماں اپنی معصوم دعاؤں کی تلاش میں بھٹک رہی ہے۔ ابی حضور کی بے ترتیب بڑھی ہوئی داڑھی پر بے معنویت اور لایعنیت کے سوا کچھ بھی تحریر نہیں ہے۔،

"تم آدمی کے اندر جاؤ۔ پلیز جاؤ کہ وہاں ایک سمندر ہے" زیبا نے کتاب سے نظریں اٹھائیں۔ آنکھوں میں جمے ہوئے قطرے صاف چھلک آئے۔

میں کہاں جاؤں۔ تم مجھے پاگل یا عمر کے تقاضے کے تحت انٹلکچوئل کہہ کر ٹال جاؤ مگر تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟"

اور زیبا کا تراشا ہوا خوبصورت ہاتھ باہر کی جانب اٹھ گیا۔ "بستیوں میں غریبی کو پڑھ سکتے ہو۔ آنکھوں میں کہانیاں تلاش کر سکتے ہو۔ تم تو ایک ادیب ہو۔ ادیب سے زیادہ محسوس کرنے والا دل رکھتے ہو۔ ان بستیوں کی دھندلی آنکھوں میں اتر جاؤ۔ ان کی کہانیوں کا ایک حصہ بن جاؤ۔ کہ یہ بھی جیتے ہیں۔ محض اس لیے کہ زندگی تمام تر تلخ حقائق کے باوجود اس قدر خوبصورت ہے کہ جینا اچھا لگتا ہے۔ پلیز جینے کی کوشش کرو کہ میری آنکھیں بھی ایک سمندر ہیں اور اس سمندر میں ایک خوبصورت سا محل ہے اور اس محل میں تم رہتے ہو......"

میں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ زیبا کے ہاتھ پر رکھا اور زیبا نے اپنی مٹھیاں میرے ہاتھوں پر سخت کر دیں۔

(۴)

توڑ پھوڑ کا یہ سلسلہ جانے کب سے چل رہا ہے۔

جانے کب تک جاری رہے گا۔

ابی حضور برابر سمجھاتے ہیں۔ تخلیق کار کا فرض ہے کہ وہ ایک خوبصورت سی دنیا کی تخلیق کرے ـــــــ میں کہتا ہوں۔ ابی حضور آج کا تخلیق کار جن کیفیات سے دوچار ہے وہاں سرخ آسمان کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اور میں جہاں رہتا ہوں وہاں خالی خالی ویرانے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ تمام ذرا ذرا تبدیلی لیے بس ایک سی کہانیاں، اپنا بٹوارے کا گھر...... کھنکتے ہوئے جام پر چمکتی ہوئی آنکھیں۔ لیپروسی...... بھکارن، ڈوم ڈومنوں کے ہنگامے...... مسئلوں میں الجھی روایتیں۔ اور......،

یہ آنکھیں دکھ رہی ہیں ابی حضور......

''سڑک پر کارنر ڈرامے کی شروعات ہو چکی ہے......''

پکڑو...... پکڑو

زندگی حادثے سے الگ ایک مختلف چیز ہے......

اپنے وجود کو سلامت رکھ کر جیو پیارے......

اور...... زیبا تم...... تم مجھے دکھائی نہیں دیتیں...... امی اپنی معصوم دعاؤں کی تلاش میں بہت دور چلی گئی ہیں...... گھر میں خالی پن سمٹ آیا ہے...... بھیا جلدی جلدی دولہا بن کر گھر کے خالی پن کو بھرنے کی کوشش میں لگ گئے ہیں......

سناٹا در و بام پر چھا گیا ہے......

آنگن میں بڑی اماں...... دادی اماں...... نانی اماں...... اور امی کی لاشیں پڑی ہیں...... صرف دو سال...... اور دو سال میں گھر سے چار بزرگ اٹھ گئے۔

زیبا...... کبھی تم نے کہا تھا۔ یہ گھر کتنا بھرا بھرا لگتا ہے......اب بالکل خالی خالی اور زمانے سے الگ اپنے ماحول کے خالی پن میں داخل ہو گیا ہوں میں...... بتاؤ کیا کروں۔ میری آنکھیں مجھ سے دور جا رہی ہیں......اندھیری سلطنت کا نگہبان مجھے سمیٹنے آگے بڑھ رہا ہے......

زیبا کے سرخ ہونٹ کانپ اٹھے ...... "میں تمہیں اپنی آنکھیں دے دوں گی۔ پلیز ایسی بات نہ کرو۔"

میں نے فوراً عجیب نظروں سے شلوار اور جمپر میں لپٹے ہوئے اس چاند سے چہرے کا جائزہ لیا۔ یہ جملہ جذبات سے بھرا سہی......ڈرامے اور فلم کی دین سہی...... مگر اس میں جان تو ہے......روح تو ہے......زندگی تو ہے......

(ایک خوبصورت مکالمہ کچھ دیر کے لیے زندگی بن جاتا ہے)

(۵)

جنگ جاری ہے......

جنگ مستقل جاری ہے......

میں لاش گھر سے باہر آ گیا ہوں......

میرے گھر کی بزرگ ہستیو! تم وہاں موجود تھے۔ اور تمہارا مقدس بدن سفید لبادے میں لپٹا ہوا تھا۔ تمہارے ہونٹوں پر وہی معصومیت اور بزرگی تھی جو ہمیشہ تمہارا طرہ امتیاز رہی۔ اور ان میں ایسے بھی کتنے تھے جو آتش زنی کے بعد اس گھر میں لائے گئے......ایسے بھی کتنے تھے جنہیں بھالے کی سنگین نوکوں نے اس گھر میں پھینک دیا......

اور میں بند کمرے سے دہشت زدہ منظر دیکھ رہا تھا کہ شہر مستقل اندھیروں میں کھو گیا ہے۔ کرفیو کی کالی پوشاک پہنے سپاہی گنوں اور مشین گنوں کے ساتھ سڑک پر بچھ گئے ہیں......دروازے اور مکانوں سے اٹھتے ہوئے شعلوں میں گھرے جسم ایک ایک کر کے لاش گھر میں پہنچائے جا رہے ہیں۔ پہچاننے والی آنکھیں بھیڑ میں وحشی بن

گئی ہیں اور رہ رہ کر ایک تیز ہسٹریائی چیخ لاش گھر میں گونج جاتی ہے۔ شناخت ایک کرب ہے اور شناسائی میں آنسوؤں کے قطرے شامل ہیں......

ان میں سب تمہارے لوگ ہیں۔

لاش گھر میں سویا ہوا ہر فرد تمہارا ہے......

کرفیو اٹھ چکا ہے......

سبھی آنکھیں اپنے رشتہ داروں کو آخری آرام گاہ میں لیے جا رہی ہیں۔

الوادع دوستو......!

تم شہر پناہ میں جا رہے ہو......

یہاں تو پناہ ہی نہیں ہے......

اور نہ آنکھوں میں حس کی توانائی ہے......

"ہم صرف......اور صرف سلگتے ہوئے مکانات دیکھنے کو رہ گئے ہیں......"

"تم قدم سے قدم ملا کر دو چار قدم ہی چلی ہو گی کہ اچانک ٹھہر گئیں۔ شہر کے آسمان پر گدھ کیوں منڈلا رہے ہیں۔؟"

"لاش گھر میں اب جگہ نہیں رہ گئی ہے" میں نے آہستہ سے کہا۔

"لاش گھر سے ہم باہر آگئے ہیں۔ مگر تم لگتا ہے وہیں چھوٹ گئے"

"میں نے آنکھیں جھکالیں ــــــ خود پر قابو نہ رکھ سکا......وہاں سب میرے عزیز تھے زیبا۔ وہ سب چہرے جنہیں آج تک دیکھا نہیں تھا۔ وہ سب چہرے جو شعلوں میں گھر کر خود اپنی شناخت نہ کر سکے تھے۔ جنہیں ان کے عزیز اور رشتے دار بھی نہ پہچان پائے۔ جن کی مسخ شدہ لاشیں۔ لاش گھر میں پڑی پڑی پہچان بھری نظروں کو تلاش کرتی پھر رہی تھیں...... میں نے ایک ایک چہرے کو الٹا......ایک چہرے میں خود کو پیوست کر کے دیکھا تو اپنے چہرے سے الگ کچھ بھی نظر نہیں آیا......"

"تم ان دہشت بھرے رنگوں کو بھول کر جی نہیں سکتے۔" دو لرزتے ہاتھوں نے مجھے تھام لیا اور سوال اچانک میرے رگ و پا میں دوڑ گیا...... میں سب کچھ بھول کر جی

رہا ہوں زیبا۔ لاش گھر سے نکلوں گا تو آنکھوں میں لاش ہی نظر آئے گی؟ میں تو اس شخص کو بھی بھول گیا ہوں جو اوپر والے کی نارسائیوں کا ذکر لے کر بیٹھ گیا تھا۔ تم بھی تو اس دن میرے ساتھ تھیں۔ کیسے کیسے عجوبے بنائے ہیں خدا نے..... ادھیڑ عمر کے دریوزہ گر کے کاندھے پر قدرت کا عجیب شاہکار، ربر جیسے پیروں کو موڑے...... آنکھوں میں بے معنویت لیے بیٹھا تھا...... موٹے پھولے پیٹ پر بڑا سا لمبوترہ سخت چہرہ...... اور پیٹ سے جھولتے ربر جیسے پاؤں......

بے زبان آدمی...... مجھے کہنا چاہیے تھا......

تم لاش گھر میں رکھنے کے لائق ہو......

کہ اس عجائب خانہ میں ایک زندہ مخلوق کو دیکھ کر مصلحت کی آنکھیں بھی تھرا جائیں گی......

"کیا کیا آلتو فالتو سوچتے اور بکتے رہتے ہو" زیبا نے میرا ہاتھ سختی سے تھام لیا......

اب کچھ نہ بولنا۔ پلیز کچھ بھی نہ بولنا...... تم زندگی کے اس موڑ پر کھڑے ہو جہاں تمہیں میرے لیے کچھ بننا ہے...... ان تمام باتوں کا دھیان چھوڑ دو...... اور کچھ بن جاؤ...... اس کی نظریں جھک گئیں...... مجھے تمہاری ضرورت ہے......

میں نے زیبا کا ہاتھ آہستہ سے جھٹک دیا...... میری آنکھوں میں صرف لاشیں اگتی ہیں...... تم ایک ایسے آدمی سے شادی کر سکتی ہو۔؟

(۶)

بند کمرے میں تنہائی کا احساس جان لیوا ہوتا ہے...... ایک ایسا بھی وقت تھا جب میں اذیت پسند بن گیا تھا۔ جب کچھ بھی سمجھ میں نہ آتا تو خود پر بیلٹ برسانے لگتا...... بدن پر بے شمار لکیریں بن جاتیں تو گہری سانس کھینچتا...... شاید میں اس کمرے سے باہر کہیں نہیں ہوں...... اور کمرے سے باہر لاش گھر کے سوا کچھ بھی نہیں ہے......

آنکھوں سے سارے منظر ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں...... اور پھر

میری فلک شگاف چیخ اچانک بہت ساری لاشوں کے گھیرے میں بلند ہو کر فضا میں پرواز کر جاتی ہے۔ میری آنکھیں میرا ساتھ چھوڑ رہی ہیں...... میں اندھیری سلطنت کے جابر ہاتھوں کا کھلونا بنتا جارہا ہوں...... مجھے کچھ نظر نہیں آتا...... کچھ دکھائی نہیں دیتا......

دوڑتے ہوئے لوگ میرے قریب آکر ٹھہر گئے ہیں...... آنکھوں سے لہو چھلک آیا ہے۔

کرفیو ختم ہو چکا ہے......

لاش گھر ... گیا ہے......

اور سڑک پھر سے ہلچل میں کھوتی جارہی ہے......

ڈاکٹر بڑا سا آلہ اپنی آنکھوں میں لگائے...... میری آنکھوں میں شعاعیں اتار رہا ہے......

پلیز لک اپ...... لک ڈاؤن...... لک اپ لک ڈاؤن......

''ڈاکٹر۔ میری آنکھیں درد کر رہی ہیں''

''پلیز لک اپ...... لک ڈاؤن...... لیفٹ...... رائٹ''

ڈاکٹر میری آنکھیں کھوتی جارہی ہیں۔

ڈاکٹر کے ہونٹ آہستہ سے بولے...... Retina Detatche...... کر چکی ہے۔ میجر آپریشن کرنا ہوگا۔

زیبا کی سسکیاں گونج اٹھی ہیں...... تم اب بھی لاش گھر میں رہ گئے ہو عالم...... میرے واسطے لاش گھر سے باہر آجاؤ...... باہر آجاؤ......

(۷)

جنگ مستقل جاری ہے۔

جنرل وارڈ میں جنگ کہیں بھی سنائی نہیں دیتی۔ آپریشن کے بعد آنکھوں میں

پٹی چڑھی ہے...... پلاسٹک خول آہستہ سے دباتا ہوں۔ بائیں آنکھ میں ہلکا ہلکا درد ہوتا ہے۔ ہر بیڈ پر ایسا ہی ایک جسم پڑا ہے۔ سب آنکھوں میں پٹی چڑھی ہے...... یہاں جنگ نہیں ہے۔ کسی کی آنکھوں میں نہیں ہے۔ صرف اپنا ایک وجود ہے......اور وجود کا سچ ہے۔ ایک ہفتے بعد چھٹی مل جائے گی۔ خالی وقت میں ہم پٹی چڑھے ہوئے سارے لوگ سمٹ کر ایک جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے اندر سمٹی دنیا کی رنگینی سامنے آجاتی ہے۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں...... جانتے ہو دنیا میں کیا ہو رہا ہے......

''غیر ملکوں میں لڑی جانے والی جنگوں کا کیا ہوا؟''

''اپنے ملک میں پھر کہاں کہاں فساد چھڑا؟''

مگر نہیں۔ یہاں لاش گھر کے باہر لوگ ہیں۔ جن کا اپنا الگ مسئلہ ہے...... اپنی الگ باتیں ہیں......اور ان باتوں میں، میں بھی شریک ہو جاتا ہوں......

(۸)

میں Retinal-detatchment اور Cryo-Thrapy کے آپریشن کے بعد پھر اس دنیا میں لوٹ آیا ہوں جسے عرف عام میں لاش گھر کے نام سے جانا جاتا ہے...... جہاں آج بھی شعلوں میں گھرے مکانات اور عجائب خانہ میں رکھی ہوئی نیم وحشی مخلوق میری آنکھوں میں تیرتے رہتے ہیں۔ مگر میں جنرل وارڈ میں داخل ہو کر زندگی کی معنویت میں بھی داخل ہو چکا ہوں۔ جہاں میرے اندر میری اپنی باتیں ہیں۔ اور میری زیبا کا سچ میرے اپنے تعلق سے جانے کتنی ہی بار سامنے آیا ہے۔ اور وارڈ کے مریضوں کی آنکھوں میں چمک جاگ اٹھتی ہے۔ ''تمہاری آنکھوں میں روشنی دیکھ کر وہ کتنی خوش ہوگی؟''

''میں ابھی بھی اس کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں''

مریضوں کے چہرے پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔ اور میں نے اپنے اندر جھانکا جہاں ایک سجی سنوری خواہش دلہن بنی ہوئی نہاں خانے میں شرمائی شرمائی بیٹھی تھی......

(۹)

"شنکر یتر الیہ" سے میں دور آ گیا ہوں......

عجائب خانہ کی تمازت پھر میرے وجود میں رچ بس گئی ہے......روز روز کے ہنگاموں پر اب آنکھیں نہیں ٹھہرتیں نہ گیلی ہوتیں ہیں......میں چپ چپ سر جھکائے بے حس لبادے میں آگے بڑھ جاتا ہوں......کہ آنکھوں میں پھر وہی لاش گھر نہ سلگ جائے......تو زیبا میرے راستے کو اچانک روک دیتی ہے

"کل تمہیں چوک کے قریب سے آتے دیکھا۔ پتہ نہیں کیوں تم ادیب نہیں لگتے۔ تمہارے بغل سے ایک لاش گزری۔ اور دنوں کی طرح کوئی خاص تاثر تمہارے چہرے پر نظر نہیں آیا۔ یہ میرے لیے ایک بڑی بات تھی اور حیران کن بھی۔ پتہ نہیں کیوں سب بدل رہا ہے......دنیا کا نظام بھی، دستور بھی......اور شاید تم بھی......تم بھی!"

آنکھوں میں پھر وہی لاش گھر سلگ گیا ہے۔ پتہ نہیں زیبا نے کیا محسوس کیا ہے کیا سمجھا ہے......میں زیبا کو کیا کہوں......کیا جواب دوں کہ لاشوں کے اتنے گھیرے میں، میں خود ایک لاش بن گیا ہوں۔ ایک گرم لاش......

اور......کیا تم میرے لیے ریگر مورٹس کا انتظام کر سکتی ہو......؟

OO

فنکار، ۱۹۸۴ء

بٹوارہ (☆)

بابا کی آنکھوں کے دیکھنے کا سلسلہ یگ یگ سے جاری ہے......

بابا کچھ بولتے نہیں...... بس چپ رہتے ہیں اور چپ چپ بولنے والے چہروں کا منہ تکا کرتے ہیں۔ کبھی اپھنتے ہوئے جذبات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کبھی بانہوں میں حرکت کرتی ہوئی مچھلیوں پر آنکھیں ٹھہر جاتی ہیں اور کبھی مچھلیوں سے جاری لہو کے فواروں پر...... مگر بابا نے اپنے ہونٹوں کو سی لیا ہے۔ ہوا مخالف ہو تو لب کیونکر بولیں گے اور ہوا میں جب جنگ کے جراثیم گھل گئے ہوں تو بھلا بولیاں منہ سے کیونکر باہر آسکتی ہیں۔ بس کبھی کبھار موقع ملتا تو لاٹھی ٹیکتے ہوئے سفید پاجامے اور براق کرتے میں ملبوس مولوی برہان الدین کے یہاں پہنچ جاتے۔ برہان الدین بھی اکثر چپ رہتے۔ ہاں اتنا ضرور ہوتا کہ جگجیت بابا کا اٹھ کر استقبال کرتے پھر اشارے سے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتے...... سلامو نکل کر باہر آتا تو دو چائے کا حکم بھی اشارے سے دے کر کرسی نکال کر بیٹھ جاتے... شاید اخلاقاً ہی یا ضروری انسانی تقاضے کی خاطر اندر کے انتشار اور کرب کو دابتے ہوئے بس اتنی سی آواز باہر نکلتی...... "کیسے ہو؟" اور بدلے میں وہی رٹی رٹائی صدا جگجیت بابا کے ہونٹوں سے بھی پھسل پڑتی...... "بس جی

(☆) یہ کہانی اس وقت لکھی گئی جب پنجاب میں دہشت گردی دھیرے دھیرے سر اٹھانے لگی تھی۔

رہاہوں!"

اور بساط پر دو بوڑھے آنکھیں گڑائے زمانے سے بے خبر ہو کر بیٹھ جاتے......

کبھی کبھار بغل سے رام اوتار شاستری جی بھی ٹپک پڑتے۔ ڈنڈا ٹیکتے ...... آنکھیں گلوکو، کا شکار ...... ایک نمبر کے باتونی ...... شطرنج پر پھسلتی نگاہیں، ہوں ہاں کرتی ہوئی شاستری جی کی لمبی چوڑی باتوں کو سن رہی ہوتیں اور شاستری جی زمانے اور محلے کے تمام دکھوں کی پوٹلی لے کر سلگ جاتے ...... بیچ میں کبھی کبھار برہان الدین اخلاق کو مجروح ہونے سے بچانے کے لیے ماچس کی ہلکی سی تیلی کا استعمال کرتے اور بساط روک کر تینوں بوڑھے خاموشی سے سر جھکائے کمرے کی پراسرار ویرانی کا ایک حصہ بن جاتے۔

شاستری جی نے بھی زمانہ دیکھا تھا۔ گلوکوما نے آنکھیں لے لیں تو کیا ہوا۔ دھندلی دھندلی آنکھوں میں اب دیکھنے کو باقی بھی کیا بچا تھا۔ عمر کی اس منزل پر تھے جہاں زمانے کی تھکن اور تجربوں کی تلخیاں آنکھوں کی تمام رونق اڑا کر لے جاتی ہیں۔ وہ اکثر کہتے ...... ان آنکھوں نے کیا کیا نہیں دیکھا؟ اب تھک گئی ہیں اور جسم کے بوڑھے کھنڈر میں آرام کر رہی ہیں۔ بوسیدہ بدن کی کمزور عمارت پر اب بھی وہ آنکھیں ٹھہری ہوئی ہیں مگر اب فردا نہیں دیکھتیں نہ گزرے کل کو تلاشنا چاہتی ہیں ...... بس ایک تھکن ہے جو ہمیشہ کے لیے اوڑھ کر سو جانا چاہتی ہیں۔

بوڑھے ہونٹ، لمبی عمر کے تجربے اور گہرے فلسفے کو محسوس کر کے مسکرا کر رہ جاتے ہیں، اور بساط سے نکلتی ہوئی کتنی ہی باتیں نئے اور پرانے زخموں کی حصہ دار بن جاتی ہیں۔

کچھ وقفے خاموشی کے بعد برہان، جگجیت سے پوچھتے ہیں ...... "تمہارا وہ بج دھاری بیٹا مہر ...... کہاں ہے آج کل ......؟"

جھری بھرے ہاتھ بساط پر مچلتے ہیں۔ "اپنے کپڑوں والے نئے شوروم میں۔ روز روز بزنس بڑھا رہا ہے۔"

"اب ایک بھولے آؤ جگجیت...... برہان ہنستے ہیں۔"

اور جگجیت۔۔۔۔ کچھ بولتے نہیں...... چپ چپ جذبات سے عاری چہرہ لیے۔ پاؤں کے پاس پڑی ہوئی لاٹھی پر اپنے ہاتھ کی گرفت ذرا سخت کرتے ہیں۔ کوئی مسکراہٹ نہیں ہے ان چہروں پر۔۔۔۔ صرف جھریاں ہیں اور جھریوں میں کھوئی ہوئی تاریخ ہے...... تاریخ کے خون میں ڈوبے ہوئے صفحات ہیں......

کھیل آگے چلتا ہے اور دھندلی دھندلی آنکھوں کے تعاقب میں شاستری جی کے باتونی ہونٹ بولتے رہتے ہیں۔

"دنیا میں آنے کا ایک فائدہ تو ہوا...... ہم نے انقلابات دیکھے۔ دوسری جنگ عظیم دیکھی۔ بدلتے ہوئے چہروں پر خون کے مڑتے ہوئے دھارے دیکھے۔ آنکھیں تب بھی تھکی تھیں مگر سوچتی نہیں تھیں...... بچوں سے بولتا ہوں تو ہنستے ہیں کہ آنکھیں بھلا سوچتی کب ہیں؟ کیسے سمجھاؤں کہ بچو! یہ آنکھیں تو جنم جنمانتر سے دیکھتی اور سوچتی آئی ہیں۔ جب جب ان آنکھوں نے کچھ دیکھا ہے...... تب تب سوچا ہے...... دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریاں اب بھی ان آنکھوں میں مچلتی ہیں۔ جو لہو لہو سرخیوں میں ہمارے سامنے آئیں۔ جو انقلابات کی وجہ بنیں...... اپنی غلامی یاد ہے...... انگریزوں کے ظلم یاد ہیں...... تمہیں یاد ہے جگجیت......؟"

بساط پر چلتے چلتے ہاتھ رک گئے ہیں...... ایک ٹھہراؤ آگیا ہے......

اور شاستری ویسے ہی بولے چلے جا رہے ہیں۔

"تب ہوٹلوں میں لکھا ہوتا تھا۔ Dogs and indians are not allowed ہم میں اور کتوں میں فرنگیوں نے کوئی تمیز نہ کی...... پر ہم نے کون تمیز کی اب؟ گھر جلاتے ہوئے ہاتھ کہاں آدمی اور کتے کی تمیز کرتے ہیں۔ سڑک پر لوٹتے اور فساد کرتے ہوئے ہاتھ کہاں جانوروں کے چہرے اور اپنے چہرے کا موازنہ کرتے ہیں۔ اب دو آدمی زور سے بولتے ہیں تو لگتا ہے کہ بھونک رہے ہیں۔ ایک کتا ان میں سما جاتا ہے اور جانے کیوں لگتا ہے، یہ کتا اب کاٹے گا...... اب کاٹے گا اور سڑک خون میں نہا جائے گی۔"

شاستری جی چپ ہوتے ہیں، جانے کیا سوچ کر...... ایک منٹ...... دو منٹ......
شطرنج پر تھرکتے ہوئے ہاتھ اس اچانک کی چپ سے ٹھہر گئے ہیں۔ شاستری جی کیوں چپ ہیں؟ شاستری کو چپ نہیں ہونا چاہیے۔ ان کی بک بک میں ہی زندگی ہے...... وہ بس بولتے رہیں، یہی خواہش ہوتی ہے۔ مگر کون جانتا ہے۔ بولتے بولتے کب اپنا کچھ یاد آجائے...... کچھ پچھلا، کچھ پرانا...... اپنے سے وابستہ کچھ کہانیاں...... جن میں کچھ سوغاتیں ہوں...... سوغاتوں میں سرخ رنگ چھپا ہو...... سرخ رنگ اچانک نظر کے آگے آجائے تو آنکھیں خوفزدہ ہو جاتی ہیں۔ پھر اتنا ہوتا ہے کہ ایک کھٹ کی آواز ہوتی ہے، اور جب تک بساط کو گھیر کر بیٹھے ہوئے دو بوڑھے کچھ سمجھنے کی کوشش کریں، ان کے درمیان سے ایک بوڑھا لاٹھی ٹیکتا ہوا دور جا چکا ہوتا ہے۔"

شاستری چلا گیا۔

مگر کل پھر آجائے گا۔۔۔ اپنی پرانی بولیوں کے ہمراہ۔۔۔

شطرنج کی بازی بغیر جیتے ہی بند کر دی گئی ہے۔ چائے خالی کر کے ٹیبل پر رکھ دی گئی ہے۔ سر جھکائے بے زبان مکالمے ادا ہو رہے ہیں۔ اور اس بیچ پوپلے ہونٹوں سے بس اسی قدر آواز باہر نکلتی ہے......

"نئے بچے ہم پر الزام عائد کرتے ہیں کہ ہم پرانے ہیں۔ ہم انہیں سمجھتے نہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیان فرق ہے۔ مگر وہ کیا جانیں کہ ہم تو وہ ہیں کہ کبھی صحیح سالم ہوا دیکھی ہی نہیں۔ جب دیکھی مخالف ہوا، جب سنے جنگ کے بگل۔ تمہیں اپنوں کی یاد آتی ہے برہان؟"

جگجیت بابا سوال کرتے ہیں......

"یاد کب نہیں آتی۔ کون اپنا دور ہے مجھ سے۔ میرے دل سے۔ سب تو اب بھی قریب ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ دور چلے گئے۔ نوج نہ پاکستان بنتا۔ نہ گھر کا بٹوارہ ہوتا۔ یہ بوڑھا اپنے چھوٹوں کو رخصت ہوتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ منجھلے بھائی کے انتقال کی خبر سنی تو بچپن کی شرارتیں یاد آگئیں۔ اس وقت کتنا چھوٹا تھا۔ ابھی ٹھیک طرح سے بھائی سے

گلے بھی نہ مل پایا تھا کہ چچا دونوں بھائیوں کو لے کر پاکستان چلے گئے۔ میری ضد پر مجھے چھوڑ گئے۔ اکرم کا بیٹا بھی دو سال پہلے گزر گیا۔ اس کو تو بس ایک دو بار ہی دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔۔ سننے میں آیا ہے کہ باصرہ کو کینسر ہو گیا۔ اللہ بچائے۔ بس لے دے کے یہی بہن تھی۔ یہ بھی شوہر کے ساتھ پاکستان جا بسی۔ تین بچے ہیں۔ صرف ایک لڑکی کی شادی ہوئی ہے، اور موت گلے لگائے بیٹھی ہے۔ بس یہی سوچ سوچ کر ادھ مرا ہو جاتا ہوں کہ ان لوگوں سے کب مل پاؤں گا...... یا کبھی نہیں......"

جگجیت چپ ہو گئے ہیں۔

یہ وہ داستان ہے جو ایک خاص عمر کے بعد شروع ہوتی ہے۔ والہانہ محبت کا بیج ایک خاص عمر میں پھوٹتا ہے۔ تلاش معاش اور دیگر ضرورتیں رشتے ناطوں کے بیچ اس طرح اثر پذیر ہوتی ہیں کہ پتہ بھی نہیں چلتا اور سب ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک کہانی مختلف واقعات وحادثات کی شکل میں سامنے ہوتی ہے۔

"برہان الدین! یہ غم صرف تمہارا ہی نہیں ہے ...... میرا بھی ہے اور ...... شاستری کا بھی ہے...... جانے کس کا کس کا ہے......"

آہستہ سے اٹھے جگجیت۔ لاٹھی تھامی، نڈھال قدموں سے گھر چل پڑے۔

لاہور کی یادیں دلوں مین اب بھی تازہ ہیں، کون بھلا سکتا ہے انہیں۔ وقت کی آندھی نے بدن کی عظیم الشان عمارت کو تو ہلا دیا مگر اوراق پارینہ دلوں سے دور نہ کر سکیں۔ پنجاب کے بٹوارے کا زخم دل میں چبھا۔ گلے سے سیاپا، کی تیز آواز نکلی۔ رخصتی کے وقت لہو روتی کتنی ہی آواز بار بار قدم روک رہی تھی۔ سیاپا کرنے والوں کا ہجوم وحشت سے آنکھوں میں بجھے خواب لیے دیکھ رہا تھا...... "تم بھی چھوڑ جاؤ گے بھیا......"

وین، کی آواز آسمانی چھتوں پر منڈراتے گدھوں کی آنکھوں میں اتر گئی......اچی

پگڑی والے کتھے چھٹ گیا لال چوڑے والی نوں...... ہائے ہائے شیرا...... ہائے ہائے میرا......"

"بھیا۔" پھر جیسے کوئی دامن پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے موراں بہن کو دیکھا۔ بھرّائے گلے سے آواز باہر نکلی ...... "یہاں کون غیر ہے پگلی ...... پر اب بٹوارے کی چھری جسم میں اتر گئی ہے۔ اب یہاں دل نہیں لگتا۔ وہاں سے آرہ تک کا سفر ایک لمبا سفر ثابت ہوا۔ وقت کئی زخموں کو بھر دیتا ہے مگر بعض گہرے زخم بھرنے کی اس میں طاقت نہیں ہے۔ پنجاب کا زخم گرونانک مارکیٹ میں شاندار دکان ملنے، بزنس کے پھیلنے اور کئی کپڑے کے شوروم کھلنے تک باقی رہا۔ بلکہ وقت کے ساتھ اور پھیلتا گیا، گہرا ہوتا گیا۔ لاہور کی گلیوں کے ہنگامے، موراں بہن کے سیاپے کی دردناک فضا، امریندر کا لہو میں ڈوبا ہوا جسم، مہندر کی بھری ہوئی کوکھ، اور ایک دہشت بھرا ماحول...... بجھی آنکھوں میں اب تک سب زندہ تھا۔ بچوں کی آنکھوں کی تازگی اور تازگی سے پیدا ہونے والے نئے نئے خواب، کبھی کبھی کچھ بھلا پانے میں کامیاب بھی ہوتے مگر گہری خاموشی میں گرنتھ صاحب کا مطالعہ کرتے ہوئے ہاتھ ٹھہر جاتے۔

گرو تیغ بہادر اور گرو گوبند سنگھ کی یادوں سے ہوتا ہوا قافلہ پنجاب کے پیٹ میں اترے ہوئے قصاب کے چابک کو دیکھنے لگتا۔ اور آنکھوں میں پھر وہی خونی تاریخ رینگ جاتی۔

یہ کل کی بات تھی اور یہ آج کی بات کہ اکثر برہان الدین وقت کی بے بسی کا چرچا کرتے تو خلافت کے خاتمے کے ذکر پر اداس ہو جاتے...... "نادان ترک نے خلافت کی قبا چاک کر دی...... چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا۔"

"ایک سے لباس میں سب ایک سے چہرے تب کتنا اچھا لگتا تھا"

جگجیت کہتے ...... "یہ کہانی بھی کچھ الگ نہیں، آج سے ۲۸۵ سال قبل یعنی ۱۶۹۹ء میں گرو بند سنگھ نے اسی واسطے خالصہ کی بنیاد ڈالی تھی کہ ایک مخصوص لباس، سب دور سے پہچانیں جائیں...... یہی تو مقصد تھا۔"

تعاقب کرتی ہوئی آنکھیں ہر مندر اور مہر پر ٹک جاتیں۔ ہر مندر کے بڑے بڑے کیس چھوٹے بھائی امریندر کی یاد تازہ کر دیتے۔ ایسا ہی قد اور جسم پایا تھا امریندر نے، پنجاب کا خالص لہو دوڑ رہا تھا اس میں۔ کھلا ہوا سخت چہرہ۔ تنے ہوئے بازو، ہٹا کٹا لمبا نوجوان۔ مہر کے چھوٹے بال پنجاب کی گزری کہانیوں میں اودھیش بھیا کو تلاش کر لیتے۔ جو ہولی! دسہرے اور بیساکھی کے تیوہار میں جی بھر کر ان کا ساتھ دیتے۔ پنجہ صاحب کے یہاں بھی جاتے۔ نانک جی کی پیدائش کے موقع پر سارے گھر کو ان کے یہاں بھیج دیتے، ہولی کے موقعے پر سارا جسم رنگوں میں کھو جاتا......

''لوکاں دیاں ہولیاں تے خالصے دا ہولا ئے''

سوچا تھا گزرے ہوئے وقت کے ساتھ سب کچھ ختم ہو گیا۔ یادیں لاہور کے ساتھ ہی دفن ہو گئیں، مگر نہیں۔ شاید وہ پہلی ہولی تھی جبکہ اداس تھے وہ، بدن میں نشتر چبھے دن ہی کتنا ہوا تھا۔ کرائے کے مکان سے باہر ہولی کھیلتے بچوں، جوانوں کو دیکھ رہے تھے۔ تب تک وہ جوان قدم آگے بڑھے۔ خوبصورت چہرہ، تنا ہوا سڈول جسم۔ آ کے رنگوں سے شرابور کر دیا انہیں، اچانک اس محبت سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سب کچھ بھول کر دونوں کے گلے لگ گئے۔

''ہم آپ کے پڑوسی ہیں بھائی۔ محبت کے رنگوں کا آپ نے بُرا تو نہیں مانا''

جگجیت سنگھ نے گلے لگا لیا۔ ''آج تو تم نے زخم بھر دیئے دوستو۔ نہیں معلوم تھا۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہان میں ـــــ، میرا نام شاستری ہے۔ رام اوتار شاستری۔ یہ ہیں میرے دوست برہان الدین۔''

جگجیت ایک بار پھر گلے لگ گئے۔ برہان کے چوڑے چکلے سینے میں عجیب سی گرمی کا احساس ہوا۔''

ہم تمہارے قریب ہیں بھائی۔ جب ضرورت پڑے۔'' آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے وہ لپکے قدموں سے اندر آئے...... ''مہندر...... مہندر کور......''

آنکھیں جیسے ٹھہر گئی ہوں...... شلوار جمپر میں مہندر قیامت لگ رہی تھی۔ سینے

سے لپٹالیا۔ "مہندر رہولی زندہ ہے۔ وقت اگر زخم دیتا ہے تو بھرنا بھی جانتا ہے......"
مہندر بازوؤں میں مچل گئی......رنگوں سے شرابور کرتے ہوئے وہ پھر گنگنا اٹھے۔ "لوکاں دیاں ہولیاں تے خالصہ دا ہولا ئے۔ لوکاں دیاں ہولیاں۔"

بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ بچوں کو ایک ساتھ بڑا ہوتا دیکھ کر کتنا اچھا لگتا ہے۔ پاکستان کے بٹوارے نے آنکھیں نم کیں۔ برہان الدین کا بھرا بھرا خاندان خالی ہو گیا۔ خاندان کے زیادہ تر لوگ پاکستان جا بسے۔ آنکھوں سے گنگا جمنی بہہ گئی۔ اب لگتا ہے کہ بوڑھا ہو چلا ہوں۔ کل تک احساس نہیں تھا۔ بھائی بہنوں میں وہی لاڈلا بنا عمر کے احساس سے دور چلا گیا تھا۔ اب گھر میں پسری ہوئی لمبی خاموشی اچانک تنہائی سے نکل کر بڑے ہوتے ہوئے بچوں میں سما جاتی ہے۔ ادھیڑ عمر کا احساس اندر پلنے لگتا ہے......گھاؤ کی طرح......کل مل پاؤں گا ان سے......یا کبھی نہیں......شاید کبھی نہیں......!

جگجیت برہان الدین کے زخم سے واقف تھے۔ برہان الدین نے اپنے بھائی اور بہن کی محبت کی جو تصویر سامنے رکھی تھی اس نے کئی خوں آشام جنگوں کو ڈھک لیا تھا۔ کرائے کے مکان کی زندگی اب بوجھ لگنے لگی تھی۔ دکان جم گئی تھی۔ سرداروں کی اچھی خاصی ساکھ شہر میں قائم ہو گئی تھی۔ سردار باڑی میں سکھوں نے اچھی خاصی زمین خرید لی تھی۔ اور وہاں مکانات بننے لگے تھے۔ برہان الدین کھاتے پیتے گھر کے تھے۔ سیکڑوں بیگھہ زمین۔ کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ رئیسانہ شان آج بھی قائم تھی۔ شاستری بھی اچھے گھر کے تھے۔ ڈی او آفس میں ہیڈ کلرک تھے۔ شام کے وقت ڈیرا برہان الدین کے گھر ہی جمتا۔ شوروم میں بچوں کو بٹھا کر جگجیت بھی وہیں پہنچ جاتے۔ باتوں کا ایک لمبا سلسلہ چل پڑتا۔ برہان زیادہ تر چپ رہتے۔ شاستری بولتے رہتے اور جگجیت کی نگاہیں شطرنج پر دوڑتی رہتیں۔ اس دن جگجیت خوش تھے۔ آہستہ

سے بولے......

"بھائی لوگو! سردار باڑی میں میرا مکان بن گیا ہے پرسوں شاندار دعوت رہے گی۔"

"بھول مت جانا جگجیت۔ اب تو برسوں کا یارانہ لگتا ہے"

"کیسی بات کرتے ہو یار لوگو۔" جگجیت آہستہ سے بولے۔ "پنجہ صاحب کی قسم، تم لوگ بھولنے کے لائق نہیں ہو۔ خرماں والیاں، بختاں والیاں ہمیشہ ہمیشہ تمہیں خوش رکھے"

آنکھوں میں چند آنسو سمٹ آئے۔ نہیں معلوم یہ آنسو کیسے تھے۔ شاید برسوں بعد محلّہ چھوڑنے کے غم میں بہہ گئے تھے یا برسوں بعد یاروں سے کچھ دور جانے کے خیال سے آ گئے تھے......

اور اس دن جگجیت کا سامان اپنے نئے مکان کے لیے ڈھویا جا رہا تھا۔ شاستری ہچکیوں سے رو رہے تھے۔ برہان الدین اور جگجیت دونوں چونک پڑے۔ دوست کے کندھے پر کانپتا ہوا ہاتھ رکھا۔ جگجیت نے شاستری کو گلے لگا لیا۔

"دوسری جنگ عظیم میں بھی یہ آنکھیں اس قدر نہیں بھیگی تھیں۔ ایک تسلی ملی تھی۔ گھر کی، بیوی بچوں کی تسلی۔ بیوی کے غم نے واسطے بچوں کے رونے سے دور رکھا......پاکستان کے بٹوارے کو آزادی کے خیال نے چپ کرا دیا...... غم ضرور ہوا تھا کہ بھائیوں نے اپنا گھر تعمیر کر لیا۔ مگر محلے میں آیا ہوا ایک بھائی جس نے سارے غموں کو پاٹ لیا تھا، اب یہ محلے کا مکان چھوڑ کر دوسری جگہ جا رہا ہے تو خود کو روک نہیں پا رہا ہوں......"

اور جگجیت سسک اٹھے...... "بھائیا جی! ملتے، رہیں گے ہم...... بھائیا جی......"

جانے کیسی آواز تھی کہ برہان الگ کھڑے ہو گئے...... غمگین اداس چہرے کے ساتھ......

اور بساط پھیلتی جا رہی تھی۔

ہرمندر نے کپڑے کی نئی دکان کھولی تو شوروم کا افتتاح برہان الدین نے کیا۔ چشمے سے جھانکتی کمزور آنکھیں ہرمندر کو مبارکباد دے رہی تھیں۔ شاستری بھی خاموش تھے۔ جگجیت ایک طرف چپ چاپ کھڑے تھے۔ جانے کیسے لاوے تھے جو اندر ہی اندر سلگ رہے تھے۔ پھر ایک نئے پنجاب کا خواب؟ ہرمندر کی آنکھوں میں پلنے والے خوفناک جانور کو پے در پے صدمات نے نڈھال کر دیا ہے۔ کچھ دن پہلے بچی بھی سسرال میں بچے کو جنم دینے کے بعد چل بسی۔ پھر بیوی۔ برہان! ہم حادثات میں جی رہے لوگ ہیں، جن کا لمحہ لمحہ حادثوں میں گزرتا ہے۔ لوگ سمجھتے رہے، برسوں کی محبت نے برہان کو رلا دیا ہے۔ مگر وہ تو برہان کے جھری نما چہرے میں برسوں کی تھکن دیکھ رہے تھے۔ چہرے پر جھولتے چشمے سے برہان کے اندر مچل رہے جذبات کو محسوس کر رہے تھے۔ شاستری ریٹائر ہو چکے تھے۔ بیوی کب کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ دو لڑکیاں تھیں۔ دونوں شادی کے بعد اپنی سسرال جا بسی تھیں۔ ان سب کو اندر دابے مسکراتا رہتا ہے شاستری۔ اندر کی چبھن دابے بولتا رہتا ہے شاستری......اور جب بچوں نے دکان سنبھالی تو کسی قدر آرام کی سانس لینے کا موقع ملا تھا جگجیت کو۔ مگر مہندر کور کی اچانک موت نے ایک ساتھ دو واقعے کو جنم دیا تھا۔

ہرمندر کہہ رہا تھا۔ ''بابو جی، اس گھر کی اینٹ اینٹ سے دو طرفہ مذہب کی بو آتی ہے۔ میں یہ گھر چھوڑ رہا ہوں۔ ماں کی زندگی تک ماں کا خیال کیا۔ پر اب نہیں رہ سکتا۔''

''تم چلے جاؤ گے؟''

ہرمندر کا سر جھک گیا۔ دوسرے موڑ پہ مہر سر جھکائے کھڑا تھا۔

''تم صرف جانا چاہتے ہو یا پھر یہ رشتہ بھی ختم کر رہے ہو''

''شاید دونوں ہی بابو جی!'' ہرمندر کا صاف جواب تھا۔

جگجیت کے ہاتھوں میں لاٹھی کانپ گئی۔ ریشے ریشے میں طوفان آگیا۔ شریانوں میں خون مچل اٹھا۔ ''تم جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ...... چلے جاؤ......''

سامان جاتا رہا۔ جگجیت دیکھتے رہے۔ مہر دیکھتا رہا۔ بچے اپنے پیروں پر کھڑے ہو چکے ہیں۔ اچھا بھلا سب کچھ جان چکے ہیں۔ صرف پچھلا بھول جانا چاہتے ہیں۔ وہ پچھلا جسے وہ آج بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں...... ہرمندر جارہا ہے۔ نہیں نہیں...... یہ تو چھوٹا بھائی امریندر جارہا ہے...... خون میں سنی ہوئی لاش آج بھی لاہور کی یاد دلاتی ہے...... امریندر...... بھائی امریندر......!

ہرمندر کی بدلی ہوئی کیفیت وہ کئی روز سے دیکھ رہے تھے۔ جب اس نے خالصتان کی مانگ پر سرخ چہرے کے ساتھ اپنی جائز مانگ کا اعلان کیا تھا۔ وہ دبی دبی آواز میں بس اتنا ہی کہہ پائے تھے۔

"بیٹا! پاکستان کے بٹوارے نے بھی ہندوستان کے دل کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ یہ میری ماتر بھومی ہے جیسے کہ یہ میرا گھر ہے اور میرے گھر میں میرے تمام بچوں کے الگ الگ کمرے ہیں۔ کوئی بچہ اگر لڑ جھگڑ کر اپنا ایک الگ گھر لے لے تو باپ کے دل پر کیا گزرے گی۔ یہ اچھی مانگ نہیں ہے"

ہرمندر نے سخت جواب دیا تھا۔

"بابو جی! ہمیں کچلنے کی سازش قدم قدم پر ہوتی رہی ہے۔ ہم ظلم سہنے کے عادی بنا دیئے گئے ہیں۔ ہر جگہ ہمارا استحصال ہو رہا ہے۔ جنگ میں ہم لڑتے ہیں۔ قربانیاں ہم دیتے ہیں۔ یہ تاریخ گواہ ہے۔ ہماری شہادت سے ہندوستان کی تاریخ رنگی ہوئی ہے۔ مگر اس کا کیا پھل ملا ہمیں۔ ہندو ذات نے ہمیں کیا دیا۔"

'بیٹا'۔۔۔اپنے کیس دھاری بیٹے کو دیکھتے رہ گئے تھے جگجیت۔"

سج دھاری مہر سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس وقت بھی اپنی عادت کی طرح خاموش۔ بھائی کی باتوں کو سنتا ہوا۔ ہرمندر کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔

"ہم ایک الگ اسٹیٹ چاہتے ہیں۔"

ہرمندر چلا گیا۔

بساط پر دوڑتے ہوئے ہاتھ ٹھہر گئے۔ شاستری بولتے بولتے چونک گئے۔ برہان

لبی لبی سانس بھرنے لگے...... "کیا کہا ہر مندر چلا گیا...... تم نے خبر تک نہ کی۔ غیر سمجھا ہمیں۔۔۔ جھری بھرا چہرہ داستان غم بن گیا۔

"بچے تاریخ بنانے لگے ہیں۔ اب بڑے ہوگئے ہیں نا"۔ جگجیت کے ہاتھ میں مہرے کانپ گئے، کھیل ٹھہر گیا ہے۔

"پنجاب میں سکھوں کی بری حالت ہو گئی ہے۔ بیساکھی کے دن اکال تخت میں اکالی لیڈروں نے ۳۱۵۰۰ لوگوں کو 'کر دیا مارو' کا شپتھ گرہن کرایا ہے۔" شاستری خبر سناتے ہیں۔

طنز سے مسکراتے ہیں جگجیت۔ "سب کچھ سن رہا ہوں دوستو! ہر مندر کی زبانی تو بہت کچھ سنا۔ پڑھا کم سنا زیادہ"

پچھلے دنوں ہی ہر مندر جب اپنے چند سکھ دوستوں کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا تو اس کی تیز آواز دروازے کے باہر کھڑے ان کے بوڑھے جسم میں ہلچل مچا گئی تھی۔

"بیساکھی کا تیوہار بڑا معزز تیوہار ہے۔ لونگوال اور بھنڈراں والا نے کہا ہے۔ آج شہیدی جھتے کا گٹھن ایک تاریخی ضرورت ہے۔ ہمارے گروؤں نے سکھ پنتھ کی گریما کو بنائے رکھنے کے لیے آتم بلیدان کو ایک ماتر بل دیا ہے۔ سکھوں پر پولیس اتیاچار کر رہی ہے۔ ہم غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ پولیس گردواروں میں داخل ہونے کا ناپاک ارادہ رکھتی ہے۔ ہم مقابلہ کریں گے۔"

آہستہ سے بولا تھا ہر مندر۔۔۔ "بولے سونہال۔" جواب دیا تھا دوستوں نے "ست شری اکال" اور کانپ گئے تھے دروازے کے پاس جگجیت بابا...... اپنے بوڑھے ہوتے ہوئے وجود کے ساتھ ــــــ کھیل چلتا رہتا ہے۔ باتیں ہوتی رہتی ہیں۔

شاستری کہہ رہے ہیں۔ پنجاب کی صورت حال بے حد نازک ہوتی جا رہی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اس کا اثر کتنا گہرا ہو گا۔ اب تو یہ عالمگیری رنگ اختیار کر چکا ہے۔ سکھوں کی جماعت نے فیروز پور اور شری گنگا نگر میں اسٹین گن اور رائفلوں سے بھری

پوری بوگی لوٹ لی۔

سنتے ہیں جگجیت، کچھ بولتے نہیں۔

''ــــــ مال خانہ سے اسلحے چوری ہو گئے۔''

''ــــــ پنجاب پولیس سے سکھوں کو الگ کیا جانے لگا۔''

''ــــــ مال خانہ سے سکھ نکالے جانے لگے۔''

''ــــــ پنجاب میں کرفیو۔''

بساط پر تھرکتے ہوئے جھری بھرے ہاتھ کانپ اٹھے ہیں۔ ''پھر وہی شروعات!'' بولتے بولتے شاستری دھندلی دھندلی آنکھوں سے جگجیت کو تکتے ہیں ''تم ان کے بارے میں کیا سوچتے ہو جگجیت؟''

''بچے ہاتھوں میں گن اٹھالیں تو کون سا عمل دہراؤ گے تم؟''

سوکھے ہونٹوں پر زخمی پپڑیاں کانپ گئی ہیں۔ ''مخالف ہواؤں نے اب کچھ بھی سوچنے اور سمجھنے کے لائق نہیں رکھا۔ صرف ہونی کو دیکھ رہا ہوں...... دیکھتا جا رہا ہوں......''

''اس دن ہر مندر کا بچہ اسکول سے جگجیت کے گھر آیا تو لپک کر گود میں اٹھا لیا ــــــ زور سے سینے میں بھینچا ــــــ ''کیا بات ہے پتر؟''

''پتا جی ملنا چاہتے ہیں۔''

''یہ دروازہ تو ہمیشہ کھلا ہے۔ وہ خود ہی الگ ہوا ہے۔''

آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

شام میں ہر مندر آیا۔ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ جان بوجھ کر پنجاب کے مسئلے سے الگ ہٹ کر گھریلو واقعات میں الجھے رہے۔ ایک بار بھی تو اس نے مہر کی خیریت نہیں پوچھی۔ یہی بات دل کو کھل گئی۔ مگر جس کا ڈر تھا۔ وہی ہوا۔ ہر مندر نے پھر وہی بات چھیڑ دی۔

''پتا جی! پنجاب میں پریسیڈینٹ رول لگ گیا ہے۔ دنگائیوں کو دیکھتے ہی گولی مار

دینے کا حکم ہے۔ یہ دنگائی کون ہیں بابو جی۔ ہم یا آپ؟...... کون ہیں......ہنگامہ ہے کہ ۱۹۶۵ء کی طرح کچھ گھس پیٹھی بارڈر پار کر کے چلے آئے ہیں. .... کون آئے ہیں سیماپار کر کے ...... بنگلہ دیش میں ہوئی فوجی بغاوت کیوں بھلادی جاتی ہے......"

ہر مندر ہانپ رہا ہے......!"پنجاب سلگ رہا ہے بابوجی۔ اسے بچانا ہمارا فرض ہے۔ اگر انہوں نے ہمارے پوتر استھان کو گندہ کیا تو......؟"

"تو.........."

جگجیت بابا کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ خود کو دابے نہیں رہ سکے۔ پھر آہستہ سے بولے۔

"یہی۔ ایدیش دینے آیا ہے تو...... چلا جا یہاں سے، چلا جا...... اخبار میں بھی پڑھتا ہوں...... میں بھی پوجا گھر کی چھتوں سے برستے ہوئے پتھر دیکھ رہا ہوں......"

ہر مندر غصے میں سلگ گیا۔ جانے کیا کیا اول فول بکتا ہوا دروازے کے باہر نکل گیا۔

آہستہ سے بڑبڑائے جگجیت۔ "مہندر کور۔ تم نے کیسے بچے کو جنم دیا ہے۔ پنجاب کا گرم لہو گو میرے بدن میں بھی ہے۔ مگر ماتر بھومی کی سوغات پر آنکھیں بند کر لوں ...... نا ممکن...... نا ممکن......"

مہر نے آہستہ سے سر نکالا۔ "پتاجی! بھائیاجی کی باتیں اب برداشت نہیں ہوتیں۔ اب اس نے کچھ بولا تو......؟"

"تو کیا؟" وہ چونک اٹھے...... "تو بھی الگ ہو جا۔ آخر ٹھہرا تو بے یقین لہو۔"

مہر چپ چاپ وہاں سے کھسک گیا۔

آنکھوں میں کتنی ہی تصویریں گھوم گئیں۔ مہندر کور، موراں بہن، اودھیش بھیا، امریندر...... خون کی سرخیوں میں میری آنکھیں کھوتی جارہی ہیں لوگو!

لاٹھی ہاتھوں میں کانپ گئی ــــــ

اور شاستری کہہ رہے تھے ــــــ "کل ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ آنکھیں گلوکوما کا شکار ہو گئی ہیں۔"

"بس تمہارا چہرہ معلوم ہوتا ہے۔ چشمہ لگائے ہوئے۔۔۔ چل پھر لیتا ہوں۔ ڈنڈے کے سہارے۔ کل گرتے گرتے بچ گیا۔۔۔"

"سب کچھ مسکراہٹ کے ساتھ، الگ الگ ٹکڑوں میں، سجے جملے بولتے ہیں. شاستری۔ دیکھنا ہے ہم میں پہلے کون رخصت ہوتا ہے"

بساط پر ہاتھ ٹھہر گئے ہیں۔ ہونٹوں پر دبی مسکراہٹ ابھر آئی ہے۔

"صدر راج کا نسخہ بے اثر ثابت ہوا۔ پولیس نے نقلی داڑھی اور مونچھوں والے سکھوں کو پکڑنا شروع کر دیا ہے۔ کون ذمے دار ہے وحشت کے اس ننگے رقص کا۔ اکالی پارٹی۔ دربارا سنگھ۔ یا حکومت؟ امرتسر کے گولڈن ٹیمپل میں اسلحے سے لیس لوگوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ بغاوت کی تربیت دی جارہی ہے۔ گرونانک نواس میں پولیس نے چھاپا مار دیا۔ روز نئی نئی سرخیاں۔ نئی نئی وحشتوں کا جنم۔ سموچا بھارت خطرے میں پڑ گیا ہے۔ میں ٹکڑے ٹکڑے ملک کو دیکھ رہا ہوں۔ یعنی "United States of India" کہہ کر ہلکی طنزیہ اداس ہنسی ہنسے شاستری۔۔۔

بساط پھر ٹھہر گئی ہے۔ برہان کانپتے ہونٹوں سے بڑبڑائے۔ "تم نے ایک بات ٹھیک کہی شاستری! دیکھنا ہے ہم میں پہلے کون مرے گا...... جو یہ بازی جیت جائے سب سے قسمت والا وہی ہے۔ شاید اگر ایسا موقع دیا جائے تو ہم تینوں ہی جلدی جلدی ہاتھ اٹھادیں گے......"

الجھنوں اور حادثوں سے الگ ایک تیز قہقہہ ماحول میں شاید پہلی بار گونجا اور اس کا خاتمہ ایک لمبی خاموشی پر ہوا۔۔۔

جگجیت بابا کو افسوس ہوا تھا اس دن جب معلوم ہوا کہ آئین ۲۵ جلادیا گیا ہے۔ مہر کے چہرے پر بھی موت کا سا سناٹا جھول رہا تھا۔ چہرے پر کتنے سوال تھے۔ جگجیت کچھ بولے نہیں۔ کمرے میں چلے آئے۔ گرنتھ صاحب پر حسرت سے نگاہ ڈالی۔ شاید وقت

نے یہ رسم بھی توڑ ڈالی۔ آنکھوں میں اودھیش بھیا رینگ گئے۔ پہلی بار بچوں کی نادانی نے جگجیت بابا کو رلا دیا۔ شاید آئین ۲۵ نہیں جلایا گیا بلکہ ہندو اور سکھ مذہب کے بیچ جو خلوص و محبت کی عمارت تعمیر ہوئی تھی، چند ناسمجھ بچوں نے پاگل ہو کر اس پر سنگ باری کر دی تھی۔

مہر...... مہر...... پکارنا چاہا۔ پر آواز باہر نہیں نکلی۔ اندر ہی اندر گھٹ گئی آواز......

وقت آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ اس دن مہر کہہ رہا تھا۔ "بڑا عجیب لگتا ہے۔ جیسے اپنے لوگوں کے بیچ اجنبی بنتا جا رہا ہوں۔"

ہر مندر الگ ہونے کے باوجود آتا رہا۔ وہی برق جولانی طبیعت لیے۔ وہ کیا منع کرتے۔ بچوں کے ایک سے رنگ، ہر مندر بھی نئے واقعات کی لپیٹ میں تھا۔ کہہ رہا تھا۔ "پتاجی! پنجاب کے واقعات نے ہمیں ہریجن بنا دیا ہے۔ شہر کا متوسط طبقہ ہمیں بیک ورڈ سمجھ کر ہنستا ہے۔ ہم پر پھبتیاں کستا ہے۔ سن سن کر دماغ کھولتا ہے پتاجی۔ لوگ کمینٹ کرتے ہیں۔ بھنڈراں والا لونگوال کے نام سے ہماری پگڑیوں اور مخصوص لباس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اب برداشت نہیں ہوتا......"

اور بساط بچھی ہے۔

برہان الدین کانپتے ہونٹوں سے کہہ رہے ہیں۔۔۔ "کل پاکستان سے خط آیا ہے۔ باصرہ مر گئی۔ باصرہ چلی گئی۔ بزم میں بس یہ بوڑھا بیٹھا ہے۔ اپنے چھوٹوں کی رخصتی کا تماشہ دیکھنے کے لیے۔ بچپن میں باصرہ کے ساتھ کتنی ہی شرارتیں کیا کرتا تھا۔ لے دے کر یہی بہن تھی۔ گھر بھر کی لاڈلی۔ سارے گھر میں ناچتی پھرتی۔ طوفان اٹھائے رہتی۔ تب کتنی رونق تھی گھر میں...... گھر کے ہر فرد کی چہیتی۔ جانے وہ کون سا غیر محفوظ جذبہ تھا جو سب کو پاکستان کھینچ کر لے گیا۔ باصرہ کا دولہا بھی وہیں باصرہ کو لے گیا۔ اب بتاؤ کون بچا ہے؟ لے دے کر یہ بوڑھا۔ جو عزیز اسے آخری آرام گاہ تک پہنچاتے وہی قبل از وقت رخصت ہو گئے"۔

آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہتے ہیں......

جگجیت بس آہستہ سے اتنا بول پاتے ہیں۔ "ہم وقت کی بربادیوں کے شکار ہو گئے ہیں برہان! جب بہت تھک جاتا ہوں تو لاہور میں لوٹ جاتا ہوں۔"

مہرے بساط پر پھیلتے جاتے ہیں۔

"پنجاب میں دنگائیوں اور دہشت پسند عناصر کے پھیلتے رجحان سے گھبرا کر حکومت نے وہاں ملیٹری رول قائم کر دیا۔ فوج اور گرنتھیوں میں زبردست جھڑپ۔ پولیس مندر میں داخل ہو گئی ہے۔ ہنگامہ پسندوں نے کئی جگہوں پر آگ لگادی۔"

"لونگوال اور بھنڈراں والا فرار......"

شاستری اخبار کی تازہ سرخیوں میں کھڑے دھندلی دھندلی آنکھوں سے بوڑھے چہروں کو تکے جارہے ہیں۔

"تم میرے بارے میں کیا سوچتے ہو؟" جگجیت کی آنکھوں میں شک ہے۔

برہان کے ہاتھ کانپ گئے ہیں...... جانے کن جذبوں کے تحت......

شاستری نے ڈنڈے پر اپنی گرفت سخت کر لی ہے...... گلوکوما کی شکار آنکھیں آواز کی جانب اٹھ گئی ہیں...... "تمہارے بارے میں...... مطلب کہ تمہاری قوم کے بارے میں......اچھا سوال کیا ہے جگجیت تم نے......شاید بہت ساری شک آلودہ نگاہوں سے گھبرا کر یہ سوال تم نے میری جانب اچھالا ہے...... کہ ایک دوست کی کیا رائے ہے۔ جبکہ اس کا جواب تم بھی بہتر دے سکتے ہو۔ اس لیے کہ جب پاکستان بنا۔ تم یہیں تھے۔ پولیس نے جب جب تفتیش کرنی چاہی ہے جواب مندر کی چھتوں سے برستی گولیوں سے ملا ہے۔ غنڈوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا...... کچھ لوگ اگر پاگل ہو جائیں تو ہم ساری برادری کو پاگل نہیں کہہ سکتے......"

ایک تسلی ملی تھی جگجیت کو چلتے وقت...... مہر کو سمجھائیں گے۔ ہر مندر کو بتائیں

گے۔ وقت کے ٹھہرے ہوئے پانی میں کچھ لوگ باقی ہیں جو اچھا سوچتے ہیں۔ تحریک کب نشہ آور نہیں ہوئی۔ ماحول کی یکسوئی دیکھ کر اس پر پتھر چلانے کا حربہ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ چہروں پر اور سوچنے والی ذہنیت پر غیروں کی مہر لگی ہے۔ لوگ سوچتے کب ہیں۔ خالصہ تو ایک فرض کا نام ہے۔ ملک کے لیے آتم بلیدان کا نام ہے، مگر کس نے سمجھا؟ پھر ۱۶۹۸ء کی خونی شروعات کے نام پر خونی تاریخ لکھنے کی بربریت کہاں تک صحیح و جائز ہے۔

بھٹک گئے جگجیت۔ اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ چل پھر نہیں سکتا۔ دنیا بھر کا مرض بلڈ پریشر۔۔۔ہائپر ٹینشن۔۔ہارٹ اٹیکٹیڈ۔ کون جانتا ہے کہ ان باتوں اور ہو رہے ہنگاموں کے درمیان کب آنکھیں بند ہو جائیں۔

گھر آئے تو اچانک خیالوں کے تانے بانے بکھر گئے...... مہر اپنی پتنی کے ساتھ فیصلہ کن انداز میں کھڑا تھا۔

"بابو جی! مجھے بھی جانا ہو گا۔"

اچانک وہ سن سے ہو گئے......

مہر نے نظریں نیچی کر لیں......بات آگے بڑھائی۔ "روز روز ہو رہی جھک جھک سے اب تنگ آ گیا ہوں۔ ہر مندر کی بات تو میں گلے سے نیچے اتار لیتا ہوں پر پتنی نہیں اتار پاتی۔ اب میرا بھی چھوٹا بیٹا ہے۔ ایک پوری فیملی ہے۔ سکھ باڑی میں آپ نے جو مکان کرائے پر اٹھایا تھا اسے میں نے خالی کروا لیا ہے......کچھ سامان بھجوا بھی دیا......"

ڈرتے ڈرتے ٹوٹے ٹوٹے لفظوں میں مہر کہہ رہا ہے......وہ جیسے اچانک بجلی کے ننگے تاروں کو چھو گئے......کیا بولیں......کیا کہیں......دل میں چبھے ایک نشتر کے بعد دوسرا چبھنے والا یہ نشتر کیسے برداشت کر سکتے ہیں......کیسے کہہ سکتے ہیں کہ بیٹا مت جاؤ......دل پر پہلے ہی ایک زبردست چوٹ لگ چکی ہے......مگر بیٹا......جو خود بنائے گئے حالات کی گرفت میں پھنس چکا ہے......کیا مان جائے گا......؟

پھر بھی ان تمام ممکنات کے باوجود اٹکتے جملوں میں تیز لمبی چلتی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے ایک نظر مہر کی پتنی کشلا اور بچے پر ڈالتے ہیں...... تم سب چلے جاؤ گے......؟ اندر آواز گونگی ہو گئی ہے۔" ہر مندر پہلے چلا گیا۔ اب تم بھی۔ اب تو میں بھی خالی خالی ہو گیا ہوں۔ سوچا بھی نہیں کہ اس بوڑھے کا کیا ہوگا؟ تم نے تو اس بوڑھے کو دو حصوں میں بانٹ دیا، مگر تم کیا جانو...... دو حصوں میں بانٹا جانے والا یہ بوڑھا اندر ہی اندر کتنے حصوں میں بٹ چکا ہے......"

گھر میں تنہائی ہے اور تنہائی کے شب و روز میں جگجیت سنگھ خلاء میں گھومنے والے بادلوں کے ہجوم میں کبھی کبھی پیدا ہوئی شکلوں میں ان لاشوں کو گھورا کرتے ہیں جو لاوارث سی دکھائی دیتی ہیں۔ پنجہ صاحب پڑھتے پڑھتے آنکھوں سے لہو جاری ہو جاتا ہے۔ بساط بہت دن ہوئے سونی ہو چکی ہے۔ کبھی دروازے پر بیل بجتی ہے تو دو چہرے دیکھنے میں آتے ہیں۔ خمیدہ کمر والا بوڑھا برہان الدین...... گلو کوما کی آنکھیں لیے شاستری...... شام کے وقت اکثر خاموش چہرے کے ساتھ نظر آتا ہے ہر مندر ...... مہر...... اس کے بچے......

بدلتے ہوئے وقت نے کتنے نشتر اندر چبھو دیئے۔ زمانے اور حالات نے پیٹھ میں کیسے کیسے خنجر اتارے۔ ہر مندر کی آنکھوں میں شعلے ہر نئے واقعات کے بعد کوندے۔ اور یہ بے حس بوڑھا اپنی گھریلو بے تعلقی کی بنا پر سنتا رہا۔

گولڈن ٹیمپل میں پولیس اور اکالیوں میں ہوئی جھڑپ۔ لگاتار چلتی گولیاں...... بھنڈراں والے کی موت...... لونگووال پولیس کی حراست میں...... سارا پنجاب جل رہا ہے، سلگ رہا ہے...... ہر مندر کی آنکھوں میں شعلوں کی لپک ہے...... ہر حادثے اور واقعے کے بعد ایک نیا تیور...... سکھ رجمنٹ سے کچھ فوجی بغاوت کر گئے......

دھک سے ہوگئے ہیں جگجیت ...... آرمی میں ایسی بات...... سر جھک گیا...... واقعات کیا کیا کروٹ لیں گے۔ کیسے کیسے زہر بھرے جام پلائیں گے، اب طاقت نہیں ہے گرنتھ بابا......

واقعات کی یورش نے ہرمندر کو بوکھلا دیا ہے۔ "پتاجی، اب سارے چہرے اجنبی لگتے ہیں۔ وہ چہرے جو آس پاس بستے تھے...... وہی چہرے ہمیں بھگوڑا کہتے ہیں۔ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ بسوں۔ گاڑیوں میں صرف ہمیں روک کر چیکنگ کی جاتی ہے، ہم یہاں خود کو غیر محفوظ سمجھ رہے ہیں......"

جگجیت بابا کو کھانسی اٹھی...... پھر کھانستے چلے گئے۔ کھانستے کھانستے بے دم ہوگئے...... آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ کیا کہتے...... کس نے اجنبی بنایا تم کو...... پھر کھانسی اٹھی...... سانس پھولنے لگی......شاید اب نہیں بچوں گا...... حالات نے اب کسی لائق نہیں چھوڑا...... آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا پھیلتا جارہا ہے...... چکر آرہے ہیں...... پیروں سے سارا خون غائب ہوچکا ہے...... ہرمندر جاچکا ہے۔ تھکے ہارے بستر پر گرگئے ہیں...... بغل میں بھیشم کھڑا ہے...... وہی پرانا نوکر...... بھیشم......

"بچوں اور دوستوں کو خبر کرو...... اب تھک گیا ہوں! بہت تھک گیا ہوں......"

آنکھوں کے حلقے گہرے ہوگئے ہیں......

سارے کے سارے واقعات پی کر آخری سانس لینے کی باری آگئی ہے اب۔ مہر خیریت پوچھنے آیا ہے...... ہرمندر بیوی بچوں سمیت آیا ہے۔ مسہری کے پاس برہان اور شاستری بھی کھڑے ہیں...... اداس پریشان...... آنکھوں میں وہی سوالات لیے ...... بوڑھے...... کیا سب سے قسمت والے تم ہی ہو...... بازی تم ہی جیت جاؤ گے......؟

اور یہ وقت ہے جو ہمیشہ آگے کی جانب رواں دواں ہے......

ہمیشہ آگے کی جانب رواں دواں ہے۔

OO

گلبن، احمد آباد، ۱۹۷۹ء

چوپال کا قصّہ

گاؤں جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ ابا نے اپنے گاؤں کا جو نقشہ ذہن میں تعمیر کیا تھا، وہ گاؤں لگ ہی نہیں رہا تھا۔ ابا نے کہا تھا اسٹیشن سے اترنے کے بعد تمہیں گاؤں کے لیے کوئی سواری نہیں ملے گی۔ دو میل کا سفر تمہیں پیدل ہی طے کرنا ہوگا۔ باغات کا ایک لمبا سلسلہ جہاں سے شروع ہوگا، وہاں کھاٹ بچھائے بہت سے لوگ بیٹھے ملیں گے ۔کچھ چلم گڑگڑاتے ہوئے اور کچھ کھینی ٹھوکتے ہوئے۔ تم جیسے ہی ادھر سے گزرو گے ساری نگاہیں بس تمہاری جانب اٹھ جائیں گی۔ پھر حیرت سے تمہارا جائزہ لیا جائے گا۔ بوڑھی نگاہیں تمہیں گاؤں کے ہی کسی عزیز یا رشتے دار کے طور پر پہچاننے کی کوشش کریں گی۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ تمہیں آواز دے کر تمہارے بارے میں پوچھیں بھی۔ پھر دیکھنا کتنی آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے۔ بوڑھے رام دین کاکا کا وہ باغ ہے۔ وہ بوڑھا اب پچھتر سے کم کا نہیں ہوگا۔ مگر اس عمر میں بھی وہ تمہیں وہاں چارپائی پر بیٹھا کر اندر سے گڑ اور چائے لانے ضرور جائے گا۔ یہ گاؤں کی پہلی رسم ہے۔ اجنبی اور برسوں بعد آئے شناسا چہرے کی خاطر داری کی یہ رسم گاؤں میں ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔ گاؤں میں آج بھی اپنوں کے لیے جو محبت ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ آگے بڑھنے پر دیکھنا۔ کھیلتے ہوئے بچے تمہیں دیکھ کر رک جائیں گے۔ پھر سب اپنے اپنے گھروں میں گھس کر اجنبی کے آنے کا قصہ بیان کریں گے۔ پھر ہر گھر کی چوکھٹ پر

مسکراہٹوں کا رنگ بکھر جائے گا۔ سب کے سب تمہارے پہناوے اور تمہارے چہرے کو بڑے غور سے دیکھا کریں گے۔ اور جب تم بتاؤ گے کہ تم ابرار چاچا کے گھر جارہے ہو تو یہ ٹولیاں بھی تمہارے ساتھ وہاں تک پہنچ جائیں گی۔

ابا کی آنکھیں اتنا کہتے کہتے گاؤں کے حسین جلووں میں گم ہو گئی تھیں۔ گزرے ہوئے کل میں کھوگئے تھے ابا۔ ''گاؤں میں میرا بچپن گزرا ہے۔ وہیں مسجد کے پاس تمہیں ایک اسکول ملے گا۔ درسی تعلیم وہیں ملی۔ پھر پڑھنے شہر بھیج دیا گیا۔ ابرار وہیں رہ گئے۔ ابرار کو پڑھنے سے زیادہ کھیتی باڑی کا شوق تھا۔ ابا مریٹھا باندھے، کندھے پر گمچھا رکھے دن بھر کولہو کے بیل کی طرح کھیت میں کام کرتے رہتے۔ ابرار بھی کبھی مٹی کھود رہا ہوتا۔ کبھی کیاری بنا رہا ہوتا۔ پھر دونوں مل کر گائے کو سانی کھلاتے۔ اماں جب تک زندہ رہیں، کھانا پہنچانے کھیت میں وہیں جاتیں۔ ستو کے بڑے بڑے لڈو ابا اور ابرار بڑے شوق سے کھاتے۔ پھر کنویں کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پی کر تازہ دم ہو جاتے۔ شام میں مٹی میں سنے دونوں باپ بیٹا گھر میں داخل ہوتے اور پاس کے کنویں پر نہانے چلے جاتے۔ اس وقت گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی ایسی کتنی ہی باتیں سننے میں آتیں کہ فاروق میاں! اشرف میاں کو بھی یہ سب سکھاؤ۔ ہر وقت کتابوں میں گم رہتا ہے۔ کتابیں بھلا کیا دیں گی۔ کتنا دبلا ہو گیا ہے۔ ابرار کے چوڑے چکلے سینے کو دیکھ کر ابا فخر سے کہتے...... جانے دو۔ ایک بیٹا تو کام سیکھ رہا ہے نا۔ دوسرے کو پڑھانا ہے۔ ذرا شہر کی ہوا بھی لگنی چاہیے۔''

اور اس کے بعد وہ شہر آگئے تھے۔ شہر آنے کے بعد گاؤں سے بالکل ہی کٹ گئے تھے۔ ہاں گاؤں کے قصے زندہ تھے۔ اکثر تنہائی میں ان قصوں کو یاد کر لیتے اور خوش ہو جاتے۔ اماں جلد ہی ساتھ چھوڑ گئیں۔ ابا سے اب کام بھی نہیں ہوتا تھا۔ پھر ابا نے کھیت پر جانا بھی بند کر دیا۔ شام میں چوپال لگتی تو وہیں لاٹھی ٹیکتے ہوئے پہنچ جاتے۔ اور مغموم رات گئے واپس لوٹ آتے۔ کہتے تھے اب دل نہیں لگتا ہے۔ تم تو شہر چلے گئے ابرار سے امید باقی ہے۔ وہی گاؤں کی پرانی روایت کو قائم رکھے گا۔ پھر ابا بھی ساتھ

چھوڑ گئے اور گاؤں سے برسوں پرانا رشتہ بھی ختم ہو گیا۔

ابا اتنا کہہ کر تھک جاتے۔ لمبی سانس کھینچ کر ہم سے مخاطب ہوتے۔ بیٹے! اب تم لوگ بڑے ہو رہے ہو۔ اپنا گاؤں ہے ـــــ پرکھوں کی یادگار۔ کبھی کبھی ہو آیا کرو۔ ہمیں گاؤں کے نام سے سخت الجھن ہوتی۔ مٹی کی سڑکیں، گو مٹھا سنی دیواریں۔ یہی تصور ذہن میں پیدا ہوتا۔ پھر وہاں ابرار چاچا کے علاوہ پہچاننے والا بھی کون تھا۔ ابرار چاچا سال میں ایک بار ضرور آتے۔ جتنا اناج پیدا ہوتا اس کا آدھا حصہ ایمانداری سے گھر پہنچا دیتے۔ پھر دوسرے ہی روز گاؤں کے لیے روانہ ہو جاتے۔ ابا لاکھ روکتے مگر ابرار چاچا گہری اداسی اوڑھ کر بس اتنا ہی کہہ پاتے۔ "نہیں بھیا۔ ریشم وہاں اکیلی ہو گی۔ شہر کی ہوا راس نہیں آتی۔"

ابرار چاچا جب بھی آتے اپنے مخصوص لباس میں آتے۔ بڑا سا گمچھا کندھے پر رکھے ہوئے۔ کبھی لنگی کبھی دھوتی میں۔ لمبی سی بنیان چوڑے چکلے سینے پر جھولتی رہتی۔ ہم چھیڑنے کی غرض سے پوچھتے۔ ابرار چا: آپ پینٹ شرٹ کیوں نہیں پہنتے۔ کتنی فٹ باڈی ہے آپ کی ـــــ بڑا اچھا لگے گا۔

ابرار چاچا مسکرا کر رہ جاتے۔ "بچپن میں نہیں پہنا تو اب کیا پہنوں گا۔ اب تو یہی اچھا لگتا ہے۔ آرام دہ بھی اور خوبصورت بھی۔ ہمارے ملنے ملانے والوں کو یقین ہی نہیں ہوتا کہ ابرار چاچا ابا کے اپنے بھائی ہیں۔ ابا جو گھر میں بھی اعلیٰ ترین سوٹ میں ڈٹے رہتے۔ ابرار چاچا کو ڈائننگ ٹیبل پر کھانا بھی پسند نہیں تھا۔ وہ اسے ایک اور الجھن قرار دیتے۔ وہ چٹائی بچھا لیتے اور اسی پر کھانا کھانا پسند کرتے۔ ان کا کہنا تھا کرسی پر کھانے سے کھانا پچتا ہی نہیں ہے۔ پتہ نہیں تم لوگ کیسے کھا لیتے ہو۔ ابرار چاچا کے آنے سے ہمیں ایک کھلونا ہاتھ لگ جاتا اور ہم انہیں گھیر کر مچل جاتے۔ کبھی کبھی ابرار چا کچھ سوچ کر اداس ہو جاتے۔ پھر گلوگیر آواز میں کہتے۔ بھیا کی طرح تم لوگوں نے بھی گاؤں کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ یہ بھی بھول گئے کہ تمہاری ایک چھوٹی سی بہن بھی ہے جو گاؤں میں رہتی ہے۔ بیچاری بن ماں کی لڑکی۔ تم لوگوں کو تو بہت یاد کرتی ہے۔ ہر وقت تم ہی

لوگوں کا ذکر اسکے ہونٹوں پر رہتا ہے۔ کہتی ہے کہ بھیا لوگ تو خوب کتابیں پڑھتے ہوں گے۔ میرے لیے بھی کتابیں لادو نا۔"

ابرار چاچا پھر چپ ہوگئے۔ ریشم کی پیدائش کے کچھ ہی دنوں بعد چچی ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ ابا ملنے گئے تھے۔ تسلی کیا دیتے۔ خود بھی گھنٹوں روتے رہے۔ آہستہ سے اتنا کہہ پائے۔ صبر کرو ابرار! شاید ہم دونوں بھائیوں کے بچوں کے نصیب میں ماں نہیں لکھی۔ پھر دونوں کو ساتھ لے کر آگئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ پانچ چھ روز تک گھر میں رہے۔ ابا نے دل بہلانے کی بہت کوشش کی۔ مگر ابرار چاہمیشہ یہی کہتے رہے، تم نہیں جانتے بھیا، اب گاؤں کتنا تاریک ہو گیا ہے۔ اب گاؤں میں دل نہیں لگتا۔ ریشم جلد ہی ہم لوگوں میں گھل مل گئی۔ دن بھر مچلتی رہتی۔ نئی نئی رنگین تصویروں والی کتابیں کھولے بے مطلب سوال پر سوال کئے رہتی۔ یہ سب بڑا اچھا لگتا۔ مگر لمحے ٹھہرتے کہاں ہیں۔ ابرار چاابا سے کہہ رہے تھے۔ گھر میں اب ایک منشی رکھ لیا ہے۔ گھر پر ریشم کی دیکھ ریکھ وہی کرتا ہے۔ میں تو کھیت نکل جاتا ہوں۔ تب تک منشی ہی اس کا دل بہلاتا ہے۔

"ارے ریشم کو یہاں چھوڑ دو۔ بچوں میں کتنی گھل مل گئی ہے۔"

"پھر تو میں اکیلا ہو جاؤں گا بھیا۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔" ابا نے سمجھایا۔ "مگر جب تم ہی ٹوٹ جاؤ گے تو ریشم کا کیا ہوگا؟"

پھر لمحہ فوراً اڑن چھو ہو گیا۔ واپسی کا دن آگیا۔ جب ابرار چار ریشم کو لے کر جانے والے تھے۔ اچانک ابا کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ ریشم بھی سب کے گلے مل کر خوب روئی۔ ریشم کے جانے کا بہت غم تھا۔ ہماری کوئی بہن ہی نہ تھی۔ اس لیے جانتے ہی نہ تھے کہ بہن سے گھر میں کیسی رونق رہتی ہے۔ پانچ چھ دن کے اندر ہی ریشم نے گھر میں ایک نئی زندگی لادی تھی۔ جاتے وقت ہم دونوں بھائیوں نے مل کر رنگین کتابوں کا ایک بنڈل ریشم کے ہاتھ میں دیا۔ "یہ وہی کتابیں ہیں جو تمہیں پسند تھیں۔ انہیں خوب دل لگا کر پڑھنا اور ہمیں یاد کرتی رہنا۔"

ریشم کی آنکھیں بھر آئیں۔ پھر سب رخصت ہو گئے۔ اور شہر کی بھیڑ بھاڑ میں ابرار چاچا اور ریشم دونوں ہی گم ہو گئے۔

ابا اکثر چوپال کا ذکر لے کر بیٹھ جاتے۔ گاؤں میں کیسے چوپال بیٹھتی ہے۔ تھکے ہارے لوگ کیسے پرانے پرانے قصے کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جاڑے میں الاؤ کے گرد قصے کہانیاں کہتے لوگ کتنے اچھے لگتے۔ گاؤں آج بھی سادگی اور معصومیت کی زندہ مثال ہے۔ شہر میں آئے دن ہوئے فسادات پر ابا تبصرہ کرتے۔ گاؤں میں یہ سب نہیں ہو سکتا۔ معصوم، بھولے بھالے لوگ کھیت کھلیان سے زیادہ کچھ جانتے بھی نہیں۔ کبھی کبھی اندر ایک خواہش پلتی۔ گاؤں دیکھنا چاہیے۔ کیسا ہوتا ہے چوپال۔ کیسے ہوتے ہیں گاؤں کے لوگ۔ وہاں کے انوکھے رسم ورواج۔ ننھی منی سی ریشم تو اب بہت شریر ہو گئی ہوگی۔ شہر میں بارہ تیرہ پہنچتے پہنچتے لڑکیاں ایک دم سے الہڑ بن جاتی ہیں۔ ریشم کے اندر بھی گاؤں کی شوخی آگئی ہوگی۔ ابرار چاچا جب بھی اناج پہنچانے آتے تو اکیلے ہی آتے۔ پوچھنے پر کہتے۔ ایک دن کے لیے ریشم کو کیا لاؤں گا۔ گاؤں میں اکیلے رہنے کی عادت بن گئی ہے۔ ابا سمجھاتے۔ لڑکی اب بڑی ہو رہی ہے اسے اکیلا نہ چھوڑا کرو۔ پھر ابرار چاچا کے آنے جانے کا یہ سلسلہ بھی ٹوٹنے لگا۔ اناج پہنچانے ان کا منشی آتا تھا۔ اسی سے خیریت مل جاتی تھی۔

اور پھر نہ جانے کتنے منظر بدلے۔ اور ان میں ایک سرخ رنگ کا منظر بھی تھا۔ بدن کانپ گیا۔ جسم میں ہلچل سی مچ گئی۔ ابا کے تبصرے بے جان محسوس ہونے لگے۔ گاؤں میں فرقہ وارانہ فساد، یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ مگر ابا بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ تو اب کچھ بھی سوچا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ ابا نہیں نہیں کہتے رہے۔ مگر آگ تو سلگ چکی تھی۔ گاؤں کے کنویں پر نہانے کی باری کو لے کر ایک ہندو ایک مسلمان لڑکے میں لڑائی ہو گئی۔ پھر کچھ اور لوگ جٹ گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ معمولی جھگڑا ایک بڑے فساد میں تبدیل ہو گیا۔

بدن میں لرزہ سا طاری ہو گیا۔ یاالٰہی خیر، آنکھوں میں ننھی منی ریشم سما گئی جو

بڑی بڑی آنکھوں کو مٹکاتی ہوئی رنگین تصویروں والی کتاب دیکھ رہی تھی۔ ابا رات میں دیر تک بڑبڑاتے رہے۔ اٹھتے اور پھر کمرے میں ٹہلنے لگتے۔ ابا کی یہ کیفیت دیکھ کر چھوٹا بھائی ارشد رہ رہ کر مچل جاتا تھا۔

"سو جایئے ابا۔ ایسے کب تک کام چلے گا"۔

ابا پھر پلنگ پر لیٹ گئے۔ آہستہ سے بولے۔ "تم نہیں جانتے۔ میرے سامنے میرا پورا گاؤں ہے"۔

آنکھوں سے آنسو کے قطرے چھلک گئے۔ بڑی آسانی سے پی گئے ابا۔ ابا نے وہ پرانا گاؤں دیکھا ہے جہاں کی فضا میں محبت کے گل بوٹے کھلے تھے۔ جہاں چوپال کے قصے سنتے سنتے بڑے ہوئے تھے ابا۔ پورا گاؤں جب ان آنکھوں میں ہو تو کھنڈر میں ہلچل تو مچے گی ہی۔ صبح اٹھے تو آنکھیں لال سرخ تھیں۔ تپائی کے ایک طرف ارشد سویا تھا۔ پہلی بار ابا کو دیکھا۔ صبح میں اٹھتے ہی سوٹ نہیں ڈاٹا بلکہ پرانے کپڑوں کی بھیڑ سے لنگی نکالی۔ اور لنگی اور گنجی پہن کر برآمدے میں نکل آئے۔ ہمیشہ کی طرف برش نہیں کیا بلکہ داتون والے سے داتون خریدا اور دیر تک برآمدے میں داتن کرتے رہے۔ آس پاس کی نگاہیں حیرت سے ابا کو گھور رہی تھیں۔ سب کچھ تبدیلیوں کے درمیان واضح تھا۔ ابا پھر سے کل میں ہی لوٹ جانا چاہتے تھے۔ ابا میں کل پھر سے زندہ ہو گیا ہے۔ سامنے کے مکان کے ایڈیشنل جج رام مورتی صاحب نے وہیں سے آواز لگائی۔ "بھائی اشرف صاحب، خیریت تو ہے۔"

ابا ٹھہرے۔ داتون ہاتھوں میں لرز گیا۔ "نہیں جج صاحب! بری خبر ہے۔ گاؤں میں فساد ہو گیا ہے۔ طبیعت سخت پریشان ہے۔"

"سب ٹھیک ہی ہو گا۔ گھبراتے کیوں ہیں آپ۔"

مگر ابا گھبرائے رہے۔ سارا دن۔ اور ہم گاؤں کے تمام گزرے ہوئے کل میں ابا کو داخل ہوتے دیکھتے رہے۔ پھر دوسرا دن آیا اور حواس پر اچانک بجلی گر پڑی۔ ننھی ریشم کا خط ہاتھوں میں مچل گیا۔ ابا دھاڑیں مار مار کر رو پڑے۔ گاؤں کا فساد تو تھم گیا۔ مگر ابرار

مارے گئے۔ منشی مارا گیا۔ کتنے گھر خاکستر ہو گئے۔ ابرار کا گھر بھی گر گیا۔

ننھی ریشم کے شکستہ سے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے۔

"چچا ابا۔ میں کہاں جاؤں۔ اب کیا کروں۔"

ابا صلح کرانے گئے تھے مگر واپس نہیں آئے۔ واپس آئی ان کی لاش......

منشی کاکا بھی اکیلے چھوڑ گئے۔ ابا کو کیا بچاتے خود بھی گولی کھا گئے......

میں نے ابا کو بہت جھنجھوڑا۔ مگر ابا کے جسم میں حرکت نہیں پیدا ہوئی۔ کچھ بولے نہیں۔ صرف سوئے رہے۔ گاؤں کے لوگوں نے انہیں سفید کپڑا پہنا دیا۔ اور قبرستان لے گئے۔ مجھے نہیں جانے دیا۔

گھر بھی گر گیا ہے چچا ابا۔ پتہ نہیں کون تھے۔ میں دبکی بیٹھی رہی۔ آگے والا پورا حصہ گر گیا۔ دروازے پر آگ لگا دی گئی۔ میں ڈر کے مارے الماری کے پیچھے چھپی سب تماشہ دیکھتی رہی۔ صرف ایک کوٹھری بچ گئی ہے۔

میں اسی کوٹھری میں ہوں۔ دل بہت گھبرا رہا ہے۔

سلیمان چاچا مجھے اپنے گھر لے جانے کے لیے آئے تھے۔ مگر میں نہیں گئی۔ مجھے معلوم ہے۔ مرنے والے کی روح چالیس دن تک گھر میں آیا کرتی ہے اور ابھی تو پانچ چھ ہی دن......

میں روز شام کو لالٹین جلا کر چراغاں کرتی ہوں۔ اس لیے کہ ابا اگر آئے اور مجھے نہیں دیکھا تو پتہ نہیں کتنے پریشان ہوں گے......"

"تم نے خط پڑھا۔"

ابا کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا تھا۔ ہمارے ضبط بھی جواب دے گئے تھے۔ ابا نے اپنے ہونٹ بھینچے۔ "پتہ نہیں ریشم کیسی ہو گی۔ کس حالت میں ہو گی۔ اسی دن کے واسطے کہتا تھا۔ بیٹا گاؤں گھوم لو۔ ایک ہی بار مگر چلے جاؤ۔ ہو آؤ......"

پھر اچانک ابا کو چکر آ گیا۔ کب تک ضبط کرتے۔ باندھ ٹوٹ گیا اور اچانک ابا دھڑام سے فرش پر چت ہو گئے۔ کچھ دیر بعد جب ہوش آیا تو پلکیں جھپکاتے ہوئے نیم

غنودگی کی حالت میں دیواروں کو گھورتے رہے۔ ارشد روتے روتے سو گیا تھا۔ میں صرف اتنا کہہ سکا۔ ''ابا دیر تو ہو گئی ہے مگر میں جارہا ہوں ریشم کو لانے کے لیے۔''

گاؤں کی ساری کہانیاں زندہ ہیں۔ مگر یہ گاؤں ابا کا گاؤں نہیں لگ رہا ہے۔ ٹھنڈک بڑھ گئی ہے۔ شام کی ہلکی ہلکی پرچھائیوں نے گاؤں کو ڈھک لیا ہے۔ یہاں سے پیدل چلنا ہے۔ آگے کچھ دور جاکر ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی۔ کھاٹ پر ایک بوڑھا چھتری سی کمبل لیے اکڑوں بیٹھا ہے۔ یہی رام دین کاکا ہیں۔ آہستہ سے بوڑھے کی نگاہیں اٹھیں پھر جھک گئیں۔ ابا نے کہا تھا جیسے ہی اس جگہ سے گزرو گے، کھاٹ بچھائے بہت سے لوگ ملیں گے۔ پھر رام دین کاکا اندر جاکر گڑ اور پانی لاکر تم کو بڑی محبت سے پیش کریں گے۔ ساری رسم ٹوٹ گئی شاید۔ ابا کی بات ایک ایک کرکے غلط ثابت ہو رہی تھی۔ سب کچھ بدل گیا ہے۔ حادثوں نے گاؤں کا پورا ڈھانچہ ہی بدل دیا ہے۔

مسجد کے پاس کچھ روشنی تھی۔ کچھ لوگ بھی کھڑے تھے۔ آنکھوں میں گہری ویرانی۔ کچھ تجسس بھری نگاہیں اٹھیں۔ پھر جھک گئیں۔ ایک طرف پولیس چوکی بیٹھی تھی۔

ایک شخص نے حیرت سے پوچھا۔ ''کس سے ملنے آئے ہو بھائی۔''

''ابرار چاچا کا یہاں مکان تھا۔''

''آگے ہے۔'' جواب میں ٹھنڈک گھل گئی تھی۔ وہ جو ریت کا ٹیلہ دکھائی دے رہا ہے......وہی ہے۔''

''تم کون ہو ابرار کے۔'' دوسری نگاہ نے تعاقب کیا۔

''بھتیجا ہوں۔''

''پہلی بار گاؤں آئے ہو۔''

''وقت نے محبت کی رسم توڑ ڈالی۔ آج تک ایسا نہیں ہوا۔''

ایک بوڑھے نے لاٹھی پر اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کی۔ ''تم اشرف کے لڑکے ہو۔ بیٹا، وقت کے ساتھ سب کچھ بدل گیا۔ ابرار جیسا محبتی انسان صلح کرانے کے جرم

میں مارا گیا۔ اور بات بھی کیا بیٹا۔ ایک ہی وطن کے دو سپوت۔ ایک ہندو دوسرا مسلمان۔ نہانے کی باری کو لے کر جھگڑ گئے بس اتنی سی بات پر سب نے اپنے ہوش کھو دیئے ......اور دیکھتے ہی دیکھتے ایسا فساد برپا ہوا کہ ......"

بوڑھے نے اشارہ سے دکھایا۔ "جہاں جہاں ویرانی کے منظر دیکھ رہے ہو سب اسی منحوس دن کی یادگار ہیں۔ ہم سب شرمندہ ہیں۔ اب کسی سے نظر ملانے کی تاب نہیں۔"

ابرار چاچا کی یادیں ایک بار پھر سلگ گئیں۔ ہونٹ کانپ گئے۔ گلا بھر آیا۔ خود کو دابتے ہوئے پوچھا۔ "بابا کبھی یہاں چوپال لگتی تھی۔"

"اب وہاں پولیس چوکی ہے۔ وہ دیکھو۔"

بوڑھا ہنسا۔ اب تمام پرانے قصے اس زندہ اور تازہ زخم سے دھل گئے۔ اب صرف یہ دکھ بھری کہانی بچ گئی ہے۔ آنے والی پیڑھیاں اسی کہانی کو لے کر چوپال میں بیٹھا کریں گی۔"

بوڑھے نے لاٹھی اٹھائی اور پھر ٹیکتا ہوا دور نکل گیا۔ چند لمحوں تک وہیں کھڑا آس پاس کا جائزہ لیتا رہا۔ گاؤں کتنا اداس اور ویران نظر آرہا تھا۔ باغات کے لمبے سلسلے نے خوف کی چادر دور تک تان دی ہے۔ سامنے ہی ریت کا ٹیلہ تھا۔ ابرار چاچا کا مکان۔ بھر بھرائے ہوئے، کچھ جلے ہوئے نقوش۔ قدم تھم گئے۔ آہستہ سے آواز لگائی۔ "ریشم۔"

مگر ایک لمبی چپی طاری رہی۔

گرے ہوئے مکان سے اندر جانے کا راستہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اور پھر رات کا وقت۔ کدھر سے جاؤں۔ ریشم کے خط کے مطابق ایک کوٹھری بچ گئی ہے۔

"ریشم۔" ...... آواز پھر لگاتا ہوں۔ صدا باز گشت کے بعد لوٹ آتی ہے۔ ایک راستہ ملا ہے۔ اینٹوں کے درمیان سے ایک کواڑ جیسی چیز نظر آئی ہے۔ اینٹوں پر پیر رکھتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوں۔ اور اچانک نگاہ جم جاتی ہے۔ کنارے ایک لالٹین جل رہی ہے جس کی بتی ہلکے ہلکے کانپ رہی ہے۔ پلنگ پر ایک لڑکی گہری نیند سوئی ہوئی ہے۔"

ریشم...... آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتا ہوں۔ گرم گرم جلتی پیشانی۔

اندر سے گھٹی ہوئی آواز نکلی۔" تو اس ویران گھر میں اکیلے جی رہی ہے پگلی ــــــ جس کے دو دو بھائی ہوں...... تجھے ڈر نہیں لگتا میری بہن...... پیاری بہن اٹھ جا۔"

پھر ریشم نے آنکھیں کھول دیں۔ غور سے دیکھا اور ایک لمبی سسکی چھوڑتی ہوئی گلے لگ گئی...... "بھیا" ریشم بانہوں میں جھول گئی۔ "......ڈر لگتا ہے بھیا۔"

"میں تمہیں لینے آیا ہوں ریشم۔"

"مگر میں کیسے جاؤں گی۔ چالیس دن تک......"

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ابرار چچا تجھے یہاں نہیں دیکھیں گے تو کیا وہ سمجھ نہیں لیں گے کہ تو میرے یہاں ہے۔" ریشم کو جیسے تسلی مل گئی۔ اندھیرے کمرے میں لالٹین کی روشنی ہلکے ہلکے کانپتی رہی۔

صبح کے وقت ہم دونوں ابرار چاچا کے مزار پر گئے۔ وہاں فاتحہ پڑھی۔ میری آنکھیں بھی آنسوؤں کو روک پانے میں ناکام رہی تھیں۔ وہاں سے واپسی پر ریشم نے ایک بڑا عجب سا سوال پوچھا۔

"بھیا ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ گاؤں میں جن لوگوں نے آگ لگائی وہ کون تھے؟"

یہاں چوپال میں ایک قصہ بہت مشہور ہے کہ گاؤں میں جب ڈاکو آئے تھے تو بغیر ہتھیار کے رام دین کاکا نے ڈاکوؤں کو اپنی بہادری سے بھگا دیا تھا۔ رام دین کاکا کے ساتھ کل دس آدمی تھے۔ ڈاکوؤں نے سمجھا کہ پوری فوج ہوگی اور ہتھیاروں سے لیس ہوں گے۔ ڈاکو بغیر چڑھائی کیے واپس لوٹ گئے۔

"یہ لوگ بھی کیا ڈاکو تھے بھیا؟"

"اگر ہاں تو پھر رام دین کاکا جیسے لوگ کیوں سوئے پڑے تھے؟"

ان دونوں سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

○○

زبان وادب (پٹنہ)۔ ۱۹۸۲ء

آئندہ (پاکستان)

حالات معمول پر ہیں

اُٹھتے اُٹھتے میں نے پھر کہا "دیکھئے، میں بار بار آپ کو زحمت دے رہا ہوں، دراصل میں بہت پریشان ہوں۔ میرا سارا گھر پریشان ہے۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اب کہاں جاؤں اور کس سے پوچھوں؟ بس لے دے کر آپ ہی لوگوں کا سہارا ہے۔ آپ کے علم میں ساری چیزیں رہتی ہوں گی۔ بتایئے نا، وہاں کے حالات اب کیسے ہیں؟ ٹھیک ٹھاک تو ہیں نا؟"

اور انسپکٹر نے پھر بے زاری کے عالم میں اپنی گھڑی دیکھی۔ "آپ اس سے پہلے بھی آئے تھے اور میں نے اس وقت بھی یہی جواب دیا تھا کہ جو آپ کو معلوم ہے وہی مجھے معلوم ہے۔ آپ بھی اخبار پڑھتے ہیں، میں بھی۔ ریڈیو آپ بھی سنتے ہیں، میں بھی۔ اور ان میں یہی کہا جاتا ہے کہ حالات معمول پر ہیں، سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔"

یہ انسپکٹر کا آخری جملہ تھا۔ اس کے بعد وہ فائلوں میں گم ہو گیا، جس کا صاف مطلب تھا...... گفتگو ختم!

میں تھکے ہارے قدموں سے دوبارہ اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اگر میں یہاں آکر نہ بسا ہوتا تو گھبراہٹ اور پریشانی کی کوئی بات نہ ہوتی۔ ابی حضور کا کتنا بڑا بزنس تھا۔ مگر اس بزنس کو لات مار کر میں نے سرکاری نوکری کرنے کو ہی بہتر سمجھا اور اپنے گھر سے سینکڑوں میل دور یہاں آبسا، جہاں سب کے سب اجنبی چہرے تھے۔ پہلے تو سب

کچھ بہت عجیب سالگا۔ پھر ہم ایک دوسرے میں گھلنے ملنے لگے۔ جب بچے ہوئے اور محلے والوں سے اچھی خاصی شناسائی ہو گئی تو دھیرے دھیرے ہم بھی اس جگہ کے عادی ہو گئے۔ چھٹی کے موقع پر جب میں اپنے بیوی بچوں کو لے کر اپنے گھر جاتا تو بچے داداجی کے گھر سے واپسی پر بہت افسردہ نظر آتے۔ دو چار روز بعد ہی وہ ضد کرنے لگتے۔ "پاپا! داداجی کے یہاں چلئے نا۔ اپنا کرائے کا مکان ذرا بھی اچھا نہیں۔ وہاں کتنا بڑا مکان ہے۔ ٹی وی ہے، فریج ہے، فون ہے۔ اپنے یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں کیسے انہیں سمجھاتا کہ تمہارا باپ بڑا خوددار آدمی ہے۔ اس نے دادا سے کچھ بھی نہیں لیا، تعلیم و تربیت اور روشن ذہنیت کے سوا۔ دادا تو کپڑے کے بہت بڑے تاجر ہیں اور تمہارا باپ ایک معمولی نوکر پیشہ آدمی۔ بات بات میں فرق ہوتا ہے۔

بچے شور مچاتے "پاپا! ایک فون لگوا لیجئے نا۔ داداجی کو فون کریں گے۔"

پچھلی چھٹی کے موقع پر ابا حضور نے جھجکتے جھجکتے کہا بھی تھا "بیٹے، اگر کچھ کمی ہو تو......اگر گھر بنانے کے بارے میں سوچ رہے ہو تو......"

"نہیں ابی حضور۔ میں بہت خوش ہوں۔" میں نے فوراً ان سے کہا تھا۔ اور ابا حضور ہمیشہ کی طرح خاموش ہو گئے تھے۔ میرے بچپن کی دھندلی دھندلی تصویریں ان کی آنکھوں میں رینگ گئی تھیں اور وہ مسکراتے ہوئے بولے تھے...... "تو ہمیشہ سے بڑا خوددار رہا ہے۔ مگر پگلے، میں تو تیرا باپ ہوں، کوئی غیر تو نہیں۔"

ابا حضور کا اب دنیا میں تھا ہی کون۔ جب دل گھبراتا تو بریف کیس تھامتے اور میرے گھر پہنچ جاتے۔ لونی لگی دیواروں اور بستر پر بچھی ہوئی معمولی سی چادروں پر ان کی نگاہیں دیر تک پھیلتی رہتیں۔ پھر بہو اور بچوں کے پہناوے کو حسرت سے دیکھتے اور روندھے ہوئے لہجے میں کہنے لگتے۔ "جس گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہو، اس گھر میں"......ان کا گلا بھرّا جاتا اور وہ بات پوری کئے بغیر ہی چپ ہو جاتے۔ ایسے موقع پر میں بھی صرف اپنا سر جھکا لیتا۔ کیسے کہتا کہ ابی حضور، بس اسی حال میں خوش ہوں اور اسی پر قناعت کرتا ہوں۔ کس بات کی کمی ہے مجھے؟

پچھلی بار بھی جب ہم سب ابّا کے گھر سے لوٹے تھے تو شیلو ہر طرف ناچتا پھرا تھا۔ اس نے اپنے تمام دوستوں کو گھر بلایا۔ انہیں دادا حضور کی دی ہوئی مہنگی مہنگی چیزیں دکھائیں۔ نئے نئے کھلونے، اڑنے والا ہوائی جہاز، ایک کمرے جتنی لمبی ریل گاڑی جو چھوٹی سی بیٹری سے چھک چھک کر کے دوڑتی۔ پھر دوستوں کو دادا کے عالیشان گھر اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کے قصّے خوب مزے لے لے کر سنائے گئے۔ اس بار شیلو ان کا فون نمبر بھی لے آیا تھا۔ ابّا حضور کے یہاں کئی فون تھے۔ ایک فون امّی کے کمرے میں بھی تھا۔ امّی جب تک زندہ رہیں، گھر کی ساری چہل پہل کا مرکز ان ہی کا کمرہ تھا۔ شہر کے ہر چھوٹے بڑے گھرانے کی عورتوں میں امّی بے حد مقبول تھیں۔ سب پر جان چھڑکتیں۔ خوب خوب فون ہوتے۔ ایک دن بھی اگر کوئی نہ آتا تو فوراً ڈائل گھما کر خیریت دریافت کی جاتی۔ "کیوں بھئی، کیا بات ہے۔ کیوں نہیں آئیں آج؟" ان دنوں میں چھوٹا سا تھا۔ گھر بھر کا چہیتا۔ ساری محبت جیسے صرف میرے حصّے میں سمٹ آئی تھی۔ مگر امّی نے ایک دن اچانک اس دنیا سے آنکھیں موند لیں۔ ابّا اس صدمے سے نڈھال ہوگئے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند ابّا کے ہاتھوں سے تسبیح چھوٹ گئی۔ انہوں نے امّی کے فون کو ہاروں سے سجادیا اور دروازے کے باہر تالا لگادیا۔ ساری رونقیں سناٹے میں تبدیل ہوگئیں۔ جب بہت پریشان ہوجاتے تو تالا کھولتے اور دروازے کو اندر سے بند کر کے کئی کئی گھنٹے کمرے میں بے سدھ پڑے رہتے۔ جب باہر نکلتے تو آنکھیں سرخ ہو رہی ہوتیں۔

وقت کے ساتھ ابّا حضور کے چہرے پر لمبی ڈارھی جھول گئی۔ مسکراہٹ غائب ہوگئی، آنکھوں پر چشمہ چڑھ گیا۔ چہکنے اور بولنے والے ہونٹ خاموش ہوگئے۔ اور اس دن جب ڈرتے ڈرتے میں نے اپنی نوکری کے بارے میں ابّا کو یہ خبر سنائی تو وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ چند لمحوں تک دیواروں کو گھورتے رہے، پھر بولے۔ "تو تم اتنی دور چلے جاؤ گے؟ سینکڑوں میل دور۔ مجھے بتائے بغیر ہی اتنی بڑی مہم سر کرلی۔ مگر بیٹے، تم اس بوڑھے بد قسمت باپ کو اکیلا چھوڑ کر اتنی دور نوکری کرنے کیوں جارہے ہو؟ تم تو

کچھ کیے بغیر بھی ساری زندگی مزے میں کاٹ سکتے تھے۔"

یہیں ابی حضور دھوکا کھا گئے۔ ابّا حضور کے آخری جملے نے میری انا لوٹا دی اور میں ان کے جذباتی سیلاب سے باہر نکل آیا۔

"بس اسی لیے ابّا کہ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ہی نے تو مجھے خوداعتمادی کی تعلیم دی ہے۔ میں بھی اپنے بوتے پر کچھ کر دکھانا چاہتا ہوں۔ یہ میرے لیے ایک چھوٹا سا، مگر سخت امتحان ہے کہ میں اس دنیا میں کچھ کرنے کے لائق ہوں بھی یا نہیں۔"

"تمہیں اجازت ہے۔" سنجیدگی سے بھرا ہوا جواب تھا ابّا حضور کا۔ "تمہیں بچپن سے دیکھ اور سمجھ رہا ہوں۔ جانتا ہوں کہ تم ان امیروں کے چھوکروں سے الگ ہو جو اپنے نام کے ساتھ اپنے باپ کا نام لگاتے ہیں۔"

دیر تک ابّا حضور مجھ پر دعاؤں کی بارش کرتے رہے۔ پھر وہ وقت بھی آگیا جب آنکھوں میں آنسو بھر کر انہوں نے مجھے ٹرین کے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں سوار کرایا اور یکبارگی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ ٹرین آگے بھاگتی رہی اور آگے پیچھے دوڑتے مناظر کی بھیڑ میں ابی حضور کا زرد چہرہ میری نگاہوں میں گھومتا رہا۔

وقت کا سبک رفتار پرندہ اڑتا رہا۔ شیلو اس دن شام کو اسکول سے دیر سے گھر لوٹا تھا۔ خوب چہک رہا تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دوست کے گھر سے اس نے دادا جی کو فون کیا تھا۔ پھر اس نے اپنی فرمائش دہرائی "پاپا، آپ بھی فون لگوا لیجئے۔ میں نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ چپ ہو گیا مگر آج گھر میں فون کی کمی خود مجھے کھل رہی تھی۔ رات ہی کو یہ دل دہلا دینے والی خبر سنی تھی اور صبح کے اخبار نے جیسے جسم سے سارا خون چوس لیا تھا۔ ابّا کے شہر میں فساد ہو گیا تھا۔ اچانک جیسے ہزاروں گولیاں میرے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ چہرہ فق ہو گیا۔ زیبا نے دیکھا تو دوڑی دوڑی آئی۔ پوچھنے لگی "کیا بات ہے" پھر اخبار کی سرخیوں کو دیکھ کر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ابّا حضور کی شفقت اور بے پناہ محبت نے اسے بلک بلک کر رونے پر مجبور کر دیا۔ رونے کی آواز سن کر شیلو اور سیما بھی بھاگے بھاگے آئے۔ پھر سب نے مل کر رونا شروع کر دیا۔

"کیا ہوا ممی؟ کیوں روتی ہیں آپ؟ پاپا کیوں چپ ہیں؟"

شیلو بڑا تھا۔ اس نے اخبار کی سرخی پڑھ لی اور اس کے بعد وہ بھی میرے بازوؤں میں مچل گیا۔ "پاپا! دادا کے یہاں چلئے۔ دل گھبرا رہا ہے پاپا۔ دادا کو فون کیجئے نا۔ ہم دادا کے یہاں چلیں گے۔"

"اچھا بیٹے، چلیں گے۔ مگر ابھی تو وہاں کرفیو لگا ہے"۔ پھر میں نے دل کو تھامتے ہوئے زیبا سے کہا "میں ابھی فون پر خیریت معلوم کر کے آتا ہوں۔"

راستے میں اخبار کی سطریں لپک لپک کر مجھے دہشت زدہ کرتی رہیں۔ شہر میں ہونے والا یہ سب سے بڑا فساد ہے۔ ہزاروں گھر جلا دیئے گئے۔ جلے ہوئے گھروں سے ہزاروں لاشیں بر آمد ہوئیں۔ ٹیلی فون ایکسچنج پہنچ کر بھی مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ گھر آیا تو قدم بوجھل تھے۔ زیبا سے لرزتی آواز میں کہا۔ "وہاں کی لائن نہیں مل رہی ہے۔ ضرور صورت حال نازک ہے۔ کوئی خبر ہی نہیں آ رہی ہے۔"

"اب کیا ہوگا؟" زیبا سہم گئی۔

"بہت تھک گیا ہوں۔ ایک کپ چائے بنا سکتی ہو؟" میں نے کہا اور پلنگ پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

چار روز اسی طرح گزر گئے۔ فساد کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حالات کیسا موڑ لیں گے۔ کبھی گھبرا کر پولیس اسٹیشن یوں ہی بے مقصد تحقیق کرنے چلا جاتا۔ کبھی ٹیلی فون ایکسچنج۔ کلرک آہستہ سے سر اٹھا کر کہتا۔ "کنکشن بند ہے۔ کچھ پتہ نہیں۔"

زیبا آنسو بہاتی رہتی۔ بچے ہر وقت دادا دادا کہہ کر روتے رہے۔

مجھے خود پر ندامت سی ہوتی، مگر کر ہی کیا سکتا تھا؟

کچھ دن اور گزر گئے۔ پھر ایک دن یہ خبر سنی کہ حالات معمول پر ہیں۔ کرفیو اٹھا لیا گیا ہے۔ دکانیں کھل گئی ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔

خبر سن کر تسلی ہوئی۔ بچے چہک اٹھے۔ "دادا کے یہاں چلیں گے۔"

"ضرور چلیں گے۔ مگر پہلے میں ان سے فون پر بات تو کر آؤں۔" میں نے کہا مگر ٹیلی فون ایکسچینج سے واپسی پر مجھے دیکھتے ہی شیلو نے رونی صورت بنالی۔ "پاپا فون نہیں لگ سکا؟"

"ہاں بیٹے۔ جانے کیا بات ہے، شاید اس ہنگامے کے دوران میں وہاں کی لائن کاٹ دی گئی ہو۔اور کیابات ہو سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"کسی طرح تو معلوم کرو۔ جانے کیوں دل ڈرا جارہا ہے۔" زیبا بولی۔

"میں آج رات کی گاڑی سے جارہا ہوں۔ ٹکٹ کا انتظام ہو گیا ہے۔"

اور پھر ایک لمبی، اندیشوں بھری اداسی چھا گئی۔

کیا یہ وہی اسٹیشن ہے؟

میں اچانک چونک سا گیا ہوں۔ ویران سی فضا۔ اجڑا اجڑا سا پلیٹ فارم، نہ شوروغل نہ ہنگامہ۔ کون چرا لے گیا یہاں کے ہنگاموں کو۔ کون ان مسکراتے چہروں پر ویرانی اگا گیا ہے؟ نہ ٹیکسی والوں کی وہ پکار ہے۔ سب کی آنکھوں میں لاشیں سمائی ہوئی ہیں۔ اپنوں کی لاشیں پرایوں کی لاشیں۔ افسردہ افسردہ سے چہرے۔ سڑک پر پھیلتی ہوئی ماتمی دھن۔ ایک اسرار چپ۔

دل دھک سے رہ گیا۔ انجان اور بے زبان اندیشے سر اٹھانے لگے۔ ایک آٹو رکشا میں بیٹھ گیا۔ یہاں کے شوروغل میں اپنا سارا بچپن گزارا تھا۔ مگر اب کہوں تو کون یقین کرے گا؟ کیسا شور، کیسا غل؟ آٹو رکشا والے کو کچھ بتائے بغیر ہی میں بیٹھ گیا۔ سوچا، اشاروں سے اس کی رہ نمائی کرتا جاؤں گا۔ جب گھر آجائے گا تو وہ ہکا بکا رہ جائے گا کہ اتنے بڑے تاجر باپ کا بیٹا ایسے معمولی لباس میں۔ پھر ابّا سے کہوں گا ابّا، بس اب بھی میرے ساتھ ہو لیجئے۔ بچے آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ابّا کتنے خوش ہوں گے۔ پھر ڈھیر سارے سوالات؟ کیسے آگیا تو؟ یہ کیا شکل بنالی ہے؟ داڑھی کیوں بڑھی ہے؟

لباس گندا کیوں ہو رہا ہے؟ جس کا باپ اتنا بڑا......"

مگر پھر ایک بے زبان وسوسہ۔ لبّا نے فون کیوں نہیں کیا؟ اور یہ سڑک کتنی اجاڑ لگ رہی ہے۔

اچانک میں نے آٹو رکشا والے سے پوچھا۔ "بھئی، یہاں ایک کپڑے کا بڑا شوروم تھا......"

"جل گیا۔" عجیب گرمی تھی آواز میں۔

"اور یہ برابر کی دکانیں؟"

"لوٹ لی گئیں۔"

"اور یہ حاتم بھائی کا خوب صورت شوروم، جس کے آگے شام کے وقت خوانچے والے اپنے خوانچے لگاتے تھے؟"

"پرانی کہانی ہے۔" آٹو رکشا والے کی ٹھنڈی آواز سرسرائی۔ "کیوں پوچھتے ہو بابا؟ یہ شہر وہ نہیں ہے۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ پرانے لوگ، پرانی دکانیں، پرانا شہر، سب کچھ۔"

آواز اب میرے حلق سے باہر نہیں آرہی ہے۔ اپنے ہی سوالوں نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا بڑھتا جارہا ہے......اور اب میں اپنے آخری سوال کی زد میں ہوں۔

روانگی سے ایک دن پہلے انسپکٹر سے ایک بار پھر ملنے کا اتفاق ہوا تھا اور میں نے اس سے پھر کہا تھا۔ "انسپکٹر صاحب، اب حالات کیسے ہیں؟ معاف کیجئے گا، آپ کو بار بار زحمت دے رہا ہوں۔ مگر آپ بتایئے، آپ سے نہ پوچھوں تو پھر کہاں جاؤں؟ پریشان ہوں۔ وہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

اور انسپکٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "حالات معمول پر ہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔"

یکایک میرے اندر دھماکا سا ہوا۔ سارے جسم میں لرزہ طاری ہو گیا۔ اب اور کس

سے پوچھوں؟ یہی کہ کبھی یہاں مشتاق بھائی کپڑے والا کا ایک عالیشان محل ہوا کرتا تھا۔ مگر اب تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف ریت کے ٹیلے کا منظر۔ کیا میں اسی گھر کے لیے آیا ہوں۔ ابا حضور اس ریت کے ٹیلے کے مقبرے میں واقعی ہمیشہ کے لیے سو گئے؟

اشک بار آنکھوں سے میں ریت کے ٹیلے کو تک رہا ہوں اور انسپکٹر کے الفاظ کانوں میں گونج رہے ہیں؟ "سب کچھ معمول پر ہے، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔"

○○

شمع۔ ۱۹۸۰ء

بھیڑیے

اُسے کسی حادثے سے تعبیر کروں، یہ میرے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ معصوم فرشتوں کے حصے میں بھی موت لکھی ہے، یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بعض زخم اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ جتنا بھی بہلانے کی کوشش کروں اور پھیلتے جاتے ہیں۔ گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ میں اب بھی اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ سارے گھر میں ناچتی پھر رہی ہے۔ باہر دروازے پر کھڑی، دونوں ہاتھ کمر پر رکھے، شان سے آتے جاتے راہگیر وں کا جائزہ لے رہی ہے، اس کے گھر کے سامنے ایک مسجد ہے اور مسجد میں اکثر وہ پاگل دکھائی دے جاتا ہے۔ جسے چاکلیٹ بٹی، بڑے پیار سے دیکھا کرتی ہے۔ بچوں کے شور و غل اور ہنگامے سے بے نیاز پاگل دوڑتا ہوا، فٹافٹ جھٹا جھٹ، کی عجیب سی صدا بلند کرتا ہوا چاکلیٹ بٹی کے قریب آکر ٹھہر جاتا ہے۔ پھر دونوں بند ہاتھوں کو کھول دیتا ہے۔ اور اس کے بند ہاتھوں پر جگمگا اٹھتا ہے —— ایک چاکلیٹ۔ چاکلیٹ بٹی مسکراتی آنکھوں سے پاگل کو دیکھتی ہے۔ چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھل جاتا ہے۔ اور آگے بڑھ کر وہ چاکلیٹ اٹھا لیتی ہے۔

پاگل دعائیں دیتا ہوا بچوں کے شور و غل کے ساتھ آگے بڑھ جاتا ہے۔

دیکھنے کا ایک لمبا سلسلہ قائم ہے۔ پاس ہی میری کپڑے کی دوکان ہے۔ وہاں بیٹھا بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہتا ہوں۔ اور خوش ہوتا رہتا ہوں۔ کبھی کبھی جب وہ اکیلی ہوتی ہے

تو شدید طریقے سے یہ خواہش ہوتی ہے کہ پھول جیسی پیاری پیاری سی اس جاپانی گڑیا کو آگے بڑھ کر گود میں اٹھالوں۔ ڈھیروں پیار کروں اور پوچھوں۔ "تم کس کا انتظار کر رہی ہو چاکلیٹ؟"

اس کے ننھے ننھے لب تھرتھرائیں گے تو کتنا اچھا لگے گا۔

شام کے وقت اکثر دیکھتا ہوں۔ چاکلیٹ دروازے پر کھڑی ہے۔ پھر آفس سے تھکے ہارے اس کے پاپا آکر دروازے پر ٹھہر گئے ہیں۔ چاکلیٹ کی طرف دیکھ کر دونوں ہاتھ کمر پر رکھے شوخی سے مسکراتے ہیں۔ "سوری بیٹی۔ چاکلیٹ تو میں بھول گیا۔"

"پھر پرمیشن نہیں ملے گا اندر جانے کا۔" چاکلیٹ کی معصومیت پر وہ مسکرادیتا ہے۔ اور اس کے پاپا مسکراتے ہوئے جیب سے چاکلیٹ نکال کر اس کے ہاتھوں میں تھمادیتے۔

چاکلیٹ سے اس قدر پیار ہے کہ اب وہ سارے محلے کے لیے چاکلیٹ بیٹی ہو گئی ہے۔ ہاں پاگل سے اس کا رشتہ عجیب سا ہے۔ محلے میں سب جانتے ہیں کہ پاگل اسے کتنا چاہتا ہے۔ اور وہ پاگل کو کس قدر ٹوٹ کر چاہتی ہے۔ پاگل جب بھی تھکا ہارا ہوتا ہے۔ دو ہی جگہ اس کا ٹھکانہ ہوتا ہے۔ سامنے کی مسجد یا چاکلیٹ بیٹی کا گھر۔ وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی رہتی ہے۔ جس وقت پاگل اس کے پاس رہتا ہے، محلے کے آوارہ بچے اس کے پاس پھٹکنے کی ہمت تک نہیں کرتے۔ بلکہ اس عجیب و غریب رشتے، پیار و محبت کی انوکھی باتوں اور پاگل کی عجیب و غریب حرکتوں کو بس دور ہی سے دیکھتے رہتے ہیں۔

اس دن چاکلیٹ بیٹی اکیلی تھی۔ جانے کس کی راہ تک رہی تھی۔ میں چپکے سے اس کے پاس آگیا تھا ——— وہ کہیں اور ہی دیکھ رہی تھی۔ اس قدر فرشتوں جیسا سفید چہرہ، پیشانی پر جھولتے گھنگھریالے بال اور بے بی فراک میں وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ میں دیر تک بس اسے دیکھتا رہا۔

پھر آہستہ سے پوچھا۔ "تمہارا کیا نام ہے؟"

"بے بی"

"پاپا کا نام"

”بابا“

”اور ممی کا؟“

”ممی“

وہ ایک ہی انداز میں بولتی چلی گئی۔ میں بے ساختہ مسکرا پڑا۔ ”تمہارا ایک نام چاکلیٹ بیٹی بھی تو ہے“

”ہاں ــــــ“ اب اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔

”اور بابا کا چاکلیٹ بابا“ میں نے اس کی بے چینی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں“

”اور پاگل کا؟“

دفعتاً وہ غصہ ہو گئی۔ ”وہ پاگل نہیں ہے۔ میرا بابا ہے۔ میں اس کے ساتھ خوب کھیلتی ہوں۔ وہ بہت اچھی اچھی باتیں بتاتا ہے......“

اور پھر پاگل کی آواز دور سے گونج اٹھی۔ ”فٹافٹ......جھٹا جھٹ......“

پاگل اپنی خاص آواز میں چھریاں بیچتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ پیچھے پیچھے بچوں کے جھنڈ تھے۔ ان کی شہہ پر وہ اپنی آواز اور تیز کر دیتا۔ ”فٹافٹ......جھٹا جھٹ“

”وہ ایک چلتا پھرتا بازار تھا۔ اس کے پیٹ پر ایک بیلٹ بندھا ہوا تھا اور بیلٹ سے چھریوں کے گچھے جھول رہے تھے۔ کچھ گھروں سے جب بلاوا آتا تو وہ اپنی آواز اور بھی بلند کر دیتا...... جھٹ......جھٹا جھٹ...... آلو چھیلو...... کدو چھیلو......“

”پاگل آ گیا......“ چاکلیٹ بیٹی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”ابھی آتا ہوں بیٹی۔“ پاگل نے دور سے ہی اشارہ کیا۔

ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ پاگل سب کچھ بھول سکتا تھا مگر وقت کی پابندی نہیں بھول سکتا۔ یہ اس کی نماز کا وقت ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوتا مگر نماز کے مقررہ وقت پر مسجد ضرور پہنچ جاتا۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر دیر تک اور کبھی گھنٹوں چاکلیٹ بیٹی کے پاس بیٹھا رہتا۔ اور طرح طرح کی باتیں کرتا رہتا۔

پاگل جس محبت سے چاکلیٹ بٹی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ یہی بات مسجد کے پیش امام کے ساتھ بھی ہے۔ مسجد کے امام صاحب سے بھی اس کی خوب بنتی ہے۔ وہ مسجد میں ہی سوتا ہے۔ وہیں رہتا ہے۔ مسجد ہی اس کا گھر ہے۔ اکثر امام صاحب اور پاگل کی خوبصورت تو تو میں میں بڑی دلچسپ معلوم ہوتیں۔ لڑنے جھگڑنے کا یہ سلسلہ شاید اسی دن سے قائم ہے جس دن سے پاگل مسجد میں آیا ہے۔ مسجد کو وہ اپنا حق سمجھتا ہے۔ اس کی دلچسپ باتوں میں سب شریک ہوتے اور خوب خوب لطف لیتے۔ امام صاحب اس کی غیر موجودگی میں اداس ہو جاتے...... بیچارے کا خاندان بنگلہ دیش میں مارا گیا۔ حالات کا مارا ہوا ہے۔ بیچارہ۔ وقت نے بے گھر کر دیا۔ سارے زمانے کا ستایا ہوا ہے۔ اسے پاگل کہتے ہو لوگو!

اکثر پاگل کو چھیڑنے والے بچوں کا وہ منھ بند کر دیتے۔ "تم کیا جانو! کتنے دکھوں کا سمندر ہے اس کے اندر۔ اتنے غموں کو پی جانا آسان نہیں ہوتا ہے۔ مگر عبداللہ پی گیا ہے۔ وہاں اچھا خاصہ کاروبار تھا۔ ایک پورا گھر تھا۔ بیوی تھی تین بچے تھے۔ مگر سب مارے گئے۔ اور عبداللہ بھاگ کر یہاں چلا آیا۔"

امام صاحب کی آواز گلوگیر ہو جاتی۔ "ایک دن اس سے پوچھا تھا۔ تم یہ چھری کیوں بیچتے ہو دوسرا دھندہ کیوں نہیں شروع کرتے۔ اس پر کہنے لگا، امام صاحب اپنی آنکھ کے سامنے بیوی بچوں کو اس طرح ذبح ہوتے دیکھا ہے جیسے چھری سے سبزیاں کاٹی جاتی ہیں ـــــ اسی لیے چھری بیچنے کا پیشہ اختیار کیا ہے......"

آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اور ایسے میں پھر اس کی آواز گلی کوچے میں بلند ہو جاتی ہے...... فٹافٹ جھٹاجھٹ...... آلو چھیلو...... کدو چھیلو......

"آگیا......" امام صاحب مسکراتے ہیں......

"پاگل کہیں کا۔"

بچوں کے جھنڈ پاگل کی جانب دوڑ پڑتے ہیں۔ اور چاکلیٹ بٹی دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجا کر پاگل کا خیر مقدم کرتی ہے۔

اب چاکلیٹ بیٹی سے میری بھی دوستی ہو گئی ہے۔ اکثر جب گراہک نہیں ہوتے تو میں اس کے پاس آکر اس کی میٹھی میٹھی گفتگو میں شریک ہو جاتا ہوں۔ پاگل کو لے کر محلے میں ہر روز نئے نئے واقعے جنم لیتے۔ میں اس کا ایک ایک واقعہ مزے لے لے کر سناتا۔ وہ تالیاں بجا کر خوب ہنستی۔ رمضان شریف کا وہ واقعہ بھی چاکلیٹ نے خوب مزے لے لے کر سنا۔ جب پاگل، امام صاحب کی سحری پر ہاتھ صاف کر گیا تھا۔ اور پیش امام صاحب کے پوچھنے پر بڑی شان سے جواب دیا تھا۔ خدا کے گھر کی ہر شے پر سارے بندوں کا برابر کا حق ہوتا ہے۔ دیر تک امام صاحب اور پاگل کی بک بک جھک جھک چلتی رہتی۔ اور آس پاس کے لوگ لطف لیتے رہتے۔ پاگل کس خوبصورتی سے اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

پاگل کسی سے بولتا چالتا بھی نہیں تھا۔ ہاں بچوں میں بہت مقبول تھا۔ اور امام صاحب سے اس کی خوب بنتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کسی دوسرے کو منہ بھی نہیں لگاتا تھا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہوا تھا۔ امام صاحب نے کافی مزے لے لے کر سنایا۔ اس دن مسجد میں کوئی مسافر ٹھہرا تھا۔ دیر تک مسافر نے پاگل اور امام صاحب کے سامنے بھوت پریت کی باتیں کیں۔ پھر رات میں مسجد میں ہی سو گیا۔ صحن میں سب کی چارپائی نکلی ہوئی تھی۔ رات میں بارہ۔ ایک بجے زور زور سے درخت کے ہلنے کی آواز آئی تو مسافر گھبراہٹ کے مارے اٹھ بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ پیڑ پر کوئی سفید سی چیز بیٹھی ہے اور اسے ہاتھ کے اشارے سے بلا رہی ہے۔ کانپتے ہوئے اس نے وہیں سوئے امام صاحب کو جھنجھوڑا۔ کچھ دیر کے لیے امام صاحب بھی گھبرا گئے ـــــ پھر جب پاگل کے پلنگ کو خالی پایا تو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ پھر تو وہ خوب ہنسے اور پاگل کو درخت سے کھینچ لائے اور خوب خبر لی......

"ایک عجوبہ ہے۔" بے بی ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

"مگر وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟" میں اکثر سوچتا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے کن جذبوں کو سلا دینا چاہتا ہے۔ شاید وہ نئے نئے کھیلوں میں گم ہو کر پرانے عبداللہ کو ہمیشہ

کے لیے بھلا دینا چاہتا ہے۔ ہر روز ایک نیا واقعہ۔ ایک نیا کھیل۔ نئی نئی حرکتیں۔ شاید نئے سرے سے جینے کا اب اس کے پاس بس یہی ایک راستہ رہ گیا ہے۔

اس بیچ عبداللہ کے بارے میں اور ایک نئی بات کا علم ہوا۔ عبداللہ کی ایک چھوٹی سی پیاری سی بچی بھی تھی۔ جسے وہ بے پناہ پیار کرتا تھا۔ عبداللہ آج تک اپنی بیٹی کو بھول نہیں پایا۔ آج بھی وہ اپنی بیٹی کو یاد کر کے مسجد کے صحن میں گھنٹوں روتا ہوا پایا جاتا ہے۔ میری پوری ہمدردی عبداللہ کے حصے میں سمٹ آئی تھی۔ دکان کھولنے اور بند کرنے کا لمبا سلسلہ معمول کے مطابق چلتا رہا۔ اور واقعات نئی نئی کروٹ لیتے رہے۔

کئی دنوں سے شہر کی فضا میں ایک تناؤ سا محسوس کر رہا تھا۔ اکثر عبداللہ کی آنکھوں میں بھڑکتی ہوئی چنگاریاں دیکھتا۔ وہ پہلے کی طرح بہ آواز بلند چلاتا بھی نہیں تھا۔ بلکہ خاموشی سے آتا اور ایک گہری سنجیدگی اوڑھ کر چاکلیٹ بیٹی کے پاس بیٹھ جاتا۔ پھر جلد ہی رخصت ہو جاتا۔

شہر میں کبھی بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ اس تناؤ سے ایسا احساس ہو رہا تھا۔ عوام میں بھی خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔

اس دن عجیب بات ہوئی۔ شہر کی فضا اچانک بہت خراب ہو گئی۔ شاید شہر میں کہیں معمولی سا جھگڑا ہوا۔ جو بہت جلد فساد میں تبدیل ہو گیا۔ سڑکوں پر دھڑا دھڑ پولیس چھا گئی۔ چاروں طرف خاکی وردی والے گنوں سمیت چھا گئے۔ شٹر گرنے لگے۔ دکانیں جلدی جلدی بند ہونے لگیں۔ پہلی بار دکان بند کرتے ہوئے دیکھا...... جسم میں عجیب سی وحشت لیے چیختا چلاتا ہوا عبداللہ دوڑا چلا آرہا ہے۔ آنکھیں لہو برسا رہی ہیں ــــــ چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا ہے۔ بے بی نے پکارا بھی مگر اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ دوڑتا ہوا مسجد میں داخل ہو گیا۔ آج وہ چلتا پھرتا بازار بھی نہیں لگ رہا تھا۔ نہ ہی ہمیشہ کی طرح اس کے پاس چھریوں والا بیلٹ تھا۔ بلکہ سب کچھ خلاف معمول۔ نیم

پلیٹ اس نے کہاں پھینک دی۔ بھیڑ میں خود بخود گر گئی یا اس نے ہی پھینک دیا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا۔

سب دکانیں ایک ایک کر کے بند ہو گئیں۔ سڑک پر وحشت کا رقص جاری تھا۔ جس کو جو راستہ ملا بھاگتا چلا گیا۔ لوگ پاگل ہو رہے تھے۔ مار کاٹ کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ پھر سڑک پر لاٹھی چارج ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ دوڑتے بھاگتے قدموں نے آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ گلی سے دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ دروازہ جلدی سے بند کیا اور لمبی لمبی سانسوں کو درست کرنے میں لگ گیا۔ قریب ایک گھنٹے بعد ہی بعض علاقوں سے دھوئیں کے بادل بھی اٹھتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس پورے محلے کی پولیس نے چاروں طرف سے ناکہ بندی کر دی تھی۔ اس لیے یہ محلّہ محفوظ رہا۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہو گیا۔ شہر کے بعض علاقے ہنگامے سے زبردست طور پر متاثر ہوئے ہیں۔

بند گھر میں عجیب ساخوف اندر ہی اندر طوفان اٹھا رہا تھا۔ پتہ نہیں پاگل کا کیا ہوا۔ اس کی انگارے برساتی آنکھیں اب تک نگاہوں میں گھوم رہی تھیں۔ وحشت اور بربریت کے اس خونی رقص کا شکار کون کب ہو جائے۔ کیا معلوم ——— یہ چاکلیٹ بیٹی کی معصوم شبیہہ جذبات میں عجب سی اتھل پتھل مچا رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے سارے پرانے منظر تیر گئے۔ اس کا دونوں ہاتھ کمر پر رکھے پاپا سے کہنا۔ پرمیشن نہیں ملے گا۔ پہلے چاکلیٹ لاؤ۔ بچوں کے جھنڈ کے ساتھ چیختے ہوئے پاگل کا چاکلیٹ بیٹی کے پاس آکر ٹھہر جانا اور دونوں بند ہاتھوں کو کھولنا جس پر ایک چاکلیٹ جگمگا رہا ہوتا......

دوسرے دن پولیس کی جیپ سڑکوں پر پرامن کا اعلان کرتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ رات کا کرفیو بھی لگا دیا گیا تھا۔ مگر صبح میں کرفیو اٹھالیا گیا۔ سڑک پر آیا تو سائیں سائیں کرتی ہوئی سڑک تھی۔ دکانیں کھلنے لگی تھیں۔ کچھ جگہوں پر جھنڈ بنائے لوگ کھڑے تھے۔ پولیس کی وردی بھی ہر موڑ پر نظر آ رہی تھی۔ لوگ کل کے واقعے پر تبصرہ

کر رہے تھے۔ کچھ جلی ہوئی دکانیں بھی نظر آئیں۔ توڑ پھوڑ کی کارروائی کے سارے منظر نمایاں تھے۔ بلوائیوں نے کس بری طرح جان اور مال کو نقصان پہنچایا تھا۔ سب کی زبان پر بس یہی جملہ تیر رہا تھا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اس شہر کی تاریخ میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ بعض متاثر گھروں کے پاس ماتم زدہ لوگ کھڑے ہیں۔ بھیگے ہوئے رخسار...... خود کو نہیں روک پاتی ہوئی آنکھیں، غمگسار چہرے...... دلاسہ دیتے ہوئے لوگ ـــــ دہاڑیں مارتے ہوئے نوجوان...... اندر سے آتی ہوئی دردناک صدا......

میں [illegible] محلے میں آیا (جہاں میری دکان تھی) ایک عجیب سی دیوانگی سے میرا سابقہ پڑا۔ اس محلے کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا مگر دور تک پھیلی ہوئی لمبی خاموشی کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ دل دہل گیا۔ مسجد کے پاس سہمے سہمے کچھ لوگ کھڑے تھے۔ اور چاکلیٹ بٹی کے گھر کے پاس غمگین صورت بنائے محلے کے بڑے کچھ بزرگ ہلکی ہلکی چہ می گوئیاں کر رہے تھے۔ ایک طرف نڈھال سے پیش امام کھڑے تھے۔ اندر خطرے کی گھنٹی سی بج اٹھی...... ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز سنی تو بلا تکلف تیز قدموں سے اندر داخل ہو گیا ـــــ بستر کے پاس غمگین صورت لیے اشرف صاحب اور ان کی مسز بیٹھی تھیں۔ اور بستر پر نڈھال آنکھیں بند کیے چاکلیٹ بٹی لیٹی تھی۔

"کیا ہوا بے بی کو!" میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

پیش امام صاحب مجھے کچھ دور لے گئے......

"بیٹا بعض انجانی محبت بڑے بڑے صدمے دے جاتی ہے۔ عبداللہ کے غم میں چاکلیٹ نے کیا حال بنا رکھا ہے...... مجھ سے تو دیکھا تک نہیں جاتا ـــــ

"عبداللہ"؟ میں چونک گیا تھا۔

امام صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا میرے اندر وہی درد ہے جو تمہارے اندر ہے۔ عبداللہ کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ وہ کہاں غائب ہے...... کہاں گم ہو گیا۔ چاکلیٹ بٹی نے روتے روتے اپنی یہ حالت کر لی۔ کل آخری دفعہ اسے اس وقت دیکھنے

کا موقع ملا جس وقت بلوائیوں کی ایک ٹکڑی اس محلے میں دھاوا بولنے آئی تھی۔ اور ہم نے پاگل کا وہ نقشہ دیکھا جو آج تک نہیں دیکھا۔ پاگل بڑے بڑے پتھر اینٹ بٹورے اشرف صاحب کے گھر کے قریب بیٹھ گیا۔ تیوریاں چڑھی ہوئی ——— آنکھیں چنگاریاں پھینکتی ہوئیں۔ بلوائیوں کو دیکھتے ہی اس کے اوپر وحشت سوار ہو گئی۔ دروازے کھڑکیاں سب بند تھیں بیٹا ——— اور اکیلے پاگل چھریاں پھینکتا ہوا، اینٹ پتھر اچھالتا ہوا ان کا مقابلہ کر رہا تھا۔ آگے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ پاگل کہاں گیا۔ کہاں گم ہو گیا...... مگر......"

پیش امام صاحب اتنا کہہ کر ٹھہر گئے۔ میں نے صاف محسوس کیا۔ ان کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے۔

"مگر کل ایک خبر ملی۔ پولیس کو ایک مخدوش لاش ملی ہے۔ پولیس اس لاش کی شناخت کروانا چاہتی ہے...... خبر کے مطابق حلیہ وہی ہے جو کہ عبداللہ کا تھا۔ مگر ہم میں سے کوئی نہیں گیا شناخت کرنے ——— صرف اس ڈر سے کہ اگر وہ عبداللہ ہوا تو......!"

امام صاحب کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں...... آسمان ابر آلود ہو گیا تھا فرشتے بھی مرتے ہیں، کے نام سے۔ ہندی سنڈے میلی

OO

ماہ رخ۔۹۔۱۹۷۹ء

حادثہ

پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں اس مکان میں نہیں رہ سکتا۔

آج جو کچھ ہوا تھا وہ خلاف توقع تھا ـــــ میں نے اس بارے میں کچھ سوچا بھی نہیں تھا ـــــ یہ گھر کے لیے، میرے لیے اور میری بیوی بچوں کے لیے بالکل ہی ایک نیا واقعہ تھا۔ میں اب تک حیرت زدہ ہوں اور واقعہ کی نوعیت پر غور کر رہا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟

ابھی کچھ ہی دن ہوئے میں اس مکان میں آیا ہوں۔ سرکاری ملازمت کا سب سے بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ نئے نئے شہروں کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ نئے نئے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ جب جب کسی نئی جگہ پوسٹنگ ہوتی، بچے خوشی میں جھوم جاتے۔ زیبا تھوڑی دیر کے لیے اداس ہو جاتی کہ یہ پرانی جگہ پھر چھوٹ جائے گی۔ اور اس جگہ سے، اس جگہ کے لوگوں سے وہ کتنی مانوس ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے پہلی بار اپنی شروع کی پوسٹنگ میں زیبا کو سمجھایا تھا...... دیکھو زیبا! میں جہاں جا رہا ہوں وہاں اس قدر گھل مل مت جانا کہ وہاں سے جانے پر تمہیں افسوس ہو۔ ملنا جلنا بھی ایک لحاظ سے ضروری ہے مگر ایسا نہیں کہ نئے مکان اور نئی جگہ کا دوسرا سفر تمہیں بالکل ہی توڑ کر رکھ دے۔ یہ پوسٹنگ کا معاملہ ہے۔

زیبا نے بھی سمجھوتہ کر لیا تھا۔ وقت اور حالات سے۔ بچوں کی فطرت ہی ہوتی

ہے گھلنے ملنے والی۔ گھر چھوٹنے کا افسوس ضرور ہوتا۔۔۔ پرانے ساتھیوں سے بچھڑنے کا غم بھی بے حد ہوتا۔ مگر اب جان گئے تھے کہ جب تک ابی ریٹائرڈ نہیں ہو جاتے، یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اس لیے اب میں بھی دیکھنے لگا تھا کہ نئے مکان میں آنے کے بعد وہ دوست بنانے کا کوئی جلدی فیصلہ نہیں کرتے تھے۔ وقت اور حالات کا اتنا تلخ تجربہ ہو چکا تھا کہ اسکول اور اسکول سے واپسی کے بعد زیادہ تر گھر میں ہی رہتے تھے۔ نہ کہیں جاتے نہ میدان میں کھیلتے کودتے۔ بس گھر میں ہی کھیلتے جو کھیلنا ہوتا۔ کبھی لوڈو، کبھی کیرم، کبھی ٹریڈ۔۔ زیبا بھی اپنی گھریلو مشغولیات میں الجھی رہتی۔ اور میں کتابوں، اخباروں میں کھویا رہتا۔ آفس سے تھکے ہارے لوٹنے کے بعد محلے میں ملنے ملانے کی خواہش نہیں ہوتی ہے۔ کون مغزماری کرے؟ میں خود کم بولنے اور ملنے والا آدمی ہوں۔ مگر محلے والوں کی نظر میں، میں کیا تھا، شروع میں مجھے اس کا کچھ بھی احساس نہیں تھا۔

پہلی بار اس نئی پوسٹنگ میں مجھے یہ تلخ تجربہ ہوا تھا۔

کرائے کا مکان مجھے مل گیا تھا۔ مکان مالک کا شہر کے دور دراز علاقے میں بڑا سا پختہ مکان تھا۔ وہ وہیں رہتے تھے۔ جس وقت میں خالی مکان کی بات کرنے ان کے ساتھ اس مکان تک آیا تو مجھے اس بات کا یقینی طور پر علم ہو چکا تھا کہ اس محلے کے سبھی لوگ پراسرار ہونے کی حد تک پراسرار ہیں۔ مکان مالک آگے آگے کنجی لیے ہوئے تھا۔ پیچھے سر جھکائے آہستہ قدموں سے میں بھی چل رہا تھا۔ وہ مجھے مکان کا نقشہ اور اس کی پرانی تاریخ کا ہلکا ہلکا علم بھی کراتا جا رہا تھا۔ اور میری نگاہیں آس پاس کے لوگوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ یہ محلّہ مڈل کلاس والوں کا تھا۔ مکان زیادہ تر پرانے ہی تھے۔ کچھ جلے نقوش بھی واضح تھے۔ بیچ بیچ میں کچھ نئے مکانات کے بننے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ کچھ گومٹی والی دکانیں بھی تھیں۔ جو زیادہ تر پان اور چائے کی تھیں۔ ان دکانوں کے قریب کچھ لوگ بھی کھڑے تھے۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا۔ ایک شخص نے دونوں ہاتھوں کو ملا کر زور سے تالی بجائی۔ پھر ساری کی ساری نگاہیں میری جانب ہو گئیں۔ میں بس اسی

قدر محسوس کر سکا کہ ان آنکھوں میں میرے لیے کوئی خوشی کا جذبہ نہیں تھا بلکہ یہ مجھے پہلے سے ہی خالی مکان میں آنے والے نئے کرائے دار کی حیثیت سے بھانپ چکے تھے۔ جس وقت مکان مالک گھر کا دروازہ کھول رہا تھا، آس پاس کی تمام نگاہیں میرے جسم میں گڑی جا رہی تھیں۔ اور ان بہت سی نگاہوں کے تعاقب میں، میں خود کو غیر محفوظ تصور کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اندر داخل ہوتے ہوئے جو سب سے پہلا سوال میں نے مالک مکان سے کیا وہ تھا۔

"یہ کیسا محلّہ ہے؟"

مکان مالک جو اشارے سے مجھے کچھ سمجھا رہا تھا، اچانک ٹھہر گیا اور پھر میرا بغور جائزہ لیتا ہوا بولا "کیوں؟ آپ نے کیا محسوس کیا؟"

"میرا مطلب ہے یہاں کے لوگ کیسے ہیں؟"

"اچھے ہیں۔" سپاٹ جواب تھا اس کا ــــــ پچھلے سال اسے فساد زدہ علاقہ سے تعبیر کیا جا چکا ہے۔ یہاں کے لوگ تمھیں ایسے ہی ملیں گے۔"

اتنا کہہ کر مکان مالک چپ ہو گیا۔ میں نے اس کے لب تھراتے ہوئے دیکھے۔ مجھے یاد آیا کہ ایک سال قبل اس شہر میں زبردست فساد ہوا تھا۔ شہر کے تمام تر علاقے اس فساد سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اور یہ علاقہ بھی انہی متاثرہ علاقوں میں سے ایک تھا جہاں زندگی نے ایک بھیانک خونی رقص پیش کیا تھا۔ جہاں لاشوں کے ہجوم میں زندگی برہنہ نظر آئی تھی اور موت کے تعاقب میں آنکھیں رشتے ناتوں سے بیگانہ ہو کر اپنا اثر کھو گئی تھیں...... اور پھر وہ تمام چہرے میرے سامنے آگئے جنھوں نے پہلی پہلی نظر میں مجھے پہچاننے کی کوشش کی۔ پھر مجھے مکان کی کنجی مل گئی۔ اور مکان مالک ــــــ مکان کے بارے میں کچھ ضروری ہدایات اور مشورے دینے کے بعد رخصت ہو گیا۔

دوسرے روز میں اپنے بال بچوں سمیت اس نئے مکان میں آگیا۔ سامان اتارتے ہوئے میں تھکے ہوئے بچوں اور زیبا کو دیکھ رہا تھا۔ زیبا کچھ ہراساں معلوم پڑ رہی تھی۔

شاید ان بہت ساری نگاہوں سے گھبرا رہی تھی جو دیا سلائی کی جلتی تیلیوں کی طرح اسے گھورے جا رہی تھیں۔ ان نظروں میں ایسا کچھ بھی نہ تھا جن میں دوستی اور محبت کا رنگ نظر آتا ــــــ حیرت کا جذبہ ہی شامل ہوتا اور یہی بات بچے بھی آہستہ آہستہ محسوس کرنے لگے تھے۔ زیبا نے اندر داخل ہوتے ہوتے کہا۔ ''جانے کیوں۔ شاید یہ پہلا اتفاق ہے جب اس نئے مکان میں، میں کچھ خوف سا محسوس کر رہی ہوں۔''

میں نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''بیکار سی بات ہے زیبا۔ دیکھنا چند دنوں میں عادت سی پڑ جائے گی۔ پہلی بار ہر جگہ ایسا ہی لگتا ہے۔''

زیبا چپ ہو گئی۔ مگر خود میں نے اپنے لفظوں کا کھوکھلا پن محسوس کر لیا تھا۔ پہلی بار کہیں بھی ایسا نہیں لگا تھا۔

پھر نئی نئی باتوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے دوسرے روز ہی میرے چھوٹے بچے جاوید نے بتایا۔ ''پاپا! بغل والے گھر کا بچہ باہر...... کھڑا تھا۔ میں دوستی کے لیے اس کے پاس گیا تو وہ چیختا ہوا اندر بھاگ گیا۔ میں نے جاوید کو ڈانٹا۔ جاوید اور سمن نے بھی کچھ عجیب عجیب سا محسوس کر لیا تھا۔ دونوں نے بات مان لی تھی۔ دو چار روز کے بعد وہاں کے اسکول میں ان کے داخلے بھی ہو گئے۔ اب یہ زیادہ تر پڑھائی اور گھر میں ہی مشغول رہتے۔ ہاں زیبا کچھ عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ عورتوں میں ہر کسی سے گھلنے ملنے کی عادت جو ہوتی ہے۔ کئی بار شام میں اسی خیال سے باہر بھی نکلی کہ آس پاس کی عورتوں سے دوستی کی جا سکے۔ شام میں دیر تک وہ لان میں ٹہلتی رہتی۔ مگر آس پاس کی جو عورتیں اپنے دروازے پر کھڑی رہتیں، زیبا کو دیکھتے ہی اپنے دروازے بند کر لیتیں۔ ایک دن زیبا نے اس صورت حال کا تذکرہ بڑے عجیب لفظوں میں کیا۔ میں پھر یہ کہہ کر ٹال گیا۔ نیا شہر ہے۔ لوگوں کو پہچاننے میں ابھی دیر لگے گی۔

بچوں نے بھی آہستہ آہستہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ پاپا اب اس جگہ دل نہیں لگتا۔ جو بچے کھیلتے رہتے ہیں وہ ہمیں اپنے کھیلوں میں شریک نہیں کرتے۔ مجھے دیکھتے ہی گھروں میں بھاگ کر بند ہو جاتے ہیں۔ یہ کیسا محلّہ ہے پاپا۔ آپ کوئی دوسرا مکان ڈھونڈیے

نا......اس بار زیبا بھی بچوں کے ساتھ تھی۔ایک دو سال نہیں۔ پتہ نہیں کتنے سال رہنا ہو گا...... تم کوئی دوسری اور جگہ تلاش کیوں نہیں کرتے؟

''کیسے تلاش کروں۔ نیا شہر ہے۔کوئی جان پہچان نہیں۔ پھر یہ گھر بھی تو بڑی مشکل سے ملا ہے۔''

''میں اتنا ضرور جان رہا تھا کہ یہ فساد زدہ علاقہ رہ چکا ہے۔ مگر ان لوگوں نے ہمیں اتنا غیر کیوں سمجھ رکھا ہے، یہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ چار بجتے بجتے میں آفس سے لوٹ آتا تھا۔ تب تک سمن اور جاوید بھی اسکول سے آچکے ہوتے تھے۔پانچ بجے تک ہم لان میں ہی کرسیاں لگادیتے۔ وہیں چائے پی جاتی اور ادھر ادھر کی باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ سمن اور جاوید اسکول کی باتیں لے کر بیٹھ جاتے پھر ایک لمبی اداسی اوڑھ لیتے......پاپا اس شہر میں فساد ہوا تھا۔ کتنے لوگ مارے گئے تھے۔ گھر جلا دیئے گئے تھے۔ بھائیوں کو ختم کر دیا گیا تھا۔ کسی کسی کی ماں نہیں ہے۔ سن سن کر دل روتا ہے پاپا......''

زیبا اداس اداس ہو جاتی ہے۔ آنکھیں میری بھی بھیگ جاتی ہیں۔ایک سال پرانی تاریخ اتنی جلدی تو فراموش نہیں کی جاسکتی۔ گہرے زخم اتنی جلد ٹھیک تو نہیں ہو سکتے۔ کیسا خون آشام منظر دیکھا ہو گا ان آنکھوں نے۔ سامنے مرتے ہوئے بھائی بہنوں کو۔ خود کیسے زندہ بچے ہوں گے؟ اور زندگی کے نام پر کیا ملا ہو گا...... ہمیشہ کے لیے ایک غم...... آنکھوں میں ہمیشہ چبھنے والا لہو آگیں منظر۔ شاید یہی وجہ ہے مجھے اس محلے میں کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ بلکہ کبھی کبھی ایک شاک سا لگتا ہے۔ان لوگوں نے مجھے بھی ہمدرد نہیں سمجھا۔ مجھے اپنے غموں کا شریک نہیں بنایا۔ آفس میں بھی اکثر پرانے واقعات تازہ کر لیے جاتے۔ پھر آفس کے پرانے لوگ اپنے زخموں کو دکھانے لگ جاتے...... آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے۔ اب سب کچھ بھول جانے میں ہی بھلائی نظر آتی ہے۔ مگر جس کے سامنے اس کے جوان بیٹے مارے گئے ہوں۔ جوان لڑکی کی آبروریزی کی گئی ہو۔ بہو داماد کی لاش کھینچتے ہوئے غنڈے لے گئے ہوں۔ وہ؟

چاک گریباں سے جسم پر گھاؤ ہی گھاؤ نظر آتے ہیں......

میں سر جھکا لیتا ہوں......دوستو۔ مت دکھاؤ۔ یہ سب ـــــــ تم نے دیکھا ہے اور میرا صرف سن سن کر رونگٹا کھڑا ہوا جا رہا ہے......ان کہانیوں کو بند کردو......

مگر کہانی کیسے بند ہوتی...... آفس سے گھر تک کا سفر پھر وہی کہانی لے کر بیٹھ جاتا۔ اکثر خواہش ہوتی ـــــــ دودھ والے، بجلی والے، سبزی فروشوں سے، اپنے بارے میں محلے والوں کے تاثرات پڑھ سکوں۔ اس دن جب دودھ والا آیا تو میں نے دریافت کیا...... "تم تو یہاں سب کے یہاں دودھ دیتے ہوگے...... کسی نے کبھی میرے بارے میں کچھ دریافت کیا ہے؟

دودھ والے نے نفی میں گردن ہلائی۔ "فساد کے بعد اب صرف ایک لمبی چپ رہ گئی ہے بابو...... یہی بغل میں سلمہ آپا تھیں۔ جگ آپا۔ جن کا گھر ہمیشہ گلزار رہتا۔ مگر سب مارے گئے۔ آنکھ کے سامنے جوان لڑکی کی لاش گھسیٹتے ہوئے غنڈے لے گئے۔ اب بولنے، ٹھہاکہ لگانے والی سلمہ آپا بھی چپ ہوگئی ہیں۔ میں جاتا ہوں۔ دودھ دیتا ہوں اور پھر واپس چلا جاتا ہوں۔ ہاں یاد آیا۔ اس دن وکیل صاحب پوچھ رہے تھے آپ کے بارے میں کہ آپ اپنے یہاں ہتھیار بھی رکھتے ہیں کیا۔؟ میں نے کہا۔ "بابو جی سیدھے سادے آدمی ہیں۔ ہتھیار بھلا کیوں رکھیں گے؟"

دماغ سن سے ہوگیا ہے۔ سلمہ آپا کی دردناک داستان نے جہاں آنکھوں کے آگے گہرے حلقے پیدا کر دیئے تھے وہیں وکیل صاحب کا سوال مجھے منجمد کر گیا تھا...... کیسی بستی میں آگیا ہوں؟ میرے بارے میں لوگ کیا کیا خیالات رکھتے ہیں......

زیبا کو بھی پاس بلا کر سمجھایا کہ دیکھو یہ فساد زدہ علاقہ رہ چکا ہے۔ یہاں سب وقت اور حالات کے مارے ہوئے لوگ ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ غلط نہ سوچا کرو۔ پھر سلمہ آپا کے بارے میں بتایا۔ زیبا نے بھی کچھ سن رکھا تھا۔ اس نے افسوس بھی ظاہر کیا۔ مگر اس دن شام میں جب آفس سے لوٹا تو زیبا کا چہرہ لال سرخ دکھائی دیا۔ پوچھنے پر

زیبا بپھر گئی...... حد ہوتی ہے کسی بات کی۔ اس محلے میں تو اخلاق نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔ لوگ تہذیب بھی نہیں جانتے۔ شام میں لان میں ٹہل رہی تھی تو دیکھا کہ گھر کے دروازے پر سلمہ آپا بھی کھڑی ہیں اور میری طرف دیکھ رہی ہیں ــــــ میں اخلاقاً آگے بڑھی کہ بات چیت شروع کی جائے۔ سلمہ آپا نے دھڑ سے دروازہ کھینچ لیا۔ حد ہو گئی بے غیرتی کی......"

"زیبا" اس کے شوخ اور غصے سے سلگتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی میں مسکرا پڑا۔ "ایک بات بتاؤ زیبا۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم کیسا محسوس کرو گی؟"

زیبا چونک پڑی۔ "کیوں؟"

"اس لیے کہ اس محلے میں سب حادثے سے متاثر لوگ ہیں اور سلمہ آپا کی کہانی سے تم بھی واقف ہو۔ پتہ نہیں کس اندرونی کیفیت کے تحت انہوں نے دروازہ کھینچ لیا۔ جس کی آنکھ کے سامنے اس کے شوہر کو ختم کر دیا گیا ہو اور جوان لڑکی بلوائیوں کی ہوس کا شکار بن گئی ہو تم اس کی اندرونی حالات کا تجزیہ کیسے کر سکتی ہو۔"

زیبا کے معصوم چہرے پر اداسی چھا گئی۔

"بس اسی لیے زیبا۔ اس محلے میں ملنے ملانے کے لیے ایک خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔ سمن کا برتھ ڈے قریب ہے۔ خوب دھوم دھام سے اس کا برتھ ڈے مناؤں گا۔ میں کچھ دعوتی کارڈس بھی چھپنے کو دے رہا ہوں۔ سمن کے برتھ ڈے پر سارے محلے کو دعوت دوں گا۔ شاید اسی سے تعلق کا راستہ پیدا ہو جائے۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" زیبا کے ہونٹ مسکرا پڑے۔ "میں آج ہی سے دعوت کی تیاری میں لگ جاتی ہوں۔"

کارڈ چھپ گئے تھے۔ دعوت سے زیادہ خوشی مجھے اس بات کی تھی کہ محلے والوں سے ملنے کا شرف حاصل ہو گا اور ہمارے بارے میں کوئی اچھی سی رائے قائم کر سکیں

گے اور اس تعلق سے ان کو مکمل طور پر سمجھنے کا موقع بھی ملے گا۔ کارڈ چھپ گئے تو میں نے آفس کے چپراسی کو تمام محلے میں کارڈس تقسیم کردینے کے لیے کہا۔ چپراسی چلا گیا تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ شاید اب وہ زخم بھر سکیں جس کی ہم ایک مدت سے تمنا کیے ہوئے تھے۔

اور یہیں پر ایک حادثہ ہو گیا، ہم جس کی توقع بھی نہ کر سکے تھے۔

شام میں بھیشم لوٹ آیا ـــــ چہرے سے تھکا تھکا۔ آتے ہی ناگواری کے لہجے میں بولا۔ "بابو جی! آپ چاہے سسپینڈ کردو مگر اب اس علاقے میں، میں نہیں جاؤں گا!"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔

"وہ لوگ آدمی نہیں ہیں بابو جی۔ پاگل ہیں، پورے پاگل۔ کچھ نے تو کارڈ ہی پھاڑ دیئے۔ کچھ لوگوں نے کارڈ دیکھتے ہی مجھے دھکا دیتے ہوئے دروازے کے باہر کر دیا اور ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا۔ کچھ لوگوں نے غصے میں گالیاں تک دیں۔ اور...... کچھ لوگوں نے...... یہ دیکھیے کارڈ پر کیا کیا لکھ دیا ہے......"

مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ کرسی کا سہارا لیا۔ کانپتے ہاتھوں سے کارڈ پکڑے۔ اور پھر سکتے کے عالم میں آگیا...... آنکھوں میں لال لال ڈورے رقص کرنے لگے...... یہ میں نے کیا کر دیا تھا۔ مجھے پہلے اس کا احساس ہی نہیں تھا۔ سمن کے برتھ ڈے کو گول گول دائرے سے گھیر کر کچھ لوگوں نے اس طرح کے جملے لکھ دیئے تھے...... جسم اب بھی کانپ رہا تھا۔ اور اداس کانپتی نظریں ان جملوں پر تیر رہی تھیں......

"آج کے دن ہی میرا پیارا بیٹا شہید ہوا تھا۔

"اسی تاریخ کو دنگائیوں نے میرے گھر میں آگ لگا دی تھی۔ میرے داماد، بہو، بیٹی مارے گئے تھے۔"

"میری بدنصیبی کا دور اسی تاریخ سے شروع ہوا۔"

"یہ ماتم کا دن ہے اور تم جشن منا رہے ہو۔ لعنت ہے تم پر۔"

"میری کمسن لڑکی اس تاریخ کو بلوائیوں کا نشانہ بن گئی۔"

"بد نصیب باپ باقی بچا ہے کہ اسی منحوس دن اس کا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔"

اب میرے ضبط کا باندھ ٹوٹ چکا تھا۔ بھیشم حیرت بھری نظروں سے مجھ میں پیدا ہوئے تغیر کو دیکھ رہا تھا۔ تھرائی آنکھوں سے بھیشم کو دیکھا......اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں مخاطب ہوا۔

"اب جاؤ بھیشم...... پلیز جو کچھ ہوا میں اس کے لیے بے حد شرمندہ ہوں۔ مگر تم ابھی چلے جاؤ۔"

بھیشم جا چکا ہے۔ میں کرسی پر ڈھیر ہو گیا ہوں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلتا جا رہا ہے۔ خون میں ڈوبے ہوئے سارے جملے نگاہوں میں حرکت کر رہے ہیں—— اب کیا کروں؟ گھر پر زیبا سارے انتظامات مکمل کر رہی ہو گی۔ میں نے کارڈ بھیج کر اچھا نہیں کیا۔ مجھے پہلے لوگوں کی رائے لے لینی چاہیے تھی۔ پتہ نہیں محلے کے لوگ میرے بارے میں اب کیا کیا سوچ رہے ہوں گے۔ سمن کتنا خوش تھا۔ کہہ دوں گا۔ مجبوری ہے بیٹا۔ پارٹی کینسل۔ مگر پھر رہ رہ کر محلے والوں کا خیال آ رہا تھا جو پیہم صدمات کی دنیا میں باقی ماندہ دن گزار رہے تھے۔ میں اب تک ان کے بیچ اجنبی ہوں۔ اور اب تو اجنبیت کی ایک مضبوط دیوار کھڑی کر چکا ہوں۔

شام میں تھکے ہارے قدموں سے گھر لوٹا۔ پھر سب غمگین صورت بنائے مجرم کی طرح کمرے میں بیٹھ گئے...... پھر ایک لمبی خاموشی کے بعد زیبا کے ہونٹ آہستہ آہستہ سے پھڑپھڑائے......

"مجھے حالات کا علم نہیں تھا۔ ورنہ میں خود تمہیں منع کر دیتی۔ اتنا بڑا غم۔ پتہ نہیں لوگ کیسے سہہ لیتے ہیں......"

پھر کچھ وقت گزرا۔ رفتہ رفتہ اب ماحول میں ڈھلنے کی عادت سی پڑنے لگی تھی۔ ہاں ایک بات ضرور تھی کہ محلے کے اتنے سارے لوگوں کے بیچ مجرم کی حیثیت سے

جینا پڑ رہا ہے۔ اس دن پھر اچانک ایک واقعہ پیش آیا۔ شام کے وقت سمن اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ اچانک چیخ پڑا...... "پاپا...... سانپ...... سانپ نے کاٹ لیا......"

چیخ اتنی زور دار تھی کہ سب اپنا کام چھوڑ کر بھاگے۔ سمن اپنے پیر کو پکڑے زور سے چیخ...... رہا تھا...... "سانپ پاپا...... سانپ نے کاٹ لیا......"

زیبا کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ میں دوڑتا ہوا اس کے قریب گیا۔ جہاں اس نے پیر پکڑ رکھا تھا وہاں سچ مچ سوجا ہوا تھا۔ سمن کا چہرہ زرد پڑتا جارہا تھا۔ دبے دبے لفظوں میں وہ سانپ سانپ دہرائے جارہا تھا...... سارے جسم میں چھٹپٹاہٹ بڑھ گئی تھی۔ پھر ایک زوردار چیخ کے ساتھ وہ...... بے ہوش ہو گیا۔ زیبا پھپھک پڑی۔ دیکھا دیکھی جاوید نے بھی رونا شروع کر دیا۔ میری حالت خود غیر ہو رہی تھی۔ اب کہاں جاؤں؟ شاید اسی دن کے واسطے ڈر رہا تھا۔ محلے والوں کو اتنی ہمدردی بھی نہ تھی کہ پڑوس کے گھر سے رابطہ ہی قائم رکھتے۔ آئے ہوئے مہینوں بیت گئے مگر رشتے کی کڑی نہ جڑی۔ اب کس کو آواز دوں؟ کسے پکاروں؟ کیا کروں؟ سارے کے سارے اجنبی چہرے......

ہلکا سا ہوش آیا ہے۔ آنکھیں کھولی ہیں۔ پھر وہی چھٹپٹاہٹ سما گئی ہے۔ پتہ نہیں کس نے کاٹا ہے۔ سانپ نے کاٹا ہوتا تو اب تک جسم نیلا پڑ چکا ہوتا...... پاپا...... پا...... پا ...... اس کی دردناک آواز حواس پر بجلی بن کر گر رہی ہے۔ کئی بار دروازے کا چکر لگا کر لوٹ آیا ہوں......

زیبا رو رہی ہے...... "کچھ کرو پلیز، بچہ کیسے نڈھال ہوا جارہا ہے۔ کچھ ہو گیا تو؟"

"مگر کہاں جاؤں؟"

"بغل میں ڈاکٹر انوار رہتے ہیں۔"

"وہ نہیں آئیں گے۔ اس محلے سے کوئی نہیں آئے گا۔"

"پھر رات کے وقت کہاں جاؤ گے؟"

سخت الجھن میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ سمن اب بھی بے طرح چھٹپٹا رہا ہے۔ درد سے اینٹھا جارہا ہے...... کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ دروازے کے پاس آکر پھر ٹھہر گیا

ہوں...... کہاں جاؤں! اس وقت آٹو رکشا ملے گا؟ یا اسپتال لے چلوں...... محلے والوں سے تو رحم کی امید کرنا ہی بے کار ہے......

اچانک ٹھہر گیا ہوں۔

"دروازے پر کچھ ہاتھوں کی دستک پڑی ہے۔ لوٹ کر پھر دروازے تک آتا ہوں اور حیران حیران سا محلے کے سارے بزرگوں کو تک رہا ہوں......ڈاکٹر انوار، وکیل صاحب، خورشیدی صاحب اور سلمہ آپا وغیرہ......

"آپ لوگ......! میرے پریشان چہرے پر حیرت اگ آئی ہے۔

اس سے قبل ہی وکیل صاحب بول پڑتے ہیں۔ "بھائی! آپ بھی عجیب پڑوسی ہیں۔ وہ تو سلمہ آپا نے خبر کی کہ آپ کے بچے کو کچھ ہو گیا ہے......انہوں نے کچھ رونے چیخنے کی آواز سنی ہے۔ ہم بغل میں تھے۔ آپ نے خبر کی ہوتی۔"

"جی"______ میرے لفظ حلق میں ہی اٹک گئے ہیں۔ سلمہ آپا لوگوں کو چیرتی ہوئی اندر داخل ہو گئی ہیں۔ "کیسا چھٹپٹا رہا ہے بچہ"۔ زیبا پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ سب برسوں کے شناسا بن گئے ہیں اور بے تکلف اندر داخل ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر انوار کے چہرے پر پریشانی ہے...... "ٹھہریئے میں دیکھتا ہوں۔"

زیبا کچھ کہنا چاہتی ہے۔ جیسے ماجرا سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ بچوں کا وہی حال ہے۔ سلمہ آپا شفقت سے زیبا کے سر پر ہاتھ رکھتی ہیں۔ "تم پریشان مت ہونا بیٹی۔ کیسی گھبرائی ہوئی ہے تو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر انور دوائی کے لیے ایک شخص کو دوڑاتے ہیں۔ پھر دوائی بھی آجاتی ہے۔ سمن نے خود اٹھ کر دوائی کھائی۔ ڈاکٹر انوار نے آہستہ سے اس کا سر سہلایا۔ "اب سو جاؤ بیٹے......"

سمن پھر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر انوار اب میری طرف مڑے تھے...... "بھائی سانپ وغیرہ کچھ نہیں۔ شاید بچھو تھا۔ ڈنگ گہرا نہیں ہے۔ دوائی سے نیند آجائے گی۔ اس کو سونے دیجئے۔ انشاء اللہ کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں پھٹی پھٹی نظروں سے فرشتہ صفت لوگوں کو گھور رہا ہوں۔ یہ کیسی عجیب کہانی ہے۔ تبدیلی کا کیسا انوکھا باب ہے۔ پل میں یہ سب کیا ہو گیا۔ اللہ نے سمن کی حفاظت کے لیے آسمان سے یہ کیسے نیک فرشتے بھیج دیئے۔

ڈاکٹر انوار سمیت سب لوگ جا رہے ہیں...... "ہم پھر آئیں گے۔"

وکیل صاحب کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہیں۔ "جب ضرورت پڑے، آواز دے دینا......"

خورشیدی صاحب کہہ رہے ہیں...... "گھبراتا نہیں۔ کہو تو اپنی اہلیہ کو تمہارے یہاں بھیج دوں۔"

عقیدت بھری نظریں عجیب رنگ لیے سب کو دیکھ رہی ہیں۔ آسمان سے نور کی بارش ہوئی ہے شاید۔

سلمہ آپا جاتے جاتے ٹھہر گئی ہیں۔ زیبا کو ایک بار پھر گلے سے لگا لیا ہے...... "بیٹی! آج تمہاری پریشانی نے کچھ بیتی یادوں کو تازہ کر دیا۔ جنہیں ہم نے نہ دہرانے کا عہد کر لیا تھا۔ تمہارے گھر سے بچے کے نالے بلند ہوئے اور تمہارے شوہر کو حواس باختہ دیکھا تو اچانک تم میں اپنا عکس نظر آ گیا......"

سلمہ آپا کی آنکھوں میں آنسو مچل گئے ہیں۔ جنہیں بڑی مشکل سے پی گئی تھیں سلمہ آپا...... "خیر چھوڑو بیٹی۔ پرانی کہانی ہے جب بھی بچے کو کوئی تکلیف محسوس ہو، مجھے پکار لینا......"

اور پھر زیبا سلمہ آپا کے گلے مل کر اس طرح رو پڑی جیسے برسوں بعد بچھڑی ہوئی بہن سے مل کر رو رہی ہو......! اور میں اب بھی حواس باختہ موم کے اس نئے رنگ کو اپنے اندر اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

OO

روبی۔ ۱۹۸۱ء

ایک نیا سفر

گاڑی پر ضروری سامان لادا جا چکا تھا۔ ڈرائیور سر جھکائے اگلے حکم کا منتظر نظر آرہا تھا۔ چھوٹا سا بریف کیس تھامے تقریباً ادھیڑ عمر کا شخص تیزی سے باہر آیا۔ اور اپنی خوبصورت بیوی سے مخاطب ہوا۔

"سامان ملالو......اس لیے کہ سفر اب شروع ہوا چاہتا ہے۔"

عورت مسکرائی۔ اشارے سے ڈکی میں رکھے سامانوں کو اپنی پتلی پتلی مخروطی انگلیاں گھما کر گننے لگی۔ پھر وہی کولگیٹ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

"چلو۔ سفر شروع کرنا چاہیے۔"

اس نے اسٹیرنگ سنبھال لی۔ عورت جو اس کی بیوی تھی، بغل میں بیٹھ گئی۔ گھر کے نوکر چاکروں نے الوداعی سلام داغا اور گاڑی سفر پر روانہ ہو گئی۔

"زندگی ایک سفر ہے۔ یہ سفر لمبا بھی ہو سکتا ہے اور مختصر بھی"

مرد ذرا دیر بعد بولا۔

"یکسانیت سے ہر آدمی بور ہونے لگتا ہے" بیوی آہستہ سے بولی "جیسے ہم تم"۔

مرد نے اب دائیں ہاتھ سے اسٹیرنگ تھام لی تھی۔ اور بایاں ہاتھ بیوی کے کندھے پر ڈال دیا تھا۔

"اب دیکھو نا۔ ہم یہیں کیا کچھ کم خوش تھے۔ کس بات کی کمی تھی۔ ہے نا، نئے

نئے فیشن کے صوفے، فرنیچر۔ ہر کمرے میں بیڈ سے اٹیچ کلر ٹی وی، فریج۔ ہر روم میں فون۔ دسوں نوکر چاکر۔ مگر پھر بھی وہی یکسانیت......"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ آج کی رات ہم گھر سے باہر ہی گزاریں گے"

مرد بیوی سے بولا۔

"شاید ہم خوش رہ سکیں۔"

"خوشی ـــــ یہ پرندہ جتنے میں ملے خرید لینا چاہیے۔"

عورت کے چہرے پر پسینے کے کچھ قطرے سمٹ آئے تھے ـــــ رومال سے اپنا چہرہ صاف کرنے کے بعد وہ دوبارہ ونڈو سے باہر کا نظارہ دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ شہر جیسے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ سیاہ رات کی چادر چاروں طرف تن گئی تھی۔ ذرا دیر بعد عورت پھر بولی۔

"ہم صرف ایک...... صرف ایک سکون سے پُر رات گزارنے نکلے ہیں ـــــ کیا ایسا ہو گا؟"

"جہاں مشینی شور نہ ہو۔ گھر کی الجھنیں نہ ہوں۔ دنیا کی فکر نہ ہو۔"

"بہر حال آج رات ہمیں اکیلے گزارنی ہے۔ تم بھی ہر وقت مشین بنے رہتے ہو۔ صبح میں جس وقت جاتے ہو، بچے سوتے رہتے ہیں اور رات میں اس وقت آتے ہو جب آدھی رات گزر چکی ہوتی ہے۔"

"ہاں میں سوچتا ہوں۔ اتنا کام ہم لوگ کیوں کرتے ہیں۔ مگر کوئی جواب نہیں ملتا" مرد ذرا ٹھہر کر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم سوچنا بند کر دیں۔ مگر یہی نہیں ہوتا۔ اب دیکھو۔ لفظوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک لفظ سے کتنے ہی لفظ پیدا ہو گئے ہیں اور تم محسوس کر رہے ہو۔ ہماری سوچ کی سرحدیں پھیلتی جا رہی ہیں۔ ہماری خواہشات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہم جرائم کی دنیا میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ایک دن میں جارج آرول کا مشہور ناول "۱۹۸۴" پڑھ رہا تھا۔ اس ناول کی یہی ادا مجھے پسند آئی کہ لفظوں کو

مختصر کرو۔اور سوچنا بند۔ تمام فساد کی جڑ یہ لفظ ہیں۔ جو خواہش جگاتے ہیں اور سوچ کا دائرہ بڑھاتے ہیں۔ ہمارے پاس جس قدر لفظ کم ہوں گے۔ ہم کم سوچیں گے۔اور جرم بھی کم کریں گے...... یعنی ہم سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوگا۔"

"گناہ اگر خوبصورت ہو تو......" عورت کے ہونٹوں کی لالی کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

مرد نے اسٹیرنگ تھامے ہوئے عورت کو چوم لیا۔۔۔۔۔۔ دفعتاً عورت کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ایک جھٹکے سے مرد نے بریک لیا۔گاڑی چرچرا کر رک گئی......

"وہ دیکھو۔۔۔۔۔۔۔ سامنے کیا ہے۔ شاید کوئی گرا ہوا ہے۔"

مرد نے غور سے دیکھا۔ ہاں کوئی سچ مچ گرا ہوا تھا۔ گاڑی اندھیری سڑک پر کھڑی تھی۔ مرد اسی کش مکش میں تھا کہ گاڑی سے اترے یا نہیں۔ وہ آدمی بیچ میں پڑا تھا۔

"اونہہ۔ سارا موڈ چوپٹ ہو گیا۔ عورت بڑبڑائی۔ مگر خوف اب بھی اس کے چہرے پر قائم تھا۔

"ہم گاڑی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ ہاں پیچھے کر سکتے ہیں۔اور کراسنگ سے دوسری جانب موڑ سکتے ہیں۔ مگر......

"مگر کیا؟" عورت جھنجھلاہٹ سے بولی۔

"مگر پتہ نہیں یہ کون ہے؟ زندہ بھی ہے یا مر گیا......"

"اس سے ہمیں کیا لینا دینا" عورت بولی۔ "اگر کسی گاڑی سے کچل کر مر گیا ہے تو الزام ہم پر بھی آسکتا ہے۔ ہمیں یہاں رکنا نہیں چاہیے۔"

مرد نے دوبارہ اسٹیرنگ پر دباؤ ڈالا۔ پھر پتہ نہیں کیا سوچتا ہوا وہ عورت سے بولا۔

"تمہیں ایک بات یاد ہے۔ کرسمس کے روز پال نے اتنی شراب پلادی تھی کہ میری گاڑی اسٹریٹ پول سے ٹکرا گئی تھی اور میں اسٹیرنگ پر جھول کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ایک پھیری والے نے یہ نظارہ دیکھا اور مجھے گھر تک لانے کا انتظام کیا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

""یہ کوئی پھیری والا بھی تو ہو سکتا ہے"
"تم نے اسے پیسہ بھی تو دیا تھا اور اس نے پیسہ لے بھی لیا تھا"
"وہ بیچارے غریب ہوتے ہیں۔ تم یہ سمجھتی کیوں نہیں"

عورت نے گھور کر مرد کو دیکھا۔ مرد اچانک سنبھل گیا تھا۔ اندھیرے میں جو چیز لیٹی ہوئی تھی وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اور ...... دونوں نے صاف دیکھا۔ وہ کوئی چوبیس پچیس سال کا لڑکا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی کے باوجود اس کا سراپا ایک دم صاف ہو گیا تھا۔ وہ اچھے خاصے پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ اور وہ اب اپنے دونوں ہاتھوں اور پیروں کو کھینچتا ہوا بڑے مزے سے انگڑائیاں لے رہا تھا۔

عورت ایک دم سے گھبرا گئی۔

مرد نے شیشہ گرا لیا۔ کون ہے ......؟ اس نے تھوڑے نکلے ہوئے شیشہ سے سر نکال کر پوچھا۔

نوجوان نے بڑی بے بسی سے دونوں کا جائزہ لیا پھر بڑے تیکھے لہجے میں ان کے قریب آکر بولا۔ "میں خودکشی کرنے کے لیے سڑک پر لیٹ گیا تھا۔ ایک کتاب میں پڑھا تھا۔ ایسی موتیں بڑی خوبصورت ہوا کرتی ہیں۔ تیزی میں بھاگتی ہوئی گاڑی آ رہی ہے اور پھر گاڑی جسم کو روندتے ہوئے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اور معاملہ صاف۔"

عورت نے سسکاری لی۔ اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔

"بائی دی وے ...... نوجوان مسکرایا۔ آج میری قسمت ہی خراب تھی۔ شاید اس طرح لیٹے لیٹے میری آنکھ بھی لگ گئی تھی۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک سوتا رہا۔ مگر ایک گاڑی نہیں گزری۔ اور اب آپ کی گاڑی گزری بھی تو ......"

"تم بے روزگار ہو؟" مرد نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ بالکل نہیں" نوجوان نے کہا۔ "میں یہاں ایک اچھی فرم میں ملازم ہوں۔"

"کسی سے عشق ہوا تھا جو ناکام ہو گیا؟"

"میں فالتو چیزوں پر وقت نہیں برباد کرتا۔"

"کوئی حادثہ؟"

میرے لیے کوئی حادثہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

"پھر پاگل ہو"۔۔۔ مرد سے رہا نہیں گیا۔

نوجوان نے ایک زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔۔ایڈونچر۔اچانک جھٹکے سے ہمیشہ کے لیے آنکھ بند ہو جائے تو اس سے بڑا ایڈونچر دوسرا کیا ہو سکتا ہے؟ زندگی سوال در سوال الجھی ہوئی ہے۔اور اب میرے لائق کہیں کوئی تفریح نہیں رہی۔اور بورڈم سے بچنے کے لیے کچھ نیا کرنے کی خواہش جنم لیتی رہتی ہے......"

"اور یہ تم کچھ "نیا" کرنے جا رہے تھے؟" بہت دیر بعد عورت بولی۔اب وہ ڈر اور خوف سب کچھ بھول گئی تھی۔

"جی ہاں" نوجوان نے ناگواری سے کہا "اور آپ لوگوں نے ایڈونچر کا سارا مزہ چوپٹ کر دیا۔"

"مگر اس کے انجام سے واقف تھے؟" مرد نے پوچھا۔

"ہاں۔ایک بے رحم موت!" نوجوان مسکرایا۔ مگر آپ اتنے خوفزدہ کیوں ہیں۔ یوں بھی زندگی ہے ہی کیا۔ آفس اور آفس سے گھر۔ کھانا کھالیا اور سو گئے۔ پھر معمول سے اٹھ گئے اور روزانہ کی وہی ڈیوٹی۔ بتائیے۔ کیا یہی زندگی ہے۔ کسی دن فرصت نہیں۔یہاں تک کہ سنڈے کے دن بھی نہیں۔"

"تو تم صرف اس واسطے بھاگ رہے تھے کہ تمہیں فرصت نہیں ملتی۔"

"نہیں۔۔۔۔ دراصل میں ایک طرح کے معمولات اور یکسانیت سے گھبرا گیا تھا اور بس سکون کے اس ابدی لمحے کا منتظر تھا۔جب چیختی ہوئی کوئی گاڑی مجھے روندتی ہوئی......نوجوان ٹھہرا...... کیسا ہوگا وہ ایڈونچر جسے میں خود دیکھ نہیں سکوں گا۔بائی دی وے۔۔۔۔ آپ نے آج سارا موڈ چوپٹ کر دیا۔۔۔۔ گاڑی روک کر۔اب یہ ارادہ پھر کسی دن کرنا ہوگا"

نوجوان کندھے جھٹکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پل کے ایک طرف تیز تیز اس کے قدم پتہ نہیں کس سمت کو بڑھے جا رہے تھے۔

مرد نے اپنا ہاتھ دوبارہ اسٹیرنگ پر سخت کیا۔ عورت نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ اسٹریٹ پول کی دھیمی روشنی میں بھی سارے منظر صاف تھے۔

ذرا ٹھہر کر عورت نے مرد کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا...... ''سنو...... سچ کیا ہے۔''

مرد نے ویسے ہی دھیمی روشنی میں خود سے بے خبر آگے بڑھتے ہوئے نوجوان کو دیکھ کر کہا۔

''سکون کہاں ہے؟''

پھر دونوں چپ ہو گئے۔

عورت نے مرد کے کاندھے پر سر ٹکا دیا۔ اور ذرا ٹھہر کر بولی ''سنو۔ گاڑی گھر کی طرف موڑ لو۔ کل صبح تمہیں آفس بھی تو جانا ہے......

''مگر؟''

''دونوں بچے سوئے ہیں۔ سوتے ہوئے بچے کتنے معصوم، کتنے پیارے لگتے ہیں۔''

''گھر جاتے ہی دونوں کو اٹھا دوں گا''۔۔۔۔

مرد نے فرط جوش سے کہا۔

گاڑی اب اندھیری سڑکوں سے ہوتی ہوئی گھر کی جانب بڑھ رہی تھی۔

○○

(یدھ رت نام آدمی، قرطاس سالنامہ) ۱۹۸۰ء

اکیلے آدمی کی موت

عزیز الدین دیر تک اپنے کمرے میں ٹہلتے رہے۔ صبح سے موسم خراب تھا۔ پرانی کھانسی کی شکایت بھی تھی۔ چلتے چلتے کھانسنے لگتے۔ سانس پھول جاتی تو کرسی پر کچھ دیر کے لیے ستانے بیٹھ جاتے۔ اس بڑے سے گھر میں ان کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور جب سے ان کی نظر اس عجیب سے اشتہار پر پڑی تھی بڑھاپے کے کمزور بدن میں جیسے زلزلہ آگیا تھا۔ دیر تک اشتہار کو عجیب سی نگاہوں سے گھورتے رہے۔ احمد حسین زندہ ہے۔ میرا دوست، میرا یار، ابھی بھی زندہ ہے اور اپنے ہی جیسا اس دنیا میں تن تنہا اکیلا...... بے چینی بڑھ جاتی تو کمرے میں ٹہلنے کا عمل ایک بار پھر شروع ہو جاتا۔ دمے کے مریض ٹھہرے۔ سانس پھولنے لگتی۔ جب سے یہ خبر پڑھی تھی ایک سیکنڈ بھی چین سے نہیں بیٹھے تھے۔ خود ہی اٹھے اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے دوستوں کو خبر کرنے چل دیئے۔ کچھ ہی دنوں بعد عید تھی، اور اس وقت عزیز الدین بے صبری سے اپنے دوستوں کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

سب سے پہلے حمید بھائی آئے۔ رکشہ سے بڑی مشکل سے اترے۔ لاٹھی ٹیکتے ہوئے عزیز الدین کو آواز دی۔ پوپلے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ حمید بھائی ایک دو سال بڑے رہے ہوں گے۔ سہارا دیتے ہوئے، خود بھی گرتے پڑتے حمید بھائی کو اندر لے آئے۔ حمید بھائی صوفے پر پھیل گئے۔

"اب چلا نہیں جاتا عزیزو......"

عزیزالدین نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ "بڑھاپے نے کسی لائق نہیں چھوڑا۔ کل تک اس بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ مگر اب سوچتا ہوں اکیلے آدمی کی موت کیسی ہوتی ہوگی؟"

"اکیلے آدمی کی موت!"

حمید بھائی کے رعشے بھرے ہاتھ صوفے کی دھول صاف کرتے رہے۔ آنکھیں یوں ہی بے مطلب سی گھورتی رہیں۔

"موت ہمارے لئے سب سے تکلیف دہ چیز ہے۔ موت جو بغیر خبر کئے آئے گی موت جو اکیلی آئے گی، اور رونے والا کوئی نہ ہوگا۔"

"اور سہارا دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ آخری منزل کو پہنچانے والا کوئی نہ ہوگا۔" عزیز بھائی پھیکی مسکراہٹ اگلتے ہوئے بولے۔

"کوئی پاس پڑوس میں خبر دینے والا نہ ہوگا۔ مزار پر فاتحہ پڑھنے والا نہ ہوگا۔"

"بس اکیلے پن کو کاٹ رہے اسی موذی سے ڈر لگتا ہے۔ ہمارے بعد کون ہے ہمارے پیچھے کون ہے؟"

دروازے پر ایک ساتھ کئی قدموں کی آہٹ گونجی۔ عزیزالدین سنبھل گئے۔

"لگتا ہے سب آگئے۔"

تیز قدموں سے باہر نکل آئے۔ کھانسی ایک بار پھر تیز ہوگئی تھی۔ باہر قمر بھائی، مشتاق بھائی اور سمیع بھائی تینوں کھڑے تھے...... اپنے اپنے جان لیوا بڑھاپے کے ساتھ ...... جھری بھرے پوپلے ہونٹوں پر سنجیدگی طاری تھی۔

"آیئے، آیئے......" عزیزالدین کی آنکھوں میں چمک تھی۔

تینوں بوڑھے قدم داب‌تے اندر چلے آئے۔ حمید بھائی سے ہاتھ ملایا۔ پھر اپنے اپنے صوفے پر جم گئے۔ قمر بھائی کی آنکھوں میں موتیابند اتر آیا تھا۔ کمزور سی آواز میں بولے:

"تم نے آج بلایا تو بے حد مسرت ہوئی کہ اس بڑھاپے میں بچپن کی تاریخ دہرائی جاسکتی ہے۔ اپنا احمد حسین زندہ ہے اور اسی شہر میں ہے۔ اس خبر سے بتا نہیں سکتا کیسی خوشی ہو رہی ہے۔"

عزیزالدین سمیت پانچوں بوڑھے کرسیوں پر سر جھکائے بیٹھ گئے۔ عزیز نے اخبار سے اشتہار والا صفحہ کھول لیا۔ کمرے میں پراسرار خاموشی پھیل گئی۔

عزیز نے دوبارہ کہا۔۔ "بھائی۔۔۔!"

"اکیلے پن کا ایک غم یہ بھی ہوتا ہے کہ میں تم لوگوں کو کھلا پلا نہیں سکتا۔ کوئی خاطر نہیں کر سکتا۔ مگر ٹھہرو...... حلیم کو آواز دیتا ہوں...... وہی تو ہے...... فرمانبردار...... خاندانی......"

"ح......ل......ی......م" کھانسی سے ابھرتی ہوئی آواز کمرے کے اندر ہی دم توڑ گئی...... عزیزالدین کی آنکھیں بھر آئیں۔۔ "مگر حلیم آئے گا کہاں سے...... حافظہ ساتھ نہیں دیتا۔ یادداشت کمزور ہو گئی ہے۔ سب کچھ بھول جاتا ہوں۔"

"کیا ہوا۔ حلیم کہاں ہے۔؟" قمر بھائی نے اکڑتے ہوئے پیر کو سیدھا کرتے ہوئے پوچھا۔

"حلیم نہیں رہا۔" عزیز بھائی کی آواز بیٹھ گئی۔ "مگر جی نہیں مانتا کہ وہ نہیں ہے۔ ہر بار لگتا ہے وہ یہیں کہیں موجود ہے۔ ابھی نکل کر سامنے کھڑا ہو جائے گا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے میں گھبرا جاتا ہوں تو اسے آواز دیتا ہوں...... مگر حلیم ہے کہاں جو آئے گا...... صدا لوٹ آتی ہے!"

"حلیم نہیں رہا۔" کمرے میں سناٹا پھیل گیا ہے۔

"اس کے کھلائے ہوئے پکوان اب تک یاد ہیں۔ کتنی خاطر کرتا تھا ہماری! کیسی میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ بھی تو ہم میں سے ہی ایک تھا۔ تن تنہا اور اکیلا۔" سمیع بھائی بولے۔

"حلیم کے قصے اب تک یاد ہیں۔ چٹخارے لے لے کر سنانے کا انداز۔ کیسی کیسی

باتیں کیا کرتا تھا۔ خبطی، کم بخت کبھی اپنے سے الگ نہیں لگا۔" قمر بھائی کی آواز بیٹھ گئی۔
"مگر حلیم کو ہوا کیا تھا؟"
"کچھ نہیں۔ نیک مرد تنہائی سے گھبرا گیا تھا۔ مرنے سے کچھ روز پہلے عجیب بہکی بہکی باتیں کرنے لگا تھا۔ ایک صبح جب چائے کے لیے اسے آواز لگائی تو کوئی آواز نہیں آئی۔ دل بیٹھ گیا۔ باورچی خانے کے پاس ہی چارپائی نکال کر وہ سویا کرتا تھا۔ وہاں چارپائی پر اس کا مردہ جسم پڑا تھا۔ کتنی مشکل پیش آئی تھی۔ کسی طرح محلے والوں کو تیار کیا۔ پیسے دیئے۔ انتظامات کئے۔ مگر خود اس کو کاندھا دینے نہ جاسکا۔" عزیز بھائی کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔
"کم بخت حلیم کو کتنے لوگ مل گئے تھے سہارا دینے کے لیے۔ ہماری خبر محلے والے کو کون دے گا......؟"
کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ جھری بھرے چہرے پریشانی میں ڈوب گئے۔
"خود ہی چائے بناتا ہوں، روٹیاں بناتا ہوں، ادھ جلی سبزیاں بنالیتا ہوں، اور کھالیتا ہوں۔ گوالا دودھ دے جاتا ہے۔ کبھی کبھی بغل سے فہمیدہ آکر صفائی کر جاتی ہے۔ بغل والے کا نوکر آکر بجلی کا بل بھر جاتا ہے۔ بس سارا کام اسی طرح ہو جاتا ہے۔ ہاں رات بڑی تکلیف میں گزرتی ہے۔"
"رات ہم سب کے لئے موت سے بدتر ہے۔" چاروں بوڑھے ایک ساتھ بولے۔ پھر چپ ہو گئے۔
حمید کانپتی آواز میں پھر بولے۔ "بس رات نہیں کٹتی یارو! دن تو کتابوں میں کٹ جاتا ہے رات نہیں کٹتی۔ آسیبی خیالات دماغ کو بوجھل بنا دیتے ہیں۔"
"ہم ہمیشہ سے اکیلے رہے۔" سمیع بھائی نے برسوں پرانی کہانی کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں، عزیز، مشتاق، قمر، احمد حسین اور حمید۔ سب اکیلے رہے۔ ہم میں خوش قسمت احمد حسین رہا جس نے اس دوستی سے بغاوت کی اور شادی کر لی۔ کہتا تھا

جب اکیلے پن میں تم لوگ تھک جاؤ تو ہمارے یہاں آ جانا۔۔۔ بیوی بچوں میں دل بہل جائے گا۔ مگر بد قسمت رہا احمد حسین بھی۔ شادی کے تین سال بعد ہی بیوی رخصت ہو گئی اور بیٹا بھی رخصت ہو گیا۔ ننھی منی سی جان کے مرنے پر کتنا رویا تھا۔ احمد حسین۔! پھر ہماری اس تنہا بزم میں شریک ہو گیا۔"

"احمد حسین ہے کہاں۔۔۔؟"

عزیز الدین نے کانپتے ہاتھوں سے اخبار کا بیچ والا صفحہ کھولا جس میں ایک بڑا سا اشتہار شائع ہوا تھا:

"میرے دوستو! اگر تم زندہ ہو اور اچھے حال میں ہو تو میں چاہتا ہوں کہ زندگی کی آخری عید تمہارے ساتھ مناؤں۔ میں تمہارے ہی شہر میں ہوں اور کچھ ہی دن پہلے آیا ہوں۔ مگر افسوس لاچار ہوں۔ مل نہیں سکتا۔ اگر یہ اشتہار میرے کسی بھی دوست کی نظر سے گزرے تو وہ باقی دوستوں کو اس کی خبر کر دے کہ احمد حسین زندہ ہے اور عجب حال میں ہے۔ آخری عید دوستوں کے ساتھ منانے کا خواہش مند ہے۔"

"وہ ہمارے ہی شہر میں ہے اور تنہا ہے۔"

سب پھر چپ ہو گئے۔ "اچھا ہو گا کہ ہم عید میں ہی اس سے ملیں اور حیرت میں ڈال دیں۔" بوڑھی آواز ہچکی کا شکار ہو گئی تھی۔

"احمد حسین زندہ ہے۔ مگر عید کیا یوں بھی آتی ہے کہ دبے پاؤں رخصت ہو جائے۔ کچھ خبر نہ ہو۔ نہ گھگھنی نہ پھلوڑی۔ نہ وہ رمضان کے ہنگامے نہ وہ افطار کی خوشبو۔ وہ مزے مزے کی حکایتیں، سب پرانے قصے ٹھہرے۔" قمر بھائی کہہ رہے تھے۔ "ایسے میں بچپن یاد آتا ہے عزیز بھائی! پھولوں کے بستر سے گزرا ہو بچپن۔ افطار کی خوشبو یاد آتی ہے اور عید کے ہنگامے...... مگر نوکری میں آنے کے بعد زندگی میں ایک بھی لمحہ ایسا نہیں آیا۔"

"آتا بھی کیسے ؟" سمیع بھائی بولے۔ "ہماری دوستی بے مثال رہی۔ اس لیے کہ ہماری کہانی ایک تھی۔ زندگی جینے کا طریقہ ایک تھا۔ ہم سب اپنے ماں باپ کی واحد اولاد تھے۔ ہم نے زندگی کا اہم ترین فیصلہ بھی ایک ساتھ کیا کہ شادی نہیں کریں گے۔ صرف احمد حسین نے اس رائے سے اختلاف کیا اور وہ بھی صرف تین سال بعد ہماری برابری میں آگیا۔"

"بیچارہ احمد حسین!"

پانچوں بوڑھے پھر چپی اوڑھ کر بیٹھ گئے۔ "احمد حسین کہاں ہوگا۔ ہاں یاد آیا۔ پتہ اسی گھر کا ہے جہاں پہلے رہتا تھا۔ دوسرے شہر میں نوکری کرنے کے باوجود اس گھر کو اس نے نہ کرائے پر چڑھایا نہ فروخت کیا۔ پنشن یافتہ ہونے کے کافی سال بعد پھر اسی شہر میں لوٹ آیا۔ مگر خبر تو کرنی چاہیے تھی۔"

"احمد حسین نے خبر کیوں نہیں کی......؟"

ہاں خبر کیوں نہیں کی؟

بوڑھے پھر سوالوں میں کھو گئے۔ بڑھاپے سے ابھرتے بہت سارے سوالوں پر کسی جواب کی مہر نہیں لگائی جا سکتی۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں نہیں کیا۔؟ نہ اعضاء ہی سلامت رہتے ہیں نہ شعور باقی رہتا ہے۔ ہاں اب سوال یہی ہے کہ عید کے روز ہمیں اچانک ایک ساتھ جا کر اسے حیران کر دینا ہے کہ بوڑھے صرف تم ہی نہیں ہم بھی ہیں اور آخری عید کیوں......جب اس شہر میں ہیں، تو بہت ساری عیدیں ابھی ساتھ ساتھ ہی منائیں گے......!"

حمید بھائی کے ساتھ ساتھ تمام بوڑھی آنکھوں میں چمک جاگ اٹھی۔

قمر بھائی نے آہستہ سے کہا: "ہم میں اب تک کتنا جوش ہے یارو جبکہ ہم میں سے تقریباً سبھوں کو ریٹائر ہوئے دس سال گزر چکے ہیں۔ گورنمنٹ سمجھتی ہے کہ ساٹھ سال کی عمر میں آدمی بوڑھا اور ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اور ایک دو سال میں موت اچک لیتی ہے۔ ہم نے ایک ساتھ گورنمنٹ اور موت دونوں کو بھیگا ہوا طمانچہ مارا ہے......"

"ہم میں سے ہر آدمی ابھی دس سال اور زندہ رہے گا۔" سمیع نے جوشیلی آواز میں کہا۔

بوڑھی آنکھیں ذرا دیر کو روشن ہو گئیں۔ پھر عزیز بھائی اندر گئے۔ کچھ میٹھا نمکین لے آئے۔ پھر خود ہی چائے بنائی۔ سب کو پیش کی۔ اس طرح بوڑھوں کی یہ محفل برخاست ہو گئی اور یہ بات طے پائی کہ عید کی نماز سے فارغ ہو کر وہ لوگ رکشے پر سوار ہو کر احمد حسین کے گھر کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔

پرانے راشن کی یاد تازہ کرتے ہوئے باقی چاروں بوڑھے تھکے ہارے قدموں سے اپنے اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔

اور یہ عید کی دوپہر کا قصہ ہے جب پانچوں بوڑھے ایک خستہ سے مکان کے دروازے پر رکشہ سے اتر رہے تھے۔ رکشے والے کو پیسہ تھماتے ہوئے حمید نے اپنی خشخشی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "پتہ نہیں احمد حسین اب کیسا ہو گا۔ پہچانے گا بھی یا نہیں؟"

"کیسے نہیں پہچانے گا۔ ہماری طرح ہی بوڑھا ہو گیا ہو گا۔"

"اس کی شادی بھی تو ہوئی تھی۔ ہم میں سب سے زیادہ بوڑھا وہی ہو گا۔" حمید بھائی نے پھیکا سا قہقہہ اچھالا۔ پھر ایک ساتھ سب کے ہاتھ دروازے پر دستک کے لیے اٹھ گئے۔ عزیزالدین نے دستک کے ساتھ صدا بھی لگائی۔

"احمد حسین ہم ہیں۔"

عید کی صبح بارش سے نہائی ہوئی جان پڑ رہی تھی۔ آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا۔

"اندر کوئی نہیں ہے کیا۔؟" بوڑھی آنکھوں میں تشویش جاگ اٹھی۔ پڑوس کے دروازے پر نا آشنائی کا کتا لوٹ رہا تھا۔

"دروازہ تو کھلا ہے۔ احمد حسین کو اندر ہی ہونا چاہیے۔" حمید بھائی نے رائے دی۔

"اکیلا آدمی ہے۔ دستک کیا دینا ہے۔ چلو اندر چلو۔ کہیں گیا بھی ہوگا، تو آجائے گا۔"

پھر پانچوں بوڑھے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ اندر گہرا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ دیوار سے خوفناک آنکھیں گویا جھانک رہی تھیں۔ سامنے ایک کمرہ تھا۔ اور کمرے میں بستر پر......!

بوڑھے جسم میں جیسے کسی نے نشتر اتار دیا ہو۔ سن سے رہ گئے پانچوں بوڑھے۔

"یہ اپنا احمد حسین ہے......"

جسم میں لرزہ سا طاری ہوا۔ تیز قدموں سے سب آگے بڑھے۔ پھر اپنی اپنی جگہ جیسے بت ہو گئے۔ احمد حسین کی آنکھیں خلاء میں تاک رہی تھیں۔ سرہانے کالی بلی بیٹھی تھی جو دیکھتے ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔ ٹیبل پر جلتی ہوئی اگر بتی کی راکھ پڑی تھی۔

"احمد حسین نہیں رہا۔!" حمید کی بوکھلائی ہوئی آواز غمزدہ ماحول میں لرز اٹھی۔ سمیع بھائی نے کانپتے ہاتھوں سے دوست کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے چہرے پر چادر کھینچ لی۔ پھر سب کے سب کانپتے ہوئے نیم مردہ وجود کے ساتھ زمین پر بت بن کر بیٹھ گئے جیسے اپنے ہوش و حواس بحال کر رہے ہوں۔ کمرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ کافی دیر بعد عزیز بھائی نے جھریوں سے جھانکتی بدحواس بوڑھی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا:

"عید کا دن احمد حسین کے لیے خوش قسمت ثابت ہوا ہے۔ لگتا ہے آج صبح ہی اس کی موت ہوئی ہے۔ جلتی ہوئی اگر بتی کی راکھ اس بات کی گواہ ہے ــــــ مرنے والے کو اپنی موت کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے خود ہی اگر بتی جلائی اور چادر اوڑھ کر سو گیا۔ خوش قسمت تھا احمد حسین کہ اسے سہارا دینے کے لیے ہم آگئے ہیں مگر......"

بوڑھی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ باہر کافی ٹھنڈ تھی اور اس وقت ان کے چہرے بھی برف لگ رہے تھے۔ ٹھنڈے اور بے جان سے۔

OO

شیرازہ۔۱۹۸۰ء

پار

شاپنگ سے لوٹتے ہوئے اچانک روبینہ سے میری ملاقات ہو گئی تھی۔ ایک طویل مدت کے بعد میں اسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے تک تو میں بغیر کچھ کہے اسے تکتا رہا۔ اس موقع پر بھی مجھے اسی کا کہا ہوا وہ جملہ یاد آرہا تھا جو اس نے آخری ملاقات میں کہا تھا......

"تم دیکھ لینا، ہم زندگی میں کہیں نہ کہیں ضرور مِلیں گے۔ اور جب ملیں گے تو وقت بہت آگے بڑھ چکا ہوگا۔ ہم زندگی کی اس بھیڑ بھاڑ میں بہت پیچھے چھوٹ چکے ہوں گے۔"

شاید روبینہ نے سچ ہی کہا تھا۔ وقت بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ عمر کی گزرتی ہوئی ہوا نے جہاں میرے اوپر فرض اور ذمہ داری کی چادر ڈال دی تھی، وہاں اس کے چہرے پر فلسفے کی کتنی ہی لکیروں کو نمایاں کر دیا تھا۔۔۔ہاں! فلسفے نے ہی تو ہمیں الگ کیا تھا۔

اس وقت بھی روبینہ سفید ساری میں لپٹی ہوئی مجھے کوئی فلسفہ معلوم ہو رہی تھی۔ آنکھوں پر چشمہ چڑھ گیا تھا۔ ہاتھ میں بڑا سا بیگ تھا——— خواہش تھی کہ ایک ہی سانس میں دنیا بھر کی باتیں کر لوں۔ مثلاً تم یہاں کیسے؟ اس شہر میں کیسے؟ شادی کی یا نہیں؟ فلسفے تمہاری زندگی سے الگ ہوئے یا نہیں؟ مگر نہیں، اس کی جادو جگاتی شخصیت کا یہ اثر تھا کہ میں کچھ لمحے تک بغیر کچھ کہے سنجیدہ چہرے پر نمودار ہونے

والے تغیر کو پڑھتا رہا۔۔۔

"کیسی ہو؟" بہت دیر بعد میں نے پوچھا۔

"اگر یہ کہوں کہ اچھی نہیں ہوں تو تم پھر سوالوں کے لمبے سلسلے کا آغاز کر دو گے۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ میں یہ کہوں کہ زندگی کو اب بھی سمجھنے کی کوشش میں لگی ہوں۔" بالوں کی لٹ کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے روبینہ بولی۔

میں اس کی اس بات پر مسکرا دیا۔ "برا نہ مانو روبینہ تو میں یہ کہوں گا کہ اب تک تمہیں زندگی کو پوری طرح سمجھ لینا چاہیے تھا۔ وقت ضرور بدلا، لیکن تم نہیں بدلیں۔ وہی لہجہ، وہی انداز......"

"مگر بہت کچھ پرانا ہو گیا ہے اب۔" روبینہ ہنسی۔ "خیر یہ بتاؤ۔ تم یہاں کیسے؟"

"میں اس شہر میں سات سال سے ہوں۔ یہیں سروس کرتا ہوں۔ مگر تم؟"

"میں یہاں ویمنس کالج میں لیکچرر ہو گئی ہوں۔"

"فلسفے کی؟" میں نے قدرے چونکتے ہوئے اور ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ فلسفہ میں ہی میں نے پی ایچ ڈی کی ہے۔"

"تو اب ڈاکٹر بھی ہو گئی ہو!" میں پھر مسکرا لیا۔ مگر سنجیدہ ہو گیا۔ کچھ دیر تک بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر بولا۔ "روبینہ، یہ بات جانے پہلے بھی تم سے کتنی ہی بار کہی ہے اور آج پھر کہوں گا۔ زندگی کے اپنے مسئلے فلسفے سے کبھی حل نہیں ہو سکتے۔ خیر، تم یہ بتاؤ۔ تم نے شادی کی؟"

"نہیں۔" روبینہ کا ٹھہرا جواب تھا۔ میں ایک لمحے کو سناٹے میں آ گیا۔ شاید مجھے اس سے اس جواب کی امید نہ تھی۔ اور روبینہ ویسی ہی سنجیدگی کے ساتھ آڑی ترچھی بے شمار لکیروں کے درمیان کہے جا رہی تھی، "شادی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ میں ہمیشہ سے شادی کے خلاف رہی تھی۔ شادی عورت کی موت ہے۔ شادی سے عورت کی اپنی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ مرد کی لونڈی بن جاتی ہے۔ اس کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ یہاں تک کہ اس کی ذات کا نصف حصہ بھی مرد چھین لیتا

ہے۔ اسی لیے شادی نہیں کی۔ مگر میں اپنی اس زندگی سے مطمئن ہوں۔ کوئی فکر نہیں۔ یہاں میں نے ایک فلیٹ لے لیا ہے۔ کام کرنے کے لیے ایک عورت ہے۔ بس دو آدمی کافی ہیں۔ زندگی میں جتنی باتیں ہونی چاہئیں، ہم دونوں کر لیتے ہیں۔"

روبینہ نے ایک بار مجھے پھر حیران کر دیا تھا۔ کیسی پاگل لڑکی ہے! میں نے سمجھا تھا کہ وقت نے اب تک اسے بدل دیا ہوگا۔ مگر وقت کے ساتھ اس کی فلسفیانہ بصیرت میں مزید قوت آگئی تھی۔ چہرے پر اگی ہوئی آڑی ترچھی لکیریں جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں: میں اپنے انداز میں جینے پر یقین رکھتی ہوں۔ دیکھ لیا نا؟ میں آج بھی اپنے آپ سے مطمئن ہوں۔ میں نے اپنے لیے الگ طرح کی ایک زندگی پسند کی ہے۔ اور اپنے طور پر جئے جا رہی ہوں۔

اس دن میں نے کافی اصرار کیا کہ وہ میرے ساتھ گھر چلے، میری بیوی سے ملے، میرے بچوں کو دیکھے۔ مگر روبینہ نے مصروفیت کا بہانہ بنا دیا۔ اور کہا کہ وہ کسی اور روز ضرور آئے گی۔ سب سے جی بھر کر ملے گی۔ جی بھر کر باتیں کرے گی۔

مجھے اس نے اپنا پتہ بھی دیا۔ میں نے بھی وعدہ کر لیا کہ موقع ملتے ہی اس کے گھر ضرور آؤں گا۔ گھر آکر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ زیبا کو روبینہ کے متعلق بتا دیا۔ زیبا مجھ پر بگڑ گئی۔ "اسے گھر کیوں نہیں لائے؟"

"آج بھی وہ ویسی ہی پاگل ہے۔ مگر کہہ گئی ہے کہ کسی روز ضرور آئے گی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ آئے گی؟"

میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "یہ بات کسی اور نے کہی ہوتی تو شاید یقین نہ آتا۔ لیکن یہ بات روبینہ نے کہی ہے اس لیے مجھے یقین ہے۔"

وقت کے ساتھ سب کچھ کتنا بدل جاتا ہے۔ کبھی کبھی عجیب سا لگتا ہے ــــ گھر آنگن میں دوڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچے اچانک بڑے ہو گئے۔ شہر بدل گیا، لوگ

بدل گئے۔ پرانی یادوں سے زندگی کا کتنا گہرا لگاؤ ہوتا ہے۔ روبینہ کی کسی بات نے مجھے متاثر کیا تھا تو وہ تھا اس کا خاموش رہنا اور دوسری لڑکیوں کی طرح بے کار کی باتیں نہ کرنا ۔۔۔ بچپن سے ہی شاید اس نے اپنے لیے ایک خاموش زندگی پسند کرلی تھی۔ بھیڑ بھاڑ سے الگ زندگی۔ کالج کے دنوں میں روزانہ اس سے ملاقات ہو جاتی۔ فرصت کے وقت میں بھی وہ چپ چاپ لائبریری میں بیٹھ کر کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہوتی۔ اسے پتہ بھی نہ چلتا کہ میں کب آیا۔ کب اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

بڑی بڑی آنکھیں اچانک چونکنے کے انداز میں میری طرف اٹھ جاتیں...... "تم کب آئے؟"

میں مسکراتے ہوئے کہتا۔ "تمہیں اس کی خبر ہوتب نا۔ تم بس کتابوں میں۔۔۔"

"کتابیں میری جنت ہیں۔" روبینہ مسکرانے کی کوشش کرتی۔ "میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کتابیں پڑھ لینا چاہتی ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ جب محسوس کروں کہ میرا آخری وقت آگیا ہے تو مجھے یہ سوچ کر رنج نہ ہو کہ میں نے کچھ سیکھا نہیں۔، کچھ جانا نہیں۔"

میں اس بے تکے جواب پر کہتا "مگر روبینہ، تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ فطرت نے چاند ستارے بھی تو بنائے ہیں۔ یہ حسین نظارے بھی تو ہیں جن کے لیے آنکھیں دی ہیں۔ محسوس کرنے کے لیے دھڑکنے والا دل دیا ہے۔"

روبینہ منہ بنا کر کہتی "دل کی بات میں نہیں جانتی۔"

پاگل لڑکی کی ان ہی باتوں نے تو مجھے اس کے قریب کر دیا تھا۔ جس دن روبینہ نہ آتی، کالج میں دل ہی نہ لگتا۔ مجھے یاد ہے ایک بار وہ کئی روز تک کالج نہیں آئی تھی۔

ہمیشہ کی طرح کالج آتا۔ ادھر ادھر کا چکر لگاتا رہتا۔ کلاس بھی اٹینڈ نہ کرتا۔ یوں ہی واپس گھر لوٹ جاتا۔ کئی روز بعد جب وہ نظر آئی تو چہرہ کچھ زرد زرد سا تھا۔ پوچھنے پر کہنے لگی۔ "ممی اب اس دنیا میں نہیں رہیں...... میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں آنسوؤں کی یورش نہ تھی، بلکہ ایک ٹھہراؤ تھا۔۔۔ ایک ٹھنڈا پن تھا۔

"تم نے مجھے خبر نہیں کی روبینہ ؟" میں نے بہت دھیرے سے پوچھا۔

"اس میں خبر کرنے کی کون سی بات تھی؟" روبینہ کے لہجے میں آگ روشن تھی۔ وہ نظریں جھکائے کہہ رہی تھی۔ "میں نے پہلی بار موت دیکھی ہے، پہلی بار، موت کو اس طرح سفید کفن پہنے ہوئے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اور جب دیکھا تو میری آنکھوں نے آنسوؤں کا لباس نہیں پہنا، بلکہ ممی کی موت الٹا مجھے ایک پیغام دے گئی۔ یہ تمام رشتے محض دکھاوا ہیں۔ اپنی پر ہول تنہائی سے گھبرا کر ایک دنیا آباد کر لی جاتی ہے۔ یقین مانوگے، صرف تین روز بعد میں نے دیکھا کہ ابی کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ ہاں، ابی ہنس رہے تھے جو ممی کو بہت چاہتے تھے۔ اتنا چاہنے والے ابی ہنس رہے تھے! تم ہی بتاؤ، یہ رشتے کی کیسی کمزوری ہے۔ صرف تین روز بعد ہی ہمیشہ ساتھ رہنے والی امی کے جاتے ہی ابی کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آگئی تھی۔ کیا صرف تین روز میں ہی ابی کے احساس سے امی جدا ہو گئیں؟"

اس کی بات سن کر کچھ دیر کے لیے میں سناٹے میں آگیا تھا۔ روبینہ خاموش تھی۔ اس کی گہری جھیل جیسی آنکھوں میں شعلے لرز رہے تھے۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "تم غلط سمجھ رہی ہو، روبینہ۔ تم نے سب کچھ غلط سمجھا۔ اپنے طور پر ساری باتوں کو غلط انداز سے لیا۔ موت سے یہ احساس پلتا ہے کہ ہم بھی یہاں ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آئے۔ مگر پرانی یادوں کو سمیٹے ہوئے بھی تو ہم نہیں جی سکتے۔ تمہارے ابی نے بھی تو یہی کیا۔ صرف تین روز بعد انہوں نے تمہارے لیے، ہاں تمہارے لیے جینے کی ضرورت محسوس کی ہوگی۔ اور اسی لیے، تمہارا غم بہلانے کے لیے انہیں مسکرانا پڑا ہوگا۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں۔؟"

مگر روبینہ بضد رہی۔ "میں رشتے کے کھوکھلے پن کا راز جان چکی ہوں۔ کم از کم شوہر اور بیوی کے رشتے میں اتنا تال میل تو ہونا ہی چاہیے کہ ایک مر جائے تو دوسرا جیتے جی زندگی کو موت بنالے اور کبھی مسکرائے نہیں ——— تم خود ہی دیکھ لوگے۔ مجھے ممی عزیز تھیں، اس لیے میں ممی کے بعد......"

میں نے اس کی جانب غور سے دیکھا ـــــ روبینہ پلٹ کر آگے بڑھ گئی تھی۔ اس درمیان وقت نے کتنی ہی کچی پکی اینٹوں کی عمارتیں کھڑی کر دیں۔ مگر اس دن کے بعد میں نے کبھی روبینہ کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا، کبھی ہنستے ہوئے نہیں پایا۔ ایک بار بڑی مشکل سے میں نے اس سے شادی کی بات بھی کی تھی، جس پر وہ سختی سے بگڑ گئی تھی۔ ''دوبارہ یہ لفظ منہ سے نہ نکالنا۔'' میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اپنی زندگی میں رنگ گھولنے کے لیے مجھے روبینہ کو بھولنا ہی ہوگا۔ کالج چھوڑے ایک مدت ہو گئی۔ میرے سارے دوست ایک ایک کر کے زندگی کے الگ الگ دروازوں کی جانب مڑ گئے۔ سب نے اپنا اپنا الگ الگ راستہ پسند کر لیا۔ اس درمیان مجھے روبینہ کی کچھ خبر نہ مل سکی۔ زیبا میری زندگی میں آگئی۔ دو بچے ہوئے۔ ایک چھوٹا سا خاندان لے کر میں اس شہر میں آباد ہو گیا اور پھر دس سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔

اب روبینہ سے اچانک ملاقات نے گزرے ہوئے دس برسوں کو ایک بار پھر زندہ کر دیا تھا۔ دس سال بہت ہوتے ہیں۔ میں اب اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ ندیم اور پنکی کی شوخیوں سے گھر ہر وقت گلزار رہتا۔ زیبا کی میٹھی میٹھی باتوں نے گھر کو انتہائی حسین بنا دیا تھا۔ ہاں کبھی کبھی گزری ہوئی کہانی میں روبینہ کی جھلک ضرور دیکھتا۔ روبینہ جو فلسفے کی طرح سمجھ میں نہیں آئی اور میں نے جس کے فلسفے کو قبول نہیں کیا۔ برسوں بعد روبینہ کو دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی تھی، یہ میں ہی جان رہا تھا۔ مگر پتہ نہیں کیوں۔ یہ غم تھا کہ روبینہ نے سچ کے نام پر ایک ٹیڑھا میڑھا راستہ چنا ہے۔ ڈر ہے وہ اس راستے سے بہت دور نہیں جا سکے گی۔ آج بھی اسے سمجھانے والا کوئی نہیں رہا ہے۔ زیبا بھی کبھی کبھی اداس ہو جاتی ہے کبھی کبھی چھیڑنے کے موڈ میں کہتی: ''تم بھی عجیب شخص تھے۔ ایک دم اس سے جدا ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ کچھ دن اور لگے رہتے تو شاید وہ تمہاری بات مان جاتی۔'' اس چھوٹے سے مذاق پر بھی پتہ نہیں کیوں اندر کچھ درد سا ہونے لگتا ہے۔ اب کافی دیر ہو گئی تھی۔ ندیم ۵ سال کا تھا۔ پنکی ابھی تین ہی سال کی تھی۔ دونوں جب بھی گھر میں ہوتے، گھر دیکھنے کے لائق رہتا۔ توڑ پھوڑ کی کارروائی

چلتی رہتی۔

بعض دفعہ زیبا بگڑ جاتی۔ "کوئی چیز بھی بچے قرینے سے رہنے نہیں دیتے۔ ہر چیز توڑ ڈالتے ہیں۔"

میں کہتا "اسی لیے تو لاتا ہوں، پرانی چیزیں ٹوٹیں گی نہیں تو نئی کہاں سے آئیں گی؟"

زیبا آنکھیں دکھاتی۔ "تم نے ہی بچوں کو بگاڑ دیا ہے۔"

جب سے روبینہ سے ملاقات ہوئی تھی، اٹھتے بیٹھتے زیبا روبینہ کا تذکرہ لے کر بیٹھ جاتی۔ "وہ آئی نہیں؟ ہم ہی ان کے گھر چلتے ہیں۔" مگر پتہ نہیں کیوں مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ روبینہ نے وعدہ کیا تھا تو اسے آنا چاہیے تھا۔ اور ایک روز یکایک وہ سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

-

اتوار کا دن تھا۔ صبح کے دس بجے ہوں گے، ندیم اور پنکی دونوں باہر فرش پر بیٹھے کیرم بورڈ کھیل رہے تھے۔ میں دالان میں بیٹھ کر اخبار الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ اچانک ندیم دوڑتا ہوا آیا۔۔۔ "پاپا! کوئی عورت آپ سے ملنے آئی ہیں۔"

زیبا اچانک بڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور جلدی جلدی بستر کی چادر ٹھیک کرنے لگی۔ میں تیزی سے باہر آیا، روبینہ ہی تھی۔۔ ننھی پنکی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ پوچھ رہی تھی۔ میں اس کی آنکھوں میں پہلی بار ایک عجیب سی چمک دیکھ رہا تھا۔

"تم آگئیں؟"

روبینہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے پنکی سے پوچھا۔ "یہ تمہارے ڈیڈی ہیں؟"

"ہاں۔" پنکی معصومیت سے بولی۔

"تمہاری بچی بڑی پیاری ہے۔" روبینہ اب مجھ سے مخاطب تھی اور پہلی بار مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے وہ فلسفوں کے گھر کا راستہ بھول گئی ہے۔

"اندر آؤ روبینہ۔"

کمرے میں زیبا ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے کھڑی تھی۔ "بیٹھئے نا۔"

روبینہ بیٹھ گئی۔ ندیم اور پنکی جیسے برسوں کے شناسا بن گئے تھے۔

"آنٹی، آپ کو کیرم آتا ہے؟ ہمارے یہاں ٹی وی بھی ہے، آنٹی۔ کلر ٹی وی آج شام کو ہمارے یہاں ہی رہیئے نا۔ آج سنڈے ہے۔ ٹی وی پر بڑی اچھی سی فلم ہے۔ ہم ساتھ ہی دیکھیں گے۔"

پھر ندیم باہر کیرم بورڈ گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا۔ "آنٹی چلیے نا، کھیلئے۔۔۔"

"اف!" تم لوگ تو تنگ کر دیتے ہو! آنٹی ابھی آئی ہیں اور پریشان کرنا شروع کر دیا!"

"بچوں کو ڈانٹنا نہیں۔" روبینہ نے میری طرف دیکھا۔ "بڑے پیارے بچے ہیں۔" اتنا کہہ کر اس نے ندیم کو اپنے سے قریب کر لیا "میں ضرور تمہارے ساتھ کیرم کھیلوں گی اور کیرم ہی کیوں، پتنگ بھی اڑاؤں گی۔"

پنکی اب اس کی گود میں چڑھ گئی تھی۔، زیبا چائے بنانے کے لیے اس درمیان اندر چلی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد چائے کی ٹرے لے کر وہ کمرے میں حاضر تھی۔

روبینہ نے آگے بڑھ کر ٹرے اس کے ہاتھ سے لے لی۔ "میں مہمان نہیں ہوں، زیبا۔ تم نے اس تکلف میں پورے پانچ منٹ لگا دیے۔ پانچ منٹ میں ہم کتنی باتیں کر لیتے"

زیبا مسکرا اٹھی۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ روبینہ کی بے تکلفی، زیبا کی جھکی جھکی ممنون آنکھیں۔ ان میں ایسا کچھ ضرور تھا جو مجھے بے چین کر رہا تھا۔ میں صرف روبینہ کی حرکات سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ روبینہ اور زیبا دونوں ایک دوسرے سے گھلی ملی جا رہی تھیں۔ وقت نے روبینہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ میری کوئی غلطی نہ تھی مگر اس کے باوجود مجھے ناکردہ جرم کا احساس ہو رہا تھا۔ زندگی کی بتیس بہاریں تو رخصت ہو گئی تھیں مگر ان بتیس برسوں میں روبینہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کھوتی رہی

تھی۔ پاپا کیا تھا؟ ایک اکیلی زندگی۔۔۔ مگر آج روبینہ کی آنکھیں پتہ نہیں کیوں کچھ روشن سی نظر آرہی تھیں۔ اتنے میں ایک چھناک کی آواز آئی ــــــ زیبا نے غصے میں دیکھا، ندیم نے کھڑکی پر چڑھ کر گل دان توڑ دیا تھا۔"

"اترو! وہاں سے اترو!" زیبا نے غصے میں پکارا۔

"چھوڑو بہن۔" روبینہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر پیار اتر آیا تھا۔ وہ بغیر چوڑیوں کے سخت ہاتھوں کو ندیم کی جانب بڑھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "ٹھیک سے اترنا بیٹے۔۔۔ شیشے چبھ جائیں گے۔"

یہ منظر میرے لیے اتنا ہی دل چسپ تھا جتنا الف لیلوی قصوں اور طلسم ہوش ربا جیسی داستانوں کے ہر پل چونکاتے ہوئے منظر ہو سکتے ہیں۔ ندیم گل دان شہید کرنے کے بعد اب روبینہ کی گود میں بیٹھ گیا تھا۔ پتہ نہیں کیا سوچ کر روبینہ کی آواز تھرا گئی تھی۔

"یہ پہلی بار ہے نا؟ یہاں پہلی بار آئی ہوں نا؟ ان بچوں سے بھی پہلی بار مل رہی ہوں۔ ان بچوں سے کیا، شاید کسی بھی بچے سے پہلی بار مل رہی ہوں تو بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔ میرے گھر میں کوئی بچہ نہیں، اس لیے کہ میں نے شادی نہیں کی۔"

روبینہ کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔ ذرا ٹھہر کر اس نے زیبا کو دیکھا۔ پھر نظریں جھکالیں۔ "اس لیے معلوم ہے۔ میرے گھر کبھی کوئی نئی چیز نہیں آتی۔ جانتی ہو کیوں؟ اس لیے کہ کوئی چیزوں کو توڑنے والا نہیں ہے۔ کبھی ہفتوں چادر بدلنے کی نوبت نہیں آتی۔ کوئی مہمان بھی نہیں آتا جو چیز جیسے ہے، بس ویسے ہی پڑی رہتی ہے۔"

چائے پیتے ہوئے اچانک میں پتھر کی مورتی میں بدل گیا۔ اچانک بولتے بولتے روبینہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بچوں کو اپنی آغوش میں بھرتے ہوئے کہہ رہی تھی: "پہلی بار ان بچوں میں...... بہت کچھ پالیا ہے میں نے۔ اور پاکر محسوس کیا ہے کہ زندگی کے کتنے ہی قیمتی لمحے مجھ سے بچھڑ گئے ہیں۔"

آنسو پونچھتے ہوئے وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ پھر غور سے زیبا کو دیکھتے ہوئے

بولی۔ "تم آؤ گی میرے گھر، ان بچوں کو لے کر؟ اس دن میں پورے گھر کو کھلونوں سے بھر دوں گی اور بس ان بچوں کا کھیل دیکھتی رہوں گی۔"

روبینہ چپ ہوئی تو میں نے دیکھا کہ زیبا رو رہی ہے۔ زیبا سے شاید جذبات روکے نہیں گئے تھے۔ بچے حیرت سے ہم تینوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ مگر اس کے باوجود میں مطمئن تھا۔ برسوں بعد فلسفے کے نقاب کو روبینہ کے چہرے سے ہٹتے ہوئے اور اس کی جگہ ایک عورت کو اس کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ زیبا کی طرح ہی ایک عورت کو۔

OO

بانو، سہیل۔۱۹۷۹ء

حد

(۱)

شام کی ہتھیلیوں پر کیکٹس اگ آئے تھے۔ میں پہلی بار نریمان سے مل رہا تھا۔ چند روز قبل ہی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اور پھر یہ ملاقات اچانک ہی دوستی میں بدل گئی اس نے مجھے اپنے گھر مدعو کیا تھا۔

گھر کے دروازے پر آکر میرے قدم کچھ پل کے لیے ٹھہر گئے تھے۔ اور میں چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ پہلی نظر میں ہی وہ مجھے جانور لگا تھا۔ اپنی سوکھی ٹانگوں پر سارے جسم کا بوجھ ڈھوتے ہوئے، جانوروں کی طرح لنگڑاتا ہوا، سکھڑے ہاتھوں میں بھیگا کپڑا لیے ہوئے وہ فرش صاف کر رہا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں جانوروں سی عادتیں شامل تھیں۔ ایک ٹانگ تو کچھ ٹھیک بھی تھی۔ دوسری پتلی سوکھی بالکل مریل سی۔ ایک نظر میں ہی وہ کسی کے لیے بھی نفرت کا مستحق بن سکتا تھا۔ اس لیے پہلی نظر میں میرا اسے جانور سمجھنا کسی بھی حالت میں غیر فطری نہ تھا۔ نظریں نیچی کیے ہوئے دائیں پیر، کو ایک طرف پھیلائے وہ اب بھی اپنے کام میں مشغول تھا۔ نریمان سے ملنے کی کشش کچھ دیر کے لیے بجھ گئی تھی۔ اور میں اس جانوروں کی طرح زندگی گزارنے والے شخص کی طرف دیکھنے لگا تھا ـــــ ایک بات جو مجھ میں سب

سے عجیب لگی وہ اس کا پہناوا تھا۔ لال صاف جانگھیا۔ اجلی صاف بنیان، چپڑے ہوئے بال۔ اور اسی بات نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ نریمان کا کون ہے یہ؟ کوئی رشتہ دار؟ نوکر؟ عمر میں بھی وہ نریمان سے تین چار سال بڑا ہی محسوس ہوا۔ ایسے لوگوں کو جب بھی مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، ان کی حرکات و سکنات، اٹھنے بیٹھنے سب میں ایک اٹھنگا پن، بے ترتیبی سی پائی ہے۔ جیسے بکھرے بال۔ گرد سے اٹا ماتھا۔ میلے کچیلے بدبو دیتے ہوئے کپڑے —— لیکن پہلی نظر میں ہی وہ اپنے جیسے اور لوگوں سے بالکل الگ لگا تھا۔ تیل چپڑے ہوئے بالوں میں سلیقے سے کی گئی کنگھی اور صاف ستھرا لباس —— یہی چیزیں ایسی تھیں جو مجھے بے چین کر رہی تھیں اور میں اس کی حیثیت نریمان کے کسی رشتے دار کے روپ میں محسوس کر رہا تھا۔

میری آنکھیں اس کے جسم میں گڑنے لگی تھیں۔ اس نے اپنا سکھڑا ہوا ہاتھ زمین پر ٹیک دیا۔ اور گردن گھما کر پہلی بار میری طرف انجان نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ جیسے پوچھ رہا ہو۔ کون ہیں آپ۔ کسے کھوجتے ہیں۔؟

اس کا رنگ کھلتا ہوا سانولا تھا۔ دانت بڑے بڑے تھے۔ جو بدنما لگ رہے تھے۔ اور اس کا چہرہ جذبات کی نرمیوں سے محروم تھا۔

"نریمان ہے؟"

میں نے خاموش نظروں سے اسے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔ اور بدلے میں اس کے دانتوں کی بتیسی باہر آ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

"دیکھتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر بھیگا ہوا کپڑے کا ٹکڑا اس نے وہیں زمین پر رکھے بنچ کے نیچے رکھ دیا۔ پھر اپنے سکھڑے ہاتھوں سے بنچ کا سہارا لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جانوروں کی طرح لنگڑاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ میری آنکھیں اب بھی ایک ٹک اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اور پہلی بار میرے ذہن میں ایک عجیب سا سوال کوندا۔ جس سے میرے دل کے باریک تار جھنجھنا گئے۔

"اپنے آگے پھیلی لمبی زندگی کو اپنی پتلی سوکھی ٹانگوں پر کیسے اٹھاپائے گا یہ جانور؟"

ایسے لوگوں کو خدا پیدا ہی کیوں کرتا ہے؟ جو زندگی کا اصلی مزہ لینے سے محروم رہ کر زندگی ڈھونے کی ناکام سعی کرتے ہیں۔ جانوروں کی طرح زندگی گزارنے والے اس شخص کی زندگی محض گھر کی چہار دیواری میں قید آدمی سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے۔ باہر کی گہما گہمی اور دوڑتی ہوئی زندگی کا شاید اسے تصور بھی نہ ہو۔ ایسے لوگ جو جینے کے معاملے میں موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور کسی طرح خود کو گھسیٹتے گھسیٹتے اپنی زندگی کی نیا کو پار لگانے کی کوشش میں محور ہتے ہیں۔

ایسے لوگ کیوں پیدا ہوتے ہیں؟

دروازے پر نریمان کو دیکھ کر میں واپس اپنی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ نریمان بڑی گرم جوشی سے ملا۔ پھر مجھے اندر لے گیا۔ وقتی طور پر میں پوری طرح بکھر چکا تھا۔ نریمان سے بات چیت کے دوران بار بار میری نظریں دروازے سے باہر رینگتی رہیں۔ شاید وہ جانور اچانک کسی کام سے نکل کر باہر آجائے اور نریمان سے اس کے بارے میں ساری باتیں دریافت کی جا سکیں۔

مگر اس دن آخر وقت تک وہ باہر نہیں نکلا تھا۔ اور اس کے بارے میں کچھ بھی دریافت کرنے کے لیے میں خود کو تیار نہیں کر سکا۔

(۲)

پھر میں نریمان سے اکثر ملنے لگا۔ جب بھی فرصت ملتی یا کوئی کام نہیں ہوتا تو میں اس کے گھر پہنچ جاتا۔ آواز لگاتے ہی اس کے چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کی فوج میرے آگے پیچھے ہونے لگتی۔ مگر میری نگاہیں ان سب سے الگ اسے تلاش کرنے لگتیں۔ اس کو لے کر میرے دل میں ایک عجیب سی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ میں جب

بھی جاتا، اسے کسی نہ کسی کام میں مشغول دیکھتا۔ کبھی وہ دادا جی کے پیروں میں تیل مالش کر رہا ہوتا۔ کبھی فرش دھو رہا ہوتا۔ کبھی برتن مانجھنے میں مشغول ہوتا۔ میں اس کی لگن اور محنت کو یکسوئی سے دیکھتا۔ صبح ہوتے ہی ہمیشہ کی طرح وہ چولہا چوکی سنبھال لیتا اور رات گئے تک وہ اپنے ختم نہیں ہونے والے کاموں میں لگا رہتا۔

نریمان کے گھر میں میری موجودگی بچوں کی طرح اسے بھی پاگل کر دیتی تھی۔ اور بار بار کسی نہ کسی کام کو لے کر میرے کمرے کے آس پاس کا چکر ضرور لگا جاتا۔ کبھی جھاڑو لے کر فرش جھاڑنے کے لیے، کبھی کوئی چیز ڈھونڈنے کے لیے۔ اس کی آنکھوں میں نوخیز چمک ہوتی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کنکھیوں سے دیکھ رہا ہو۔ اور بچوں کی طرح میرے کھیل میں شریک ہونا چاہتا ہو اور اپنے ذریعے مقرر کی گئی حد توڑنا چاہتا ہو۔ ماں کی طرح، بچوں کی طرح، نریمان کی طرح گھنٹوں مجھ سے باتیں کرنا چاہتا ہو۔ مگر شاید نہیں۔ ایسے موقع پر مجھے لگتا جیسے اس نے اپنے، اپنے گھر، اپنے اور میرے بیچ، اپنے اور سماج کے بیچ، ایک حد مقرر کر دی ہو۔ ایک ایسی حد، جسے وہ لانگھ نہیں سکتا۔ توڑ نہیں سکتا۔

اور پھر ایک دن میں خود کو روک نہیں پایا۔ نریمان سے اس کے بارے میں پوچھ ہی ڈالا۔ نریمان چند لمحوں تک غنودگی کے عالم میں میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں کی چمک مانند پڑ گئی تھی۔ اور ہونٹوں کو جیسے سکتہ مار گیا ہو، ایک عجیب سا انفریٹی کمپلکس اس کے چہرے سے جھانک رہا تھا۔ جیسے وہ اس جانور کے بارے میں کچھ بھی باتیں کرنا پسند نہ کرتا ہو۔

پھر ایک طویل خاموشی کے بعد وہ میری طرف مڑا۔ ایک گہری سرد سانس بوجھل فضا کے حوالے کی۔۔۔ ''وہ میرا بھائی ہے۔ میرا اپنا بڑا بھائی ــــــ''

نریمان خاموش ہوا تو مجھے اپنے سارے جسم میں ہزاروں چیونٹیاں سرسراتی ہوئی محسوس ہوئیں ــــــ غیر یقینی طور پر مشتبہ انداز میں، میں نے نریمان کی طرف دیکھا۔ شاید سوال کے تیکھے زہر نے اس کے معصوم جذبوں میں ہل چل مچا دی تھی۔

میں نے نریمان کی طرف ایک بار پھر اچٹتی نظر ڈالی۔ اس کے خوبصورت پہناوے پر نظر دوڑائی، اور اس کی شخصیت کے سامنے اس سوکھے سکھڑوے وجود کو لا کھڑا کیا۔ اور دفعتاً مجھے لگا وہ جانور پوری طرح ننگا ہو گیا ہے اور نئی تہذیب کے رکھوالوں نے اپنے گھر میں ایک جانور پال لیا ہو۔ جس کی حیثیت اپنے لوگوں کے بیچ ایک معمولی پرندے سے زیادہ نہ ہو۔ نریمان نے شاید میرے مشکوک لہجے کو بھانپ لیا تھا۔ اور ان چند لمحوں کے اندر اس نے اپنے اندر بلا کی ہمت جٹالی تھی۔

"بچپن میں یہ ایسا نہیں تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ جب یہ پیدا ہوا تھا۔ اس وقت اس کے دونوں ہاتھ کئی دنوں کے سوکھے ہوئے گوشت کی طرح بے حس اور بے جان تھے بہت علاج ہوا۔ مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ مگر ان دنوں اس کا پیر ایسا نہیں تھا۔ اچانک ہی اسے پولیو کی بیماری لگ گئی تھی۔"

نریمان کے چہرے پر اداسی کی لکیریں روشن ہو گئی تھیں۔

"بچپن میں ابھئے اتنا شرارتی تھا کہ سب کا ناک میں دم رہتا تھا۔ گھر کے پچھواڑے جو بڑا سا میدان ہے۔ وہیں دن رات اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلا کرتا۔ کبھی او کسی سے چکا گھماتا۔ کبھی گلی ڈنڈا کھیلتا۔ اور کبھی آوارہ بچوں کے ساتھ گولیاں کھیلتا ہوا پایا جاتا۔ ہاتھ کے سکھڑے ہونے کے باوجود بھی ابھئے بہ آسانی سارے کھیلوں میں شریک ہوتا تھا۔ اس وقت اس کا ہاتھ آج کی طرح بے حس اور لاچار نہیں تھا۔ وہ میدان میں پھیلے املی کے پیڑ پر بھی چڑھ جاتا۔ اور املیاں توڑ کر خود بھی کھاتا، دوستوں کو بھی کھلاتا۔ ایک روز اسی املی توڑنے میں درخت سے گر گیا تھا۔ شدید چوٹ آئی تھی۔ علاج ہوا۔ مگر درد رہ گیا۔ اب اکثر کھیلتے کھیلتے اس کے پیروں میں درد ہونے لگتا۔ ماں اور پتا جی نے سمجھا یوں ہی کھیل کھیل میں پیر درد کر جاتا ہوگا۔ مگر اچانک ایک روز اسکول میں ہی کھیلتے کھیلتے اسے غش آگیا تھا۔ اور وہاں ہاسپٹل میں ڈاکٹروں نے جو کچھ بتایا وہ سارے گھر کے لیے چونکا دینے والا تھا ـــــ اس کو پولیو کی ہوا لگ گئی تھی۔ اور اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ بہت علاج ہوا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اور اس وقت سے اس کی حالت دن بدن

گرتی گئی۔

نریمان خاموش ہو گیا تھا۔

مجھے جیسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو۔ ایک دم سے بت بن گیا تھا۔ دروازے سے باہر ابھئے اپنے دائیں سکھڑے پیر کو پھیلائے فرش صاف کرنے میں مگن تھا۔ اس کی بد قسمتی پر مجھے ترس آنے لگا تھا۔ آج اگر وہ تندرست ہوتا تو اس کی حیثیت گھر میں ایک نوکر کی طرح نہ ہوتی۔ میں ایک ٹک جانوروں کی طرح جیتے ہوئے ابھئے کی طرف دیکھ رہا تھا جو موت جیسی خاموشی اختیار کیے، آدمی ہوتے ہوئے بھی آدمی کی ذات سے کٹ گیا تھا۔

(۳)

قدرے طویل خاموشی کے بعد نریمان دوبارہ میری طرف مڑا۔

''آؤ تمہیں کچھ دکھاؤں۔ ابھئے ابھی اندر کا رخ بھی نہیں کرے گا۔''

میں خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ کچن کے قریب ہی ابھئے کا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ جس پر وہ سوتا تھا۔ پلنگ پر قرینے سے چادر بچھی ہوئی تھی۔ تکیہ بھی تھا۔ جس پر تیل کے نشان ابھرے ہوئے تھے۔ تکیے کے نیچے وہ کنگھی بھی رکھتا تھا۔

نریمان پلنگ کے قریب آکر ٹھہر گیا تھا۔ پھر میرے چہرے کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''تم ادھر اکثر آتے ہو گے، مگر شاید پلنگ کے نیچے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔''

کھلی کھلی آنکھوں سے میں نے پلنگ کے نیچے دیکھا۔ اور میرے ہونٹوں پر حیرت و تعجب کا رنگ بکھر گیا۔ پلنگ کے نیچے اوکسی، چکا، گلی ڈنڈا اور چند گولیاں پڑی تھیں۔

میں چند لمحوں تک بغور، ششدر آنکھوں سے اس عجیب و غریب قیمتی سرمائے کو دیکھتا رہ گیا۔ نریمان نے بتایا۔ پولیو کے مرض کا شکار ہونے کے بعد سے لے کر آج تک ابھئے ان چیزوں کو کبھی اپنے سامنے سے الگ ہونے نہیں دیتا۔ بچپن میں جب کبھی

وہ ان چیزوں کو چھونے کی کوشش بھی کرتا تھا تو اس کا چہرہ غصے سے بھیانک ہو جاتا جیسے وہ شیر کی طرح ابھی اپنا خوفناک منہ کھولے گا اور اسے کھا جائے گا۔

نریمان کے ساتھ میں کمرے میں واپس لوٹ آیا تھا۔ ابھئے کے رینگنے کی آواز آرہی تھی۔ شاید وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر لوٹ رہا تھا ـــــ واپس کمرے میں لوٹتے ہوئے میری نظروں کے سامنے بچپن کی وہ قیمتی اشیاء گھوم رہی تھیں جسے ابھئے کسی کو بھی ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ کیا یہ اس کی آشائیں تھیں۔ کیا یہ اس کے سپنے تھے......؟

وہ اوکسی، وہ چکا جسے لے کر کل وہ پچھواڑے میدان میں بڑے غرور سے نکل جایا کرتا ہوگا۔ بچپن کی وہ بچھڑی تلخ یادیں آج بھی ان چیزوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اتر جایا کرتی ہوں گی۔ اس وقت کا ابھئے کیسا ہوتا ہوگا؟ جس کے سارے خواب ہی ادھورے رہ گئے ہوں۔

اس دن نریمان کے گھر سے لوٹتے ہوئے میرا دل بھاری بھاری تھا۔ دبے افسردہ قدموں سے میں اپنے گھر واپس آگیا تھا۔ ابھئے کی بدقسمتی کی کہانی اب تک میرے سینے میں ہلچل مچائے تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ ایسے لوگ کتنے سمجھدار ہوتے ہیں۔ کتنی جلد ان پر اپنی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ اور وہ خود کو اسی طرح کے ماحول میں ڈھال لیتے ہیں ـــــ کتنی جلد خود سے سمجھوتے پر تیار ہو جاتے ہیں۔۔۔ ایسے لوگ!

مگر ابھئے کو لے کر ایک اور خیال میرے دل میں چبھ رہا تھا۔ ایسے لوگ بھی جو خود کو کسی بھی قسم کے جذبات سے الگ رکھتے ہیں۔ کیا ایسے لوگوں کے دل، کے کسی بھی گوشے میں آدمیت کا جذبہ نہیں ہوتا: ان کے دلوں میں کوئی تو ایسا گوشہ ہوگا جہاں کوئی کمپلکس چھپا ہوگا۔ موقع کے انتظار میں ـــــ اور اگر کوئی ایسا موقع آیا تو ابھئے جیسے لوگ اپنی دنیا میں ضرور ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔ اور شاید اس وقت ایسے لوگ ماضی اور حال کے بیچ سمجھوتہ نہ کر سکیں۔؟

اور میری بات کتنی صحیح ثابت ہوئی تھی۔ ان دنوں نریمان کی شادی کی بات چل

رہی تھی۔ اور ابھئے کی شخصیت کا ایک بالکل نیا روپ دیکھنے میں آرہا تھا۔ جس آندھی کے پس منظر کے بارے میں، میں نے تصور کیا تھا۔ وہ آندھی ابھئے کے دل کے کسی گوشے میں لرز اٹھی تھی۔

(۴)

ایک دن جب میں وہاں گیا تو اس دن نریمان گھر پر موجود نہیں تھا۔ ابھئے سرنیچا کئے برتن مانجھنے میں مشغول تھا ـــــ اس کے دونوں ہاتھ مٹی سے سنے ہوئے تھے۔ اور چہرے پر کشمکش اور تناؤ کا ملا جلا رنگ جھلک رہا تھا۔

میں نے یونہی پوچھا ـــــ "نریمان نہیں ہے۔ کہاں گیا ہے؟"

شاید اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔ ویسے ہی اپنے کام میں مشغول رہا۔ میں نے اپنا سوال دوبارہ دہرایا تو اچانک ہی وہ سڑک کے آوارہ کتوں کی طرح بھڑک اٹھا۔ 'ایک بار تو کہا نہیں ہیں۔"

اس کا چہرہ غصے سے بھر گیا تھا۔ اچانک میرے سارے جسم میں خوف و دہشت کی تند لہروں کا جھونکا سا گیا تھا۔ اور مجھے لگا۔ شاید اب وہ آندھی اور قریب آگئی ہو!

نریمان کی ماں سے معلوم ہوا کہ جب سے ابھئے نے نریمان کی شادی کی بات سنی ہے تب سے بالکل ہی کھویا کھویا رہنے لگا ہے۔ کھانا بھی نہیں کھاتا ہے۔ برتن نچا کر پھینک دیتا ہے۔ ہر بات پر جھنجھلا جاتا ہے۔ لگتا ہے بس کتے کی طرح کاٹ کھائے گا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں پر ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔ اتنا خاموش اور اپنی دنیا میں گم رہنے والا ابھئے اتنا بدل کیسے گیا۔ میرے ذہن میں کیڑے کی طرح یہ سوال کلبلا رہا تھا۔ کیا نریمان کی شادی کی بات سن کر اس نے اپنے آپ سے سمجھوتا ختم کر لیا ہے؟

بدلے بدلے سے ابھئے کا یہ بالکل نیا رخ سامنے آیا تھا۔ اور اس کی عجیب و غریب تبدیلی عام لوگوں کی سمجھ سے باہر تھی۔ اب وہ کام دھام بھی نہیں کرتا تھا۔ بس مفلوج

کی طرح اپنے پلنگ پر لیٹا رہتا۔ اور جانے کیوں مجھے لگتا۔ ایک جانور سڑ گیا ہے۔ اس کی بدبو پھیلنے لگی ہے۔ اور کچھ دنوں بعد اس جانور کو حقارت سے باہر پھینک دیا جائے گا۔

زیمان کی شادی کے موقع پر میری حیثیت ایک دوست سے کہیں زیادہ ایک بھائی کی تھی۔ بہت سارے کام مجھے انجام دینے تھے۔

اس دن کوئی دس بجے ہوں گے ــــــ شیشے کا کچھ سامان مجھے کچن میں پہنچانا تھا۔ کچن کو جانے والا راستہ دالان سے ہو کر جاتا تھا۔ جہاں ابھئے کی چارپائی بچھی ہوتی تھی۔ اچانک ہی گزرتے ہوئے مجھے ٹھٹھک جانا پڑا۔ اور میں چند لمحوں تک پلنگ کے نیچے تعجب سے دیکھتا رہ گیا۔ میرے سارے جسم میں جیسے کسی نے تیزاب الٹ دیا ہو۔ ایک تیز جلن میں محسوس کرنے لگا تھا۔

پلنگ کے نیچے سے اس کی قیمتی اشیاء غائب تھیں۔ جس کو وہ بچپن سے لے کر آج تک کبھی خود سے الگ ہونے نہیں دیتا تھا۔ وہ بے معنی سی چیزیں جس میں وہ اپنے کل کو محسوس کرتا تھا۔ کہاں کھو گئیں وہ؟ اچانک ہی میں سوالوں کے دائرے میں گھر گیا تھا۔ پلنگ کے نیچے نہ اوکسی تھی نہ چکا۔ نہ گلی ڈنڈا نہ گولیاں۔

میرے ذہن کو پھر کوئی کیڑا کاٹنے لگا تھا۔ دالان کے پاس کھڑکی تھی جو پچھواڑے میدان میں کھلتی تھی۔ سامان پہنچانے کے بعد میں لپکتے ہوئے قدموں سے پیچھے میدان کی طرف بھاگا۔

اور اچانک ہی میں اپنی جگہ بت بن کر رہ گیا تھا۔

اپلے سنی ہوئی زمین کے پاس ہی کچرے میں اینٹھی ہوئی اوکسی اور چکا میرا منہ چڑھا رہے تھے۔ کچرے میں دھنسی ہوئی گولیاں ایک بے رنگ منظر کی عکاسی کر رہی تھیں۔ بعد میں اس کی ماں سے معلوم ہوا کہ گلی ڈنڈا اس نے آگ میں جھونک دیا تھا۔ اور اسی پل مجھے محسوس ہوا، جس آندھی کے بارے میں میں نے تصور کیا تھا وہ آندھی آچکی تھی۔ اور اس آندھی سے ایک جانور کا قلعہ ہل گیا تھا۔ اور بس اسے مسمار ہونے کی دیر تھی۔!

(۵)

اور پھر نریمان کی شادی کا دن بھی قریب آگیا۔

صبح سے ہی شادی کا ہنگامہ تھا۔ لوگوں کے آنے جانے کا تانتا لگا ہوا تھا۔ اندر سیڑھی کے پاس والی کوٹھری خالی کر کے ابھئے کو دیدی گئی تھی۔ ابھئے نے اپنا پلنگ وہیں اندر بچھالیا تھا۔ شادی کے شور اور ہنگاموں سے الگ اس کی دنیا محض کوٹھری کے ویرانے پن سے زیادہ نہ تھی۔

اور اچانک ہی دوپہر کے وقت گلی میں چیخ پکار مچ گئی۔ لوگ دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اور تھوڑی دیر میں ہی پورے گھر میں کہرام مچ گیا۔ منٹوں میں اس خوشی بھری تقریب میں ایک ماتمی فضا پھیل گئی۔

چاروں طرف یہی ہنگامہ تھا۔ ابھئے نے خودکشی کرلی۔ وہ کوٹھے پر کب چڑھا۔ یہ کسی نے نہیں دیکھا۔ کب کودا یہ بھی کسی کو نہیں معلوم ـــــ خون میں سنی اس کی لاش ٹیڑھی میڑھی پڑی تھی اور اس کے ہونٹوں پر اب بھی وہی تناؤ جھلک رہا تھا۔ جیسا میں نے آج سے چند روز قبل دیکھا تھا۔ محلے والوں کی طرح میں بھی سوچ رہا ہوں۔ ابھئے نہیں مرا۔ ایک جانور مر گیا ہے۔ اس جانور کو مرنا تھا۔ کیونکہ یہی اس کی حد تھی۔ اس کی آخری حد۔

ابھئے کی چتا کو آگ لگادی گئی ہے۔ لوگ واپس گھر لوٹ آئے۔ سب کام جلدی جلدی انجام دیدیا گیا۔ نریمان کی شادی کی تقریب بھی تھی۔ بے مزگی تو آہی گئی تھی۔ مگر شادی جیسی تقریب روکی تو نہیں جاسکتی۔ سارے رسم و رواج کے انجام دیئے جانے کے بعد میں خاموشی سے اپنے گھر لوٹ آیا ہوں۔ میرے قدموں میں افسردگی اور تھکن آگئی ہے......

شام کی ہتھیلیوں پر کیکٹس اگ آئے ہیں۔ خلاؤں میں بادلوں کے جھنڈ ایک لاش

کو آسمان خاکی پر اٹھائے لیے جا رہے ہیں۔ میری آنکھیں خلاؤں میں گھور رہی ہیں۔ اور ایک سوال شیش ناگ کے پھن کی طرح میرے ذہن پر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا ہے اور جیسے پوچھ رہا ہے۔

ابھئے کی کہانی تو ختم ہو چکی ہے مگر کیا ہر ابھئے جیسے آدمی کی یہی حد ہے؟

○○

گلفام۔ ۱۹۷۹ء

عِلم اور عمَل

یا د رکھو کہ

عِلم کے ساتھ عمَل ضروری ہے

نہ عمَل کے بغیر عِلم نافع ہے اور نہ عِلم کے بغیر عمَل نفع بخش ہے

جس عِلم کی پشت پر عمَل موجود نہ ہو وہ عِلم جہل ہی کے زمرے میں شامل ہے

—— حضرت داتا گنج بخشؒ

کشُف المحَجوب سے

مونِس و دمساز

لِکھو !
اور
اپنے عِلم کو اپنے دوستوں کے درمیان پھیلاؤ
اور
جب وقتِ مرگ آئے تو اپنے
بچّوں کو
بطور میراث سپرد کرو
کیونکہ
جب فِتنہ و آشوب کا زمانہ آتا ھے
تو بجُز کتاب
کوئی اور مونِس و دمساز نہیں ھوتا.

امام جَعفَر صَادِقؓ